سفرنامہ ہندوستان

تین شہروں کی کہانی

شہزاد منظر

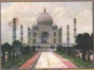

کچھ اس سفرنامے کے بارے میں

میرا یہ سفرنامہ روایتی مفہوم میں سفر کی محض روداد نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں سفر کی رودادیں بھی ہیں اور نجی تاثرات اور احساسات کا اظہار بھی۔ اس میں آپ کو میری سوانحی جھلکیاں بھی ملیں گی اور مختلف ادبی شخصیات سے ملاقات کی تفصیلات بھی۔ میں نے سفر ہند کے دوران جن مشاہیر شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں ان کے بارے میں پوری تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔ اس طرح ان شخصیتوں کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ اس سفرنامے میں کہیں کہیں رپور تاژ کا بھی گمان ہو گا۔ سفرنامہ، دراصل وہ صنف ہے، جس میں اظہار کی بڑی آزادی ہے۔ سفرنامہ نگار چاہے تو اسے افسانہ بنا دے اور چاہے تو محض روزنامچہ۔ میں نے اسے نہ افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور نہ روزنامچہ، البتہ میں نے اسے سفر کی روکھی پھیکی تفصیلات سے بچانے کی ضرور کوشش کی ہے اور عمداً افسانوی اسلوب اختیار کیا ہے، لیکن سفرنامے کے نام پر افسانہ نہیں لکھا، جیسا کہ عام طور پر ہمارے سفرنامہ نگار کرتے ہیں۔ اگر اس سفرنامے میں کہیں کہیں افسانے کا گمان ہو تو یہ محض اتفاق ہے۔ بعض واقعات ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اس گمان کی ایک وجہ افسانوی اسلوب بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے واقعات کو صرف بنا سنوار کر پیش کیا ہے۔

افسانوی اسلوب اختیار کرنے کے باعث بعض مقامات پر مونولوگ (خود کلامی) سے بھی کام لیا گیا ہے۔ جس سے مجھے اظہار میں آسانی ہوئی ہے، خصوصاً بعض واقعات کے بارے میں داخلی احساسات اور تاثرات کے اظہار میں۔ میں نے بعض تاریخی مقامات کی سیر کے دوران فلیش بیک کی تکنیک سے بھی استفادہ کیا ہے، جس سے مجھے ان تاریخی مقامات اور واقعات کے پس منظر کے بیان میں سہولت ہوئی ہے۔ اس طرح میں حالیہ واقعات بیان کرتے کرتے چشم تصور میں اچانک ماضی میں پہنچ جاتا ہوں اور تاریخ کے جھروکے میں جھانکنے لگتا ہوں۔ اس طرح تاریخی مقام اور تاریخی شخصیتیں اپنے پورے سیاق و

Pakistanipoint.com Waqar Azeem

تاریخ کے جھروکے میں جھانکنے لگتا ہوں۔ اس طرح تاریخی مقام اور تاریخی شخصیتیں اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔ میں نے یہ تکنیک کلکتے اور دہلی کے بعض تاریخی مقامات کی سیر کے دوران اختیار کی ہے۔

اس سفرنامے کو آپ تین شہروں دہلی، کلکتہ اور پٹنہ کی ادبی اور ثقافتی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ میں نے سیاحت کے دوران نہ صرف ان شہروں کی مشہور اور مقتدر شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، بلکہ ان سے مختلف علمی و ادبی مسائل پر تبادلہ خیال بھی کیا اور تاریخی اور ثقافتی اداروں، مثلاً رائل ایشیاٹک سوسائٹی، نیشنل لائبریری، خدابخش لائبریری، مغربی بنگال اردو اکیڈیمی اور اردو ترقی بورڈ کا معائنہ بھی کیا اور ان اداروں کے بارے میں پوری تفصیلات معلوم کیں۔ اس طرح میں نے جو کچھ لکھا وہ خود بخود ان شہروں کی ادبی و ثقافتی تاریخ بن گئی، حالانکہ میرا مقصد محض سفرنامہ لکھنا تھا۔

میں ہندوستان کے سفر کے دوران جن مشاہیر شخصیتوں سے ملا اور ان سے تبادلہ خیال کیا۔ ان میں شہرہ آفاق فلم ساز اور ہدایت کار ستیہ جیت رائے، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمن فاروقی، جوگندر پال، فکر تونسوی، بلراج کومل، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ساقی نارنگ، شارب ردولوی، شمیم نکہت، مجتبیٰ حسین، علی باقر، شہاب جعفری، قمر رئیس، ڈاکٹر محمد حسن، رشید حسن خاں، تنویر احمد علوی، شمیم حنفی، ظہیر احمد صدیقی، کرشنا پال، سکریتا پال، صالحہ عابد حسین، صغریٰ مہدی، مظفر حنیفی، فہمیدہ بیگم، شمس الزماں، رضوان اللہ، محمود ہاشمی، شریف الحسن نقوی، عبد المغنی، عابد رضا بیدار، رضا نقوی واہی عظیم آبادی، پروفیسر ممتاز احمد، پروفیسر خورشیدی، اسلم آزاد، احمد یوسف، ظہیر صدیقی، علی امام، ظفر اد گانوی، ش مظفر پوری، جاوید نہال، نشاط الایمان، علقمہ شبلی، اعزاز افضل، قیصر شمیم، سالک لکھنوی اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس سفرنامے کا سب سے اہم حصہ "غالب کی تلاش میں" ہے۔ میں نے کلکتے کے سفر کے دوران قدیم شملہ بازار میں واقع غالب کی قیام گاہ کا سراغ بھی لگایا (اور اس کا نقشہ بھی حاصل کر لیا) یہاں انہوں نے ایک سال، نو ماہ اور آٹھ دن قیام کیا تھا، بلکہ اس دور کے کلکتے کے ادبی، سماجی اور [illegible]بی مالات اور ماحول کے بارے میں بھی تحقیق کی اور اس ضمن میں نیشنل لائبریری میں کلکتے کے [illegible] میں انگریزی اور بنگلہ زبانوں کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح آپ اس باب کو غالب کے [illegible]ق بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس [illegible] نامے کا دوسرا سب سے اہم حصہ ستیہ جیت رائے سے میری تفصیلی ملاقات ہے۔ ستیہ

جیت رائے ہمیشہ سے میری پسندیدہ شخصیت رہے ہیں۔ میں جب تک ہندوستان میں رہا۔ ان کی ساری فلمیں دیکھیں اور ان کے بارے میں اتنا کچھ پڑھا کہ میں اگر چاہوں تو ان پر پوری کتاب لکھ سکتا ہوں (محبیّ ذوالفقار احمد تابش نے مجھ سے اس کی فرمائش بھی کی ہے) میرے قارئین کو میرے بارے میں شاید علم نہیں کہ میں فلم آرٹ کا ایک سنجیدہ طالب علم بھی رہا ہوں اور میں نے نہ صرف ہندوستان اور دنیا کی بیشتر شاہ کار خاموش اور ناطق فلمیں دیکھی ہیں، بلکہ ان کے بارے میں متعدد مضامین بھی لکھے ہیں جو برصغیر کے مؤقر اور سنجیدہ فلمی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں، ستیہ جیت رائے کی قائم کردہ "کلکتہ فلم سوسائٹی" کا واحد اردو داں رکن تھا اور فلم سوسائٹی کا ممبر ہونے کے ناتے ہندوستان، انگلستان، فرانس، روس اور امریکہ سے شائع ہونے والے سنجیدہ اور خالص فلم آرٹ سے متعلق مضامین اور کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ ایک زمانے میں میرے سر میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ لکھنے کا سودا سمایا تھا اور میں نے اس ضمن میں تین چار ابواب لکھ بھی ڈالے تھے (جو سابق مشرقی پاکستان کے مؤقر ادبی اور فلمی ہفت روزہ "چترالی" میں شائع بھی ہوئے) لیکن ادب اور صحافت سے گہرے طور پر وابستہ ہو جانے کے باعث یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ آج میں اپنے قارئین پر پہلی بار اس "راز" کو منکشف کر رہا ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ اس سفرنامہ کو لکھتے ہوئے بات نکل آئی ہے۔ ستیہ جیت رائے کے بارے میں پڑھتے ہوئے قارئین کو میری زندگی کے اس پہلو کے بارے میں بہت ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

اس سفرنامے کا ایک اہم حصہ قرۃ العین حیدر سے متعلق ہے۔ اس سے عینی کے فن اور نقطہ نظر کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عینی اپنے عقیدت مندوں سے بہت بے رخی سے ملتی ہیں، لیکن مجھے اس ضمن میں قطعی مختلف تجربہ ہوا۔ انہوں نے مجھ سے نہ صرف مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا، بلکہ سابق مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے کے باعث بہت ہمدردانہ سلوک بھی کیا اور انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کے بہاریوں کے بارے میں جن ہمدردانہ جذبات کا اظہار کیا، وہ قابل صد ستائش ہے۔

اس سفرنامے میں دہلی اور پٹنہ کے مقابلے میں کلکتہ کا زیادہ ذکر اس لیے بھی ہے کہ میرا اس شہر سے تعلق ہے اور میں اس کے بارے میں زیادہ واقفیت رکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں اس شہر سے میرا جذباتی لگاؤ بھی ہے۔ کلکتہ برطانوی ہند کا پہلا دارالحکومت ہونے کے باعث ایک نیا شہر ہے اور اس کے قیام کی تاریخ بہت ہی دلچسپ اور افسانوی ہے۔ اس قدر افسانوی کہ اس پر بہترین ناول لکھا جا سکتا ہے۔ بنگلہ اور انگریزی زبانوں میں اس پر کئی عمدہ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ کاش اردو میں بھی اس شہر پر کوئی

ناول لکھا جاتا! میں کلکتہ کے سفر کے دوران جن مقامات پر گیا اور ان کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں، اس سفرنامے میں ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ اس کے مطالعے سے قارئین پر واضح ہو جائے گا کہ کلکتہ اور اس کی تاریخ میں کتنی زبردست رومانویت پوشیدہ ہے۔

پاکستان کے جو سیاح ہندوستان جاتے ہیں۔ وہ زیادہ تر دہلی، لکھنو اور بمبئی تک جاتے ہیں۔ مشرقی ہندوستان کا دورہ نہیں کرتے۔ میں نے اس کے برعکس پٹنے اور کلکتے کا سفر کیا اور جو کچھ محسوس کیا، اسے درج کر دیا۔ اس سفرنامے کو مکمل کرنے میں غیر معمولی تاخیر اس لیے ہوئی کہ میں اس دوران دیگر ادبی کاموں میں مصروف رہا۔ اس لیے بہت سی باتیں پرانی محسوس ہوں گی، لیکن اس میں بیان کردہ زیادہ تر باتیں تازہ اور مستقل اہمیت کی حامل ہیں۔ اس سفرنامے میں میں نے کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی اصل صورت واضح ہو کر سامنے آجائے، خصوصاً ہندوستانی عوام کی بے پناہ غربت و افلاس اور ہندوستانی مسلمانوں میں رونما ہونے والی بنیادی تبدیلیاں۔ اس سفرنامے میں میں نے بعض ایسے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے جو بعض حلقوں کو ناگوار گزرے گا، لیکن میں اس کے لیے مجبور ہوں۔ میں اپنے خیالات و جذبات قارئین سے چھپانا نہیں چاہتا۔

آخر میں میں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ محض ایک ادبی سفرنامہ نہیں ہے۔ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ یہ سفرنامہ قارئین کو کیسا محسوس ہوا؟ توقع ہے کہ وہ اس بارے میں ناچیز کو مطلع فرمائیں گے۔

شہزاد منظر
مستقل پتہ:
اے، 36، واجد اسکوائر،
بلاک نمبر 16، گلشن اقبال، کراچی۔ 75300

دیباچہ

(محمد خالد اختر)

شہزاد منظر سے ہم سب آشنا ہیں، مگر کتنے لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ ان کا اصل، ماں باپ کا رکھا ہوا نام ابراہیم عبدالرحمن عارف ہے اور ان کے دو قلمی نام اور بھی ہیں۔ تبسم عارف اور عمر خیام، جن کو وہ اب غالباً مسترد کر چکے ہیں۔ عمر خیام نام رکھنے کی وجہ البتہ واضح نہیں ہے۔ ان کا مولد اور وطن شہر کلکتہ ہے۔ جہاں وہ پلے، بڑھے، تعلیم پائی اور اوائل شباب ہی میں بطور رپورٹر اور پھر نائب مدیر کی حیثیت سے اخبارات میں کام کیا۔ ان دنوں میں انہوں نے کئی افسانے بھی لکھے اور ایک ناول کا پہلا ورشن بھی چھاپا۔ 1971ء میں جب مشرقی پاکستان میں فتنہ و فساد مچا۔ تو وہ ڈھاکے کو خیرباد کہہ کر پاکستان چلے آئے۔ یہاں وہ بہت عرصے تک جنگ، پیمان، مساوات اور حریت سے نائب مدیر کی حیثیت سے منسلک رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخبار نویسی لکھنے کا فن سیکھنے کے لیے بڑی اچھی تربیت ہے۔ کتنے ہی مغربی اور ہمارے اپنے انشاپردازوں نے اخبار نویسی ہی سے لکھنا سیکھا۔ اظہار مطلب پر عبور حاصل کیا اور بعد میں ادب کی دنیا میں چھکے۔ اگر ایک لکھنے والے میں خلقی اپچ یا اور یجنیلیٹی موجود ہے تو اسے اس صحافتی زود نویسی سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ابوالکلام آزاد، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، ابن انشاء، خواجہ احمد عباس اور کتنے ہی لکھنے والوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ صحافتی مشق ہی نے ان کی نگارش میں نکھار پیدا کیا اور اپنے مطلب کو بلا تکلف الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ کراچی میں آ کر شہزاد منظر نے صحافتی فرائض کے علاوہ اپنا ادبی کام بھی جاری رکھا ہے۔ بہت سی کتابیں ان کی چھپ چکی ہیں اور بہت سی چھپنے کی منتظر ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پیشہ ور ادیب کہے جا سکتے ہیں۔ پیشہ ور اس لحاظ سے کہ اپنے ادبی کام کی جانب ان کا انداز پیشہ وارانہ رہتا ہے۔ دھوپ چمکے یا مینہ برسے، وہ ہر روز بلا ناغہ دفتر سے لوٹ کر چار پانچ گھنٹے اپنے ڈیسک پر بیٹھ کر اپنا ادبی کام

کرتے ہیں۔ جیسا کہ سومرسیٹ ماہم نے کہا ایسے پیشہ وارانہ جبری ڈسپلن کے بغیر کوئی لکھنے والا ادب میں معتدبہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ ایمو چیریا شوقیہ لکھنے والے دو چار اچھی بری چیزیں لکھنے کے بعد تساہل یا "بے راہ روی" کا شکار ہو جاتے ہیں اور بالآخر لکھنے کی قدرت ان کے قلم سے چھن جاتی ہے۔

اسی جبری مشقت کے طفیل ہی شہزاد اپنی یہ ضخیم سفری سرگذشت (باریک قلم سے لکھے کم و بیش تین سو فل اسکیپ صفحات) مکمل کرنے کے قابل ہوئے ہیں اور جہاں تک میں جانتا ہوں انہیں اپنے مواد کو ترتیب دینے اور اسے لکھنے میں دو ماہ سے زیادہ مدت نہیں لگی۔ "تین شہروں کی کہانی" میں تین شہر دلی، کلکتہ اور پٹنہ ہیں۔ جن کی سیر وہ ہمیں اپنے سفرنامے میں کراتے ہیں ---- مگر یہ سفرنامے کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ یہ ان تین شہروں کا تہذیبی، ثقافتی اور ادبی منظرنامہ بھی ہے۔ ہندوستان کے تقریباً سب ہی اردو زبان کے ادیب اس کے صفحے میں چلتے پھرتے، بولتے چالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں مرقع یا خاکہ نگاری بھی ہے اور آپ بیتی کی چکاچوند بھی۔ یہ ایک بھرپور وسیع دستر خوان ہے۔ جس پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جسے پڑھنا نہیں پڑتا اور جو خود کو "پڑھواتی" ہے۔

اس مختصر تعارف یا دیباچے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیسے ہمارے اس سیاح نے (جس کا ایک قلمی نام عمر خیام بھی ہے) کلکتے سے آنے کے اکیس برس بعد اپنی جڑوں کی تلاش میں ملک ہندوستان جانے کا قصد کیا۔ کیسے وہ اپنے بیوی بچوں کے منع کرنے کے باوجود اپنا سفید سوٹ کیس لیے اپنے دل بیمار پر ہاتھ رکھے اور پاسپورٹ اور نقدی سنبھالے ایک صبح گھر سے باہر نکلا۔ کیسے وہ ریل میں سوار ہو کر (کہ ہوائی جہاز سے جانے کا مقدور نہ رکھتا تھا) افتاں و خیزاں لاہور پہنچا۔ وہاں پاکستانی کسٹم اور امیگریشن کے عملے کے ہاتھوں اس کی اور دوسرے مسافروں کی کیسی درگت بنی اور کن جان جوکھوں سے وہ اٹاری جانے والے حوالاتی گاڑی کے ڈبے میں چڑھا۔ اٹاری کی کیفیت۔ آسمان سے برستی آگ تلے پلیٹ فارم پر پہروں پریڈ۔ ہندوستانی کسٹم اور امیگریشن کی چیرہ دستی اور لوٹ کھسوٹ۔ ہولناک نانگل ایکسپریس سے دلی تک کا سفر۔ جس سے وہ جیتا بچ گیا۔ دلی کے پلیٹ فارم پر ایک ڈوبتے ہوئے۔ ڈگمگاتے مسافر کی مارچ۔ ٹیکسی میں اپنے میزبان پروفیسر شارب ردولوی کی حویلی پر پہنچنا۔ جن سے اس کی خط و کتابت تھی لیکن دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا۔ میزبان کے گھر پر غش پڑنا اور اگلے جہاں کو کوچ کے لیے تیار ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں یہ سب کچھ نہیں بتاؤں گا کہ مصنف نے یہ سارے ڈراؤنے خواب کی روئداد بالتفصیل اور بلا کم و کاست اپنے سیاحت نامے میں قلم بند کر دی ہے۔

پروفیسر شارب ردودلوی نے (چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں۔ طویل القامت۔ جامہ زیب) شہزاد کی خوب خاطر مدارت کی۔ وہاں سے چند دن بعد وہ اردو افسانہ نگار جوگندر پال کے ہاں اٹھ آئے۔ دلی کے گلی کوچوں کے سیر سپاٹے۔ ادیبوں سے ملاقاتیں۔ خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری۔ ان سب کا ذکر آپ پڑھیں گے۔ میں سمجھتا ہوں دلی میں اس کے قیام کی ہائی لائٹ ان کا ہماری ممتاز اردو ناول نویس قرۃ العین حیدر کا انٹرویو ہے۔ عینی پاکستان سے آنے والے ادیبوں سے بیزار اور ان سے ملنے سے پہلو تہی کرتی ہیں۔ شہزاد سے ملاقات کو وہ اس لیے تیار ہو گئیں کہ انہیں بتایا گیا کہ یہ کلکتے کے رہنے والے ہیں۔ بہرحال وہ ان سے اچھی طرح ملیں اور وہ اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا جو پھیکا بد مزا تھا۔ نون مرچ کے بغیر جو شہزاد کو زہر مار کرنا پڑا۔۔۔۔ میں یہاں یہ بتادوں کہ شہزاد جہاں جاتے ہیں۔ اپنا ٹیپ ریکارڈر لے کر جاتے ہیں۔ ان کو ادیبوں سے ملنے ملانے۔ ان کو ٹیپ میں محفوظ کرنے کا خبط ہے۔ جیسے دوسرے پرانے ٹکٹ یا دیس بدیس کے سکّے جمع کرتے ہیں۔ شہزاد ادیبوں کو "جمع" کرتے ہیں۔ اس لیے اس سفرنامے میں آپ ہر ادیب کی باتیں اس کی زبانی سنتے ہیں۔

دلی سے وہ راج دھانی ایکسپریس سے اپنے بچپن، لڑکپن اور اوائل جوانی کے شہر کلکتے پہنچے اور اپنی آبائی حویلی میں اترے جہاں ان کے بڑے بھائی ابھی تک رہتے ہیں۔ کلکتے کے وہ روڑے رہ چکے ہیں۔ اس لیے وہ یہاں خوب مزے سے ہمیں اس کے گلی کوچوں، بازاروں اور کالجوں وغیرہ میں گھماتے پھراتے ہیں۔ ان کا خاندان ڈھائی سو برس سے کلکتے میں آباد ہے یعنی راج کی ابتدا سے اس کے جدامجد حاجی قاسم عارف مہتر سورت کے نواح سے نقل مکانی کر کے کلکتے آئے اور اپنی کاروباری سوجھ بوجھ سے چوٹی کے سوداگر بن گئے۔ کارخانوں اور ملوں کے مالک۔ روشن خیال تھے۔ اپنی اولادوں کو علی گڑھ، آکسفورڈ، کیمبرج میں تعلیم دلائی۔ دو پشتوں کے بعد خاندان پر زوال آیا اور شہزاد کے والد اور چچاؤں نے تماش بینی اور قمار بازی میں سب کچھ لٹا دیا اور کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ ایک حویلی پرانی رہنے کے لیے بچ رہی۔ جو اب ان کے بڑے بھائی کے تصرف میں تھی۔

کلکتے میں مصنف نے سراغ رسانی کا ایسا محیر العقول کارنامہ سرانجام دیا کہ شرلک ہومز مرحوم و مغفور اگر زندہ ہوتے تو ڈاکٹر واٹسن کی ہمرہی میں اس کی زیارت کو ولایت سے تشریف لاتے۔ مرزا غالب جب 1828ء میں پینشن کی بابت استغاثہ پیش کرنے آئے تو وہ شملہ بازار میں گرد تالاب کے قریب مرزا علی سوداگر کی حویلی میں چند کمرے کرایہ کر کے مقیم ہوئے۔ لوگوں نے ان کو کامیابی کی امید دلائی اور یہ اس دھوکے میں تقریباً دو برس کلکتے رہے۔ شہزاد کے ذہن میں سمائی کہ اس حویلی کا کھوج

لگانا چاہیئے جہاں مرزا نے غالباً اپنی زندگی کے دو ایسے سال گزارے تھے کہ بعد میں جب کوئی کلکتے کا ذکر کرتا تو وہ بے تاب ہو جاتے اور ان کے سینے پر تیر لگتا۔ لیکن شہزاد کا کلکتہ وہ کمپنی بہادر کا ڈیڑھ سو پونے دو سو سال پہلے کا کلکتہ کیسا تھا! نہ وہ "شملہ بازار" نہ وہ گرو تالاب۔ شہر کی صورت شکل بدل چکی تھی۔ پرانے گلی کوچوں کے نام کچھ کے کچھ ہو گئے تھے۔ کس چالاکی اور تن دہی سے شہزاد نے "شملہ بازار" اور گرو تالاب اور غالب کی قیام گاہ کا کھوج لگایا۔ وہ ایک حیرت خیز جاسوسی کہانی ہے۔ جس کا پلاٹ بتانا پڑھنے والے کے ساتھ ناانصافی کرنا ہو گا۔ اسے پڑھ کر اس دیباچہ نگار کو بھی تحقیق و تفتیش کا شوق چرایا۔ اردوئے معلی میں (جسے میں اپنی ناقص اردو کو صاف کرنے کے لیے اکثر پڑھتا رہتا ہوں) مرزا نے اپنے ایک خط میں اپنی عمر چونسٹھ برس بتائی ہے۔ خاتمہ عبارت پر خط لکھنے کی تاریخ اگست 1859 ر درج کی ہے۔ میں نے حساب لگایا کہ جب مرزا 1828 ء میں کلکتے گئے تھے تو ان کی عمر تیس اکتیس برس کے لگ بھگ ہو گی، یعنی جوانی کے دن تھے۔ جولانی طبع عروج پر تھی کیوں کہ وہ کلکتے کو آئندہ برسوں میں یاد نہ کرتے اور اس شہر کی رونقوں اور رنگینیوں کو کیسے بھول پاتے!

کلکتے کے ذکر میں شہرہ آفاق عظیم فلم ساز ستیہ جیت رائے سے ایک مفصل انٹرویو بھی شامل ہے اور شہزاد کی ہمت اور جواں مردی کی داد دینی چاہیئے کہ وہ اپنے شوق طلب میں اتنے بڑے شیر کو اس کے اپنے بھٹ میں زچ کرنے میں سرخرو ہوئے۔ اسے اپنے ٹیپ ریکارڈر میں بند کر کے ساتھ لے آئے۔

کلکتے سے وہ تین روز کے لیے پٹنہ یعنی موریاؤں کی راج دھانی پاٹلی پتر گئے۔ جس کا نقشہ انہوں نے کھینچا ہے۔ وہاں انہوں نے بیش تر وقت خدا بخش لائبریری میں گزارا۔ جو سارے برصغیر میں اپنے قیمتی مخطوطات کے ذخیرے کے لیے مشہور ہے۔ پٹنے سے وہ پھر کلکتے آئے اور ایک دو دن کے بعد راج دھانی ایکسپریس میں بیٹھ کر واپس دلی پہنچ گئے۔ وہ دفتر سے ایک مہینے کی رخصت لے کر چلے تھے۔ جب وہ اپنی سیاحت سے لوٹ کر وطن یعنی کراچی پہنچے تو ان کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ سفید سوٹ کیس چالیس ایک کیسٹوں کے وزن سے کچھ زیادہ بھاری تھا اور پاسپورٹ جیب میں محفوظ۔ ٹیپ ریکارڈر بھی کسی نے نہیں ہتھیایا۔

شہزاد کے اس سفرنامے کی خوبی اس کی داستان طرازی ہے اور اس کی ریڈیبلٹی۔ پچھلے سالوں میں بہت سے پاکستانی ادیب مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے ہندوستان گئے ہیں اور وہاں سے آ کر چند ایک نے اپنی سفری سرگزشتیں بھی چھاپی ہیں، مگر مجھے ان میں وہ لطف نہیں ملا جو شہزاد کی ان

"تین شہروں کی کہانی" میں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ایک کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ اپنی یاترا پر گئے۔ ایک حلیم الطبع، شریف مزاج، مرنجان مرنج انسان ہیں۔ جنہیں اپنی ذات کو اچھالنے، اپنی گڈی چڑھانے کا خیال ہی نہیں آتا۔ وہ ایک بچے کی معصومانہ حیرت کی صفت اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ جس کے بغیر کوئی اچھا سفر نامہ نہیں لکھا جا سکتا۔

مجھے خوشی ہے کہ میں اتنے اچھے ساتھی کی معیت میں گھر بیٹھے دلی، کلکتے اور پٹنے کی سیر کر آیا اور ان اردو زبان کے ادیبوں سے ملاقات ہو گئی۔ جن کے نام تو ہم نے سن رکھے ہیں، مگر جن کی تحریریں یہاں پڑھنے کو نہیں ملتیں۔

ہند یاترا

شدید تذبذب اور ذہنی کشمکش کے بعد میں نے بالآخر ہندوستان جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔
میری ذہنی کشمکش کی وجہ یہ تھی کہ میں دل کا مریض تھا اور دہلی تک تنہا ٹرین پر سفر کرتے ہوئے ڈر رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ اگر راستے میں میری طبیعت خراب ہو گئی تو نہ معلوم مجھے بر وقت طبی امداد حاصل ہو گی یا نہیں۔ ایک وسوسہ تھا جو مجھے ٹرین کا تکلیف دہ سفر کرتے ہوئے روک رہا تھا۔ دوسری جانب اپنے سابق وطن مالوف کو آخری بار دیکھنے کی شدید خواہش تمام وسوسوں اور اندیشوں پر غالب آ رہی تھی اور مجھے ہر حال میں ہندوستان جانے کے لیے اکسا رہی تھی۔ آخر کار میں نے ہندوستان جانے کا تہیہ کر ہی لیا۔

بچوں کو جب معلوم ہوا کہ میں ہندوستان کے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں تو سب نے بیک زبان اس کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہندوستان بہت ہی مفلوک الحال ملک ہے۔ وہاں کے لوگ بہت ہی تباہ حال ہیں۔ وہاں ہر جگہ افلاس ہی افلاس ہے۔ وہ لوگ نہ اچھا کھاتے ہیں اور نہ اچھا پہنتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہم پاکستانی بہت خوشحال ہیں۔ ہمارے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ ہندوستان جا کر اپنا وقت اور روپیہ ضائع کر رہے ہیں"۔

بچے، جو چند سال قبل اپنی ماں کے ساتھ دہلی، بنارس اور کلکتے کا دورہ کر کے آئے تھے، ہندوستان کی مسلسل برائیاں کر رہے تھے۔ یہ بچے، جو پاکستان میں بیدا ہوئے اور پروان چڑھے، انہیں ہندوستان کی کوئی چیز پسند نہیں آئی۔ ان کا کہنا بھی درست تھا۔ وہ پاکستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے انہیں پاکستان کی ہر شے سے محبت تھی۔ انہیں یہاں کی ہر چیز اچھی لگتی تھی۔ ان کا ہندوستان سے کیا جذباتی لگاؤ ہو سکتا تھا؟ ان کے لیے تو ہندوستان محض ایک ملک تھا۔ ان کے برعکس میرے لیے وہ

سرزمین بہت کچھ تھی۔ میرے لیے وہ سرزمین بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے کہ میں وہاں پیدا ہوا تھا۔ بچپن سے لے کر لڑکپن اور پھر جوانی اسی سرزمین میں گزری تھی۔ میری ساری یادیں اور ساری محبتیں اسی سرزمین سے وابستہ تھیں۔ ترک وطن کئے اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود جب بھی اس ملک کا ذکر آتا تھا تو یادیں تازہ ہو جاتی تھیں، آنکھیں بھر آتی تھیں اور دل اسے دیکھنے اور عزیز و اقارب اور دوست، احباب سے صرف ایک بار ملنے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ کیا اسے ہی نوسٹلجیا کہتے ہیں؟ کیا یہ وطن دشمنی ہے؟ میں تو محض ایک ادنیٰ سا انسان تھا۔ حضور اکرمؐ نے جب مکہ سے مدینہ میں پناہ لی تھی تو وہ اپنے آبائی شہر کو یاد کر کے مغموم ہو جاتے تھے۔ اگر میں اپنے آبائی وطن کو یاد کر کے بے چین ہو جاتا ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

میں اکیس سال کے بعد ہندوستان جا رہا تھا، پورے اکیس سال کے بعد۔ اس لیے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جس کا الفاظ کے ذریعے اظہار ممکن نہ تھا۔ ایسی صورت میں انسان کا جذباتی ہو جانا فطری امر تھا۔ مجھے اپنے سابق وطن کی زیارت پر جانے کی خوشی بھی تھی اور افسوس بھی۔ خوشی اس لیے کہ طویل مدت کے بعد اپنے بھائی بہن، عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے ملوں گا اور افسوس اس لیے کہ اس عرصے میں نہ جانے کتنے لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہوں گے۔ کتنے لوگ ضعیف ہو کر قوت بینائی سے محروم ہو چکے ہوں گے۔ وہاں کی دنیا کتنی بدل چکی ہو گی۔ سامنے کے کھیلنے کودنے والے بچے جوان ہو چکے ہوں گے۔ بچیاں بیاہ دی گئی ہوں گی اور کئی کئی بچوں کی ماں بن چکی ہوں گی۔ جاوں گا تو کتنوں کو پاؤں گا۔ کتنوں کو گنواؤں گا؟ کتنے لوگ مجھے پہچان پائیں گے اور کتنے لوگ پہچان نہیں پائیں گے!

میرے جوش و خروش پر اس وقت اوس پڑ گئی جب لاہور ریلوے اسٹیشن پر امیگریشن آفیسر نے پاسپورٹ پر مہر ثبت کرنے سے قبل کہا "پچاس روپے نکالیے"۔

"پچاس روپے؟" میں ایک دم بوکھلا گیا۔ "کس بات کے لیے پچاس روپے؟"

"مہر ثبت کرنے کے"۔ امیگریشن آفیسر نے کہا، "ہر شخص روپے دے رہا ہے۔ آپ کو کیوں اعتراض ہے؟"

مجھے اچانک اپنے عامی ہونے کا شدید احساس ہوا۔ میں اپنے تئیں خود کو لاکھ ادیب و صحافی گردانوں امیگریشن آفیسر کی نظر میں پاکستان کے لاکھوں کروڑوں عوام سے مختلف نہ تھا۔ اس لیے اسے مجھ سے رشوت طلب کرنے کا حق حاصل تھا۔

میں نے نرم لہجے میں کہا، "میں ایک ادیب اور صحافی ہوں یعنی اخبار نویس"!

اور پھر میں اس کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔ امیگریشن آفیسر نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ پاسپورٹ پر ایک نظر ڈالی اور نہایت مایوسی سے کہا، "اچھا، اچھا، تو پھر تشریف لے جائیے"۔

میں نے دل میں سوچا، "معاشرے میں نہ سہی، امیگریشن آفیسر کی نظر میں تو ادیب اور صحافی کا کچھ احترام ہے! یا پھر صحافی ہونے کے ناتے اس نے ڈر کر چھوڑ دیا ہو"۔

اب کسٹم کی جانچ پڑتال کی باری تھی اور یہاں بھی مجھے دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا تھا۔ میں نے سوچا، "کیوں نہ اپنے ادیب اور صحافی ہونے کا فائدہ اٹھایا جائے۔ ہو سکتا ہے میں عام مسافروں کی طرح ذلیل و خوار ہونے سے بچ جاؤں"۔ میں نے کسٹم سپرنٹنڈنٹ سے کہا، "دیکھیے جناب! میں ایک ادیب اور صحافی ہوں اور دل کا مریض بھی۔ اگر آپ۔۔۔"

اس سے قبل کہ میں اپنا جملہ مکمل کرتا۔ انہوں نے مجھے اپنے اردلی کے ساتھ دس نمبر کاؤنٹر پر بھیج دیا۔ میں نے پھر وہاں ادیب و صحافی ہونے کا نسخہ استعمال کیا اور سامان کی تلاشی کے بغیر فارغ کر دیا گیا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ میرا ادیب اور صحافی ہونا کام آیا۔ کسٹم میں ادیب اور صحافی کی کچھ قدر تو ہے لیکن عام لوگ۔۔۔

اب میں ہندوستان جانے والی ٹرین پر بیٹھا ہوا تھا اور اکیس سال کے بعد اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی خوشی میں سرشار تھا۔ میں نے ڈبے پر نظر دوڑائی۔ ڈبا مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ نشستوں کے علاوہ اپنے اپنے سامان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سپاہی ہندوستان کے سو سو روپے کے نوٹوں کا بنڈل لے کر ڈبے میں داخل ہوا اور مسافروں سے پاکستانی نوٹ کے بدلے ہندوستانی نوٹ بدلنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستانی نوٹ پاکستانی نوٹوں میں بدل گئے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کے پاس کم از کم ایک ہزار پاکستانی روپے تھے۔ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے دل میں حساب لگا، "ایک عام پولیس مین کی کتنی تنخواہ ہوتی ہو گی؟ زیادہ سے زیادہ آٹھ یا نو سو روپے۔ بہت ہوا تو ایک ہزار روپے ماہانہ "ایک ہزار روپیہ اس کی مٹھیوں میں تھا، جو اس کے ایک دن کی رشوت تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک مہینے میں تیس ہزار روپے! تیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ تو صدر مملکت کی بھی نہ ہوتی ہو گی۔ یہ صرف ایک سپاہی کی یومیہ آمدنی تھی اور یہاں تو قلی سے لے کر اعلیٰ ترین افسر تک لوٹ مار میں مصروف تھے۔

میں نے سارے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ان دوستوں کے بارے میں سوچنے لگا جن سے میری خط و کتابت تھی اور جنہیں میں اپنے دہلی پہنچنے کی پیشگی اطلاع دے چکا تھا۔ ان میں ایک شارب

ردولوی تھے۔ دوسرے جوگندر پال اور تیسرے شمس الزماں میں شارب ردولوی کے ہاں ٹھہرنے والا تھا لیکن ہم ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا تھے اور ان کی کبھی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا، "وہ اگر اسٹیشن پر آئے تو میں انہیں کس طرح پہچان پاؤں گا؟ یا وہ مجھے کس طرح پہچان پائیں گے؟" میں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ ٹرین اسٹیشن سے کب روانہ ہوئی۔ مجھے احساس تک نہ ہوا اور میں اپنے خیالات سے اس وقت چونکا جب ٹرین دونوں ملکوں کی سرحد پار کر رہی تھی۔

میں نے سوچا، "یہ وہی سرحد ہے، جہاں دونوں ملکوں کے جیالے سپاہیوں نے اپنا اپنا لہو بہایا ہے۔ دونوں ملک تین دفعہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو چکے ہیں۔ آخر ان کے درمیان کب مستقل امن قائم ہو گا؟ وہ کب اچھے پڑوسیوں کی طرح جینا سیکھیں گے؟ دونوں امن اور دوستی کی باتیں تو بہت کرتے ہیں، مگر پائیدار امن قائم نہیں کرتے اور ایک دوسرے پر اسلحے کا ڈھیر لگانے کا الزام عائد کر کے اپنی اپنی دفاعی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ کون سچ کہہ رہا ہے اور کون جھوٹ؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ ایک عام شہری کی حیثیت سے میں اس کا کس طرح سراغ لگاؤں؟ یہ امن و امان کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟ ضرور کوئی ایسی وجہ ہے جس کے باعث چالیس سال گزر جانے کے باوجود دونوں ملکوں میں اچھے تعلقات قائم نہیں ہوئے"۔

میں دونوں ملکوں کے ماضی کی تاریخ میں کھو گیا اور اپنے خیالات سے اس وقت چونکا جب ٹرین اٹاری پہنچ کر رک گئی اور ہندوستانی حکام نے تمام مسافروں کو چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پلیٹ فارم پر ایک قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ جیسے فاتح قوم کے سپاہی، شکست خوردہ قوم کے جنگی قیدیوں کو قطار میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

یاالٰہی یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دو ہزار پاکستانی اور ہندوستانی مسافر (جن میں چھ ماہ اور ایک سال کی عمر کے شیر خوار بچوں سے لے کر اسی پچاسی سال کی ضعیف عورتیں اور مرد شامل ہیں) ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں؟ ٹرین چار روز کے رکے ہوئے دو ہزار سے زائد مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور گرمی کی شدت سے ہر شخص پریشان تھا۔ ہندوستانی حکام نے ناممکن کو ممکن بنا دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی تو لوگ سفر کرتے ہیں، انسان اس قدر ذلیل و خوار تو نہیں ہوتا۔" میں نے سوچا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ "شاید ایسا دونوں ملکوں کے "خصوصی تعلقات" کی وجہ سے ہے۔ دونوں ملکوں کی نظروں میں عوام الناس کی حیثیت جانوروں سے زیادہ نہیں۔ اسی لیے وہ دوسرے

ملک کے شہریوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں"۔

حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ پلیٹ فارم پر اتر گیا اور اس جانب بڑھنے لگا جہاں محکمہ صحت کا کاؤنٹر تھا اور جہاں پاکستانی اور ہندوستانی مسافر الگ الگ قطاروں میں کھڑے تھے۔ حکام نے عورتوں پر رحم کھا کر ان کی الگ قطار بنا دی تھی۔ جہاں ہندوستانی اور پاکستانی عورتیں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے دھوپ کی شدت اور پیاس سے ہانپ رہی تھیں۔

"یا اللہ! یہ کس جرم کی سزا ہے؟ ان کا جرم تو بس اتنا تھا کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کے لیے جا رہے تھے"۔ میں نے سوچا، "کاش دونوں ملکوں کے سربراہان مملکت نے بھیس بدل کر ہم جیسے عام لوگوں کی طرح "سمجھوتہ ایکسپریس" میں سفر کیا ہوتا۔ ہماری طرح گھنٹوں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں قطار باندھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کیا ہوتا! وہ تو نئی دہلی اور اسلام آباد کے ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ہمارے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔ ہوائی جہازوں پر سفر کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم عام ہندوستانی اور پاکستانی سفر کے دوران کتنی اذیتیں برداشت کرتے ہیں۔ امیگریشن، ہیلتھ اور کسٹم آفیسروں کے ہاتھوں کس قدر ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور قلی سے لے کر عام سپاہی تک ہمیں کتنے بڑے پیمانے پر لوٹتے ہیں۔ یہ لوگ عام مسافروں کی حیثیت سے سفر کریں تو انہیں ہماری تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس ہو۔ میں نے سوچا "ہارون الرشید ہر عہد میں تو پیدا نہیں ہوتا!"

میں نے ایک ہندوستانی سپاہی سے پوچھا، "اس قدر گرمی میں آخر سارے مسافروں کو ٹرین سے اتارنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ ٹرین کے اندر بھی تو ہو سکتا ہے؟"

اس نے جواب دیا، "دراصل اس طرح تمام مسافروں کو شمار کرنا مقصد ہے اور یہ کام لوگوں کو ٹرین سے اتارے بغیر ممکن نہیں"۔

"کیوں ممکن نہیں؟ مہذب ملکوں میں تو ٹرین کے اندر ہی سب کچھ ہوتا ہے"۔ میں نے سپاہی سے سوال کرنے کے بجائے اپنے آپ سے پوچھا اور خاموش ہو گیا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے ایک ایک کر کے ٹرین سے اتر رہے تھے اور قطاریں لمبی سے لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔

میں نے ہیلتھ آفیسر سے کہا، "میں دل کا مریض ہوں۔ اتنی گرمی میں میں قطار میں کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میں ایک ----"

"اچھا، اچھا، آپ یہاں کھڑے ہو جائیں۔" آفیسر نے میرا حلیہ دیکھتے ہوئے قطار میں سب سے آگے

کھڑا کر دیا۔ مجھے ہیلتھ کاؤنٹر سے سب سے پہلے فارغ کر دیا گیا۔ پھر میں امیگریشن کاؤنٹر پر گیا اور سب سے آخر میں کسٹم کے کاؤنٹر پر۔ میں نے ایک بار پھر اپنے ادیب اور صحافی ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا لیکن نوجوان کسٹم آفیسر کو میری بات پر یقین نہ آیا، لیکن اس نے جب سوٹ کیس میں پہننے کے چند کپڑوں کے علاوہ صرف کتابیں ہی کتابیں دیکھیں تو وہ حیران رہ گیا اور اس نے اردلی کو بھیج کر اپنے افسر اعلیٰ کو بلوایا۔ افسر اعلیٰ مہاراجہ پٹیالہ کی طرح طویل القامت بڑی بڑی مونچھوں والے سردار جی نکلے۔

انہوں نے دریافت کیا، "آپ کرتے کیا ہیں"۔

"جناب، میں ادیب اور صحافی ہوں اور کتابیں لکھتا ہوں"۔

میں نے اپنا ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" نکال کر ان کے سامنے پیش کر دیا اور کتاب میں اپنا خاکہ دکھاتے ہوئے کہا، "میں اس کتاب کا مصنف ہوں اور یہ کتابیں دوستوں میں مفت تقسیم کرنے کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

سپرنٹنڈنٹ کسٹم نے ناول کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا "میں آپ کا ناول پڑھنے کے لیے رکھ رہا ہوں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں؟"

"بالکل نہیں، بصد شوق آپ لے جائیے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ میرا ناول پڑھیں گے۔" میں نے ان سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے نوجوان کسٹم آفیسر کو مجھے فارغ کر دینے کا حکم دیا۔

کسٹم سے تو میں جلد فارغ ہو گیا لیکن دوسرے مسافروں کے ساتھ چھ گھنٹے تک چلچلاتی ہوئی دھوپ میں مسلسل تپتا رہا۔ پورے اسٹیشن پر نہ تو شیڈ تھا اور نہ سر چھپانے کی جگہ۔ گرمی اپنے عروج پر تھی اور شیر خوار بچوں سے لے کر نوجوان اور ضعیف مرد اور عورتیں گھنٹوں قطار میں کھڑے ہو کر امیگریشن، ہیلتھ اور کسٹم افسران سے نمٹ رہے تھے۔ ان اذیت ناک فرائض سے فراغ ہوتے ہی میں نے ٹرین کے اندر آ کر پناہ لی۔ چھ گھنٹے کے بعد جب ٹرین چلی تو میری جان میں جان آئی۔ اب میں صحیح معنوں میں ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہو چکا تھا۔ ٹرین پوری رفتار سے منزل کی جانب رواں تھی۔

واہگہ سے سہارن پور جاتے ہوئے ایسا محسوس ہوا، جیسے ہم سب جنگی قیدی ہیں اور ہمیں سخت پہرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ ایسا تاثر اس لیے پیدا ہوا کہ ٹرین کے تمام دروازے اندر سے بند تھے، کھڑکیوں پر سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور جو چند دروازے کھلے ہوئے تھے، ان پر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ پاکستانیوں کو پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی لیے "سمجھوتہ ایکسپریس" کہیں رکے بغیر مسلسل چل رہی تھی۔ واہگہ سے سہارن پور کے درمیان ٹرین اگر

سگنل کلیر نہ ہونے کی وجہ سے کسی جگہ رک جاتی اور مسافر ٹرین کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے تو مسلح سپاہی انہیں فوجی بوٹوں اور بندوق کے دستوں سے مار مار کر ٹرین پر چڑھنے سے روکتے۔ پاکستانی مسافروں کے ٹرین سے نیچے اترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنی اپنی جگہ پر ڈرے سہمے بیٹھے ہوئے تھے اور جلد از جلد اس عذاب سے نجات پانے کے منتظر تھے۔

میں نے ایک ہندوستانی سپاہی سے انجان بن کر پوچھا، سپاہی جی! آخر بات کیا ہے؟ تمام دروازے اندر سے بند کیوں ہیں؟ اور دروازے پر آپ لوگ تعینات کس لیے ہیں؟

اس نے خشمگیں نگاہوں سے میری جانب دیکھا، جیسے وہ میرے احمقانہ سوال پر تعجب کر رہا ہو۔ اس نے جواب دیا، "آپ نہیں جانتے کہ پنجاب میں غیر ملکیوں کا داخلہ منع ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم ہے، لیکن۔۔۔۔"

"لیکن ویکین کچھ نہیں۔ یہ ٹرین اٹاری سے روانہ ہوئی ہے تو اب سہارن پور پہنچ کر ہی رکے گی۔ درمیان میں کہیں نہیں ٹھہرے گی۔ ہندوستان کا خیال ہے کہ پنجاب میں سکھوں کے ساتھ پاکستان بھی دہشت گردی میں ملوث ہے۔ اسی لیے حکومت نے پاکستانیوں کے لیے اسپیشل ٹرین چلانے کا انتظام کیا ہے۔"

میں خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تو یہ معاملہ ہے! پنجاب کی صورت حال نے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید کشیدہ کر دیئے ہیں اور مزید بدگمانی کی فضار پیدا ہو گئی ہے۔" میں نے سوچا "بدگمانی اور عدم اعتماد کی فضار نے ہی دونوں ملکوں کو کبھی ایک دوسرے کے قریب آنے نہیں دیا۔ لیکن بدگمانی بلا وجہ تو نہیں ہوتی؟ اس کے پیچھے بھی تو عوامل ہوتے ہیں۔ آخر وہ عوامل کیا ہیں؟"

میں ماضی کی تاریخ کے اوراق پلٹنے لگا۔

دونوں فرقوں میں بدگمانی اور بے اعتمادی کا اصل سبب اکثریت کی اقلیت کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ امریکہ کی جنگ آزادی میں تو اکثریت نے سیاہ فام اقلیت کو حقوق دے دیئے اور اسے قومی آزادی کی جدوجہد میں شامل کر لیا لیکن برصغیر میں ہندو اکثریت، مسلم اقلیت کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئی اور اس طرح علیحدہ مملکت کا قیام ضروری ہو گیا۔ اس کی وجہ مذہبی تنگ نظری اور تعصب تھا جس نے کبھی اکثریت کو اقلیت کے حقوق کے بارے میں سوچنے پر آمادہ نہیں کیا۔ آج بھی ہندوستان کی اکثریت اپنی اقلیت کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔

اقلیت اگر تنگ نظر اور متعصب ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن اکثریت کا وسیع القلب اور فراخ دل نہ ہونا تعجب کی بات ہے!

ٹرین اٹاری سے روانہ ہوئی تو مسلسل چلتی رہی۔ ایک کے بعد ایک چھوٹے بڑے اسٹیشن آتے اور گزرتے گئے۔ ٹرین کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ ٹرین بالآخر امرت سر پہنچ کر غیر متوقع طور پر اسٹیشن پر رک گئی۔ بھوکے پیاسے مسافر کھانے پینے کی اشیاء خریدنے کے لیے تیزی سے کھڑکیوں کی جانب لپکے اور پوری، بھاجی اور مختلف قسم کی مٹھائیاں اور مشروبات خریدنے لگے۔

میں نے دل میں سوچا، "تو یہ ہے امرت سر کا وہ تاریخی شہر، جو آج اخبارات کا موضوع بنا ہوا ہے اور جہاں ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام جاری ہے۔ یہ وہی امرت سر ہے، جس نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جہاں جلیان والہ باغ کا اندوہ ناک سانحہ پیش آیا تھا، جہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر انگریز سامراج کے خلاف احتجاج کرنے کی پاداش میں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کیا تھا، جہاں بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور بھردواج جیسے جاں نثاران وطن پیدا ہوئے تھے اور آزادی کی پر تشدد راہ پر چل کر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، جسے انگریز حکمرانوں نے تخریب کاری اور دہشت گردی کا نام دیا تھا۔ جہاں تقسیم ملک کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کیا تھا اور جہاں آج ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو نہایت بے رحمی سے قتل کر رہے ہیں۔ کیا اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں؟"

مجھے اچانک افسانہ نگار سردن کمار ورما کا خیال آیا۔ سردن کمار ورما اسی شہر میں رہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں اس صوبے میں اس قدر قتل و غارت گری ہوئی کہ اللہ کی پناہ! سیاسی اور اقتصادی مطالبات نے فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ منافرت نے مذہبی جنون کی صورت اختیار کر لی تھی اور انسان اپنی سطح سے گر کر درندہ بن گیا تھا اور کسی نے بھی انسانی، اخلاقی اور مذہبی قدروں کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ انسان ایک ایسا جانور ہے جو موقع ملتے ہی تہذیب، اخلاق اور مذہب کا جامہ اتار پھینکتا ہے اور درندگی اور ننگی بربریت پر اتر آتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایک نے دوسرے کا خوب لہو بہایا۔ طاقت ور نے کمزور کو قابو میں لانے کے لیے قوت استعمال کی اور بات بننے کے بجائے مزید بگڑ گئی۔ اس خون خرابے میں سردن کمار ورما نہ جانے کس حال میں ہیں؟ نہ معلوم زندہ بھی ہیں یا نہیں؟

میں سوچتے سوچتے تھک گیا اور کھڑکی کے آہنی سلاخوں کے پیچھے سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہیں سردن کمار ورما جی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے انہیں خط لکھوں۔ ان سے

میرا تعارف نہیں تھا اور نہ خط و کتابت تھی لیکن ایک ادیب کے ناتے میں انہیں خط تو لکھ سکتا ہوں۔ ہندوستان کا لفافہ اور لیٹر پیڈ میرے ساتھ تھا۔ میں نے فوراً پیڈ نکال کر خط لکھنا شروع کر دیا اور لفافہ بند کر کے اور اس پر ان کا نام اور پتہ لکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ میں نے سوچا کہ دلی اسٹیشن پر اترتے ہی خط کو سپرد ڈاک کر دوں گا۔

امرت سر اسٹیشن عام اسٹیشنوں کی طرح تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن اس نے سکھ قوم پرستوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اسٹیشن پر فوج اور پولیس کے جوان جدید ترین ہتھیاروں سے لیس مستعید کھڑے ہوئے تھے کہ مبادا کہیں کوئی ہنگامہ برپا نہ ہو جائے اور انہیں بروقت کارروائی نہ کرنی پڑے۔

ٹرین امرت سر میں نصف گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد پھر روانہ ہو گئی اور مسافر سہارن پور پہنچنے کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ رات تین بجے ٹرین سہارن پور پہنچی۔ قلی ٹرین پر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے اور سامان پلیٹ فارم پر اتار کر اور اجرت وصول کر کے رفو چکر ہو گئے۔ میرے ساتھ دو نوجوان طالب علم لاہور سے سفر کر رہے تھے۔ وہ سیر و تفریح کی غرض سے بمبئی جا رہے تھے۔ راستے میں ان سے دوستی ہو گئی تھی اور انہوں نے معمر جان کر مجھے "چاچا" بنا لیا تھا اور میری بڑی خاطر مدارت کر رہے تھے۔ ہم سب پہلی بار سہارن پور پہنچے تھے۔ (اس وقت پاکستان سے ٹرین صرف سہارن پور تک جاتی تھی۔ دہلی تک ٹرین بعد میں جانے لگی) اور ہمیں معلوم نہیں تھا کہ دہلی جانے والی ٹرین کب ملے گی اور ہم وہاں کیسے پہنچیں گے۔ ریلوے اسٹاف سے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ صبح پانچ بجے نانگل ایکسپریس بالکل خالی آئے گی جو میرٹھ ہوتے ہوئے دہلی جائے گی۔ ہمارے لئے یہی ٹرین مناسب رہے گی۔ چنانچہ ہم سب اس کا انتظار کرنے لگے۔ صبح آٹھ بجے سے رات تین بجے تک مسلسل جاگنے کے باعث میں بہت تھک چکا تھا۔ میں پہلے ہی دل کا مریض تھا۔ اس پر ٹرین کے مسلسل سفر نے اور بھی تھکا ڈالا تھا۔ میں اپنا سوٹ کیس نوجوان طالب علموں کے حوالے کر کے ریلوے بک اسٹال پر گیا اور اردو، انگریزی، ہندی اور بنگلہ کے جتنے بھی تازہ ادبی، سیاسی اور فلمی جرائد ملے، سب خرید لیے اور پچاس روپے کا نوٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔ بک اسٹال والے نے میری جانب حیرت سے دیکھا اور کہا۔ "آپ پاکستانی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے اتنے سارے رسائل خرید رہے ہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رسائل لے کر رخصت ہو گیا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ہندوستان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی ایک پیاس تھی جسے میں فوری طور پر بجھانا چاہتا تھا، لیکن میں اپنے مقصد میں ناکام

رہا۔ اس لیے کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد ان چاروں زبانوں کے رسائل و کتب کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور ہندوستان کے سفر کے دوران حد سے زیادہ مصروفیت کے باعث بہت کم پڑھنے کا موقع ملا۔

ٹھیک پانچ بجے صبح نانگل ایکسپریس پہنچی اور دونوں طالب علموں نے اپنے سامان کے ساتھ میرا سوٹ کیس بھی ٹرین پر چڑھا دیا۔ میں بہت خوش ہوا کہ بیٹھنے کے لیے خالی جگہ مل گئی ہے، لیکن ٹرین جب صبح کاذب کے وقت میرٹھ پہنچی تو ریلوے پولیس نے ڈبے میں موجود تمام مسافروں کو باہر نکال دیا۔ معلوم ہوا کہ ہم سب جس ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے وہ زنانہ ڈبا تھا اور مسافروں نے اس پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ دونوں طالب علموں نے اپنے سامان کے ساتھ میرا سوٹ کیس بھی بعجلت بغل والے ڈبے میں چڑھا دیا۔ بیٹھنے کی خالی نشست تو نہیں ملی البتہ میں دروازے کے قریب اپنے سوٹ کیس پر بیٹھ گیا۔ میرٹھ کے بعد ٹرین ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی رہی اور ہر اسٹیشن سے ملازمت کے لیے دارالحکومت جانے والے جوق در جوق سوار ہوتے گئے۔ ایک اسٹیشن پر ایسا ہوا کہ ٹرین کا دروازہ کھلتے ہی مسافروں کا ایک زبردست ریلا اندر داخل ہو گیا اور دروازے کے قریب رکھے ہوئے سامان پر چڑھتا ہوا اور بیٹھے ہوئے مسافروں کو روندتا ہوا اس طرح داخل ہوا جیسے سب کو کچل کر رکھ دے گا۔ میں انسانوں کے سیلاب کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے لیٹرین کے دروازے سے بالکل چپک گیا۔ معاً ایسا محسوس ہوا جیسے میرا دم گھٹ جائے گا اور میں وہیں ختم ہو جاؤں گا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے لیٹرین میں داخل ہو کر اپنی جان بچائی اور دہلی پہنچنے تک وہیں پناہ گزیں رہا اور پہلی بار محسوس ہوا کہ واقعی ہندوستان کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے!

ہر بڑے شہر کی طرح ملازمت پیشہ لوگوں کی بڑی تعداد دارالحکومت کے مضافات میں رہتی ہے اور یہ مضافات پچیس سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ کلکتے اور بمبئی کی طرح ہزاروں کی تعداد میں لوگ روز صبح کے وقت ٹرین سے دہلی جاتے اور شام کو گھر لوٹ آتے ہیں۔ انہیں عرف عام میں "ڈیلی پیسنجر" کہا جاتا ہے۔ ان میں بڑی تعداد متوسط طبقہ کے ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ ہر شخص اپنے ہاتھ میں ٹیفن کیریئر یا لنچ بکس تھامے ہوئے تھا۔ میرٹھ سے دہلی تک سفر کے دوران ریل کے ڈبے مسافروں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ مسافروں کی حد سے زیادہ تعداد کے باعث ڈبے میں سانس تک لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود سیاسیات حاضرہ پر گفتگو اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مسافر بلند آواز میں کہہ رہا تھا

"لوگ کہتے ہیں اتر پردیش کے لوگ حکومت پر چھائے ہوئے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں پر ان کی اجارہ داری ہے، لیکن یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ان کے ہاں تعلیم کتنی ہے۔ ان کی آبادی کتنی بڑی ہے۔"

وہ شخص تنہا تقریر کرتا رہا اور کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاید کسی نے ہندوستان کی سیاست، خصوصاً مرکزی حکومت میں اتر پردیش کے لوگوں کی اجارہ داری پر اعتراض کر دیا تھا، جس پر وہ شخص بپھر گیا تھا۔ درحقیقت ہندوستان کی سیاست اور مرکزی حکومت پر ابتدا ہی سے اتر پردیش کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اجارہ داری رہی ہے، خصوصاً نہرو خاندان کی اور چالیس سال گزر جانے کے بعد یہ احساس شدید تر ہوتا چلا گیا ہے۔ اتر پردیش ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، اس کی آبادی بھی سب سے زیادہ ہے اور پھر ذات پات کا امتیاز بھی یہیں سب سے زیادہ ہے، اس لیے ہر انتخاب میں لوک سبھا کے لیے اتر پردیش سے نمائندے بھی زیادہ منتخب ہوتے ہیں۔ اسی طرح آزادی کے بعد سے مرکزی حکومت پر اسی صوبے کا مستقل تسلط چلا آ رہا ہے، چنانچہ چھوٹے صوبوں کو (جنہیں ہندوستان کے آئین کے تحت ریاست کہا جاتا ہے) اس بات کا شدید احساس رہا ہے۔ جب بھی کوئی قومی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، چھوٹے صوبے کے لوگ اتر پردیش کے تسلط کا گلہ شروع کر دیتے ہیں۔ رات بھر اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی اور میں جلد از جلد دہلی پہنچنے کی دعا مانگتا رہا۔

اب دہلی زیادہ دور نہیں تھی۔

ٹرین جوں جوں تیز رفتاری سے دہلی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

دہلی جو اس وقت انڈین یونین کا دارالحکومت ہے۔ آج سے چالیس سال قبل بھی متحدہ ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔ یہیں سے چالیس کروڑ عوام کی تقدیر کا فیصلہ صادر کیا جاتا تھا اور برطانیہ عظمیٰ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ یہیں سے سارے برصغیر پر حکمراں تھا، دہلی، جو گیارہویں صدی عیسوی سے حکمرانوں اور طالع آزماؤں کا مسکن رہا ہے، آج بھی اپنے حجم اور جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے اپنی اہمیت برقرار رکھنے میں کامیاب تھا۔ ترکوں سے لے کر پٹھانوں اور مغلوں تک کتنے حکمراں آئے اور گزر گئے۔ دہلی کی سرزمین نے کتنی بادشاہتوں کو ابھرتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا۔ کتنی زبانوں اور تہذیبوں کو ضم ہوتے اور شکلیں بدلتے ہوئے محسوس کیا، کتنے مذاہب کو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے پایا اور کتنی جلد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کی گواہی دی۔ دہلی، آج ایک سیکولر ریاست کا دارالحکومت ہے۔ ایک ایسی سیکولر ریاست، جو اپنے کردار کے اعتبار سے خالصتاً ہندو

ہے۔ یہی وہ شہر ہے، جہاں سے برصغیر کی تقسیم کا اعلان ہوا اور ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو آزاد اور خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں اور یہی وہ مقام ہے، جہاں منافرت کے مستقل بیج بوئے گئے، جو آج بھی نشو و نما پا رہے ہیں۔

دلی جو ایک شہر ہے

"جناب، کس خیال میں کھوئے ہوئے ہیں؟ جلدی سے سامان سمیٹیے، دلی آرہی ہے۔" میرے ہم سفر نے مجھے خبردار کیا۔

خدا خدا کر کے 18 مارچ 1986ء کی صبح نو بجے ٹرین پرانی دلی پہنچی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دونوں طالب علموں نے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ مجھے وداع کیا۔ میں قلی پر سامان لدوا کر اسٹیشن کے باہر پہنچا اور ٹیکسی پر سامان چڑھوانے لگا۔ میں نے قلی کو پانچ روپیہ دیا تو اس نے احتراماً جھک کر سلام کیا۔ دوسری جانب ٹیکسی ڈرائیور نے خاموشی سے سامان ڈگی میں رکھ دیا۔ اس نے کراچی کے ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح نہ تو منزل مقصود کے بارے میں دریافت کیا اور نہ کرائے کے بارے میں پہلے سے معاملہ طے کیا۔ وہ خاموشی سے منزل کا پتہ پوچھ کر روانہ ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں دل ہی دل میں کراچی اور دہلی کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا موازنہ کرنے لگا۔

چوبیس گھنٹے مسلسل جاگنے اور بے انتہا تھکاوٹ کی وجہ سے میں حواس باختہ ہو رہا تھا اور مجھے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کس سڑک سے گزر رہا ہوں۔ میں ٹیکسی ڈرائیور کو شارب ردولوی کے محلے ماڈل ٹاؤن کا نام بتا کر ٹیکسی میں نیم دراز ہو گیا۔ ڈرائیور کو احتیاطاً یہ بھی بتا دیا کہ ماڈل ٹاؤن کے گوردوارے کے قریب جانا ہے، چنانچہ ڈرائیور بڑی آسانی سے شارب صاحب کے گھر تک لے گیا۔ شارب صاحب اس وقت اپنے گھر کی پھلواری میں پانی دے رہے تھے۔ سفید رنگت اور آنکھوں پر دبیز فریم کی عینک میں وہ ہی وجیہ لگ رہے تھے۔ ان کے دراز قد اور پیشانی پر مفکروں جیسی شکنیں دیکھ کر پہلی نظر میں ہی دانشور لگے۔ یہ تو معلوم تھا کہ وہ کالج میں استاد ہیں، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ شکلاً بھی استاد جیسے ہیں۔ بعض استاد تو چہرے مہرے سے استاد کے بجائے اداکار اور اسپورٹس مین لگتے ہیں۔

لگتے ہیں۔

ٹیکسی کے رکتے ہیں وہ بڑے تپاک سے آگے بڑھے اور ٹیکسی سے نیچے اترتے ہی انہوں نے مجھے ینے سے لگالیا۔ ہماری آپس میں خط و کتابت تو بہت پرانی تھی لیکن ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے ے مل رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع تو دے دی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ کب آؤں کا۔اس لیے وہ اسٹیشن نہیں پہنچے۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میرا سامان اٹھا کر مہمان خانے میں لے گئے جو دوسری منزل پر واقع تھا۔ یہ دراصل شارب صاحب کا کتب خانہ تھا اور لکھنے پڑھنے اور آرام رنے کی جگہ بھی۔ ہر طرف کتابیں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ ایک جانب رائٹنگ ٹیبل تھی اور وسری جانب پلنگ۔ ان کا جو بھی مہمان آتا تھا۔ یہیں قیام کرتا تھا۔ یہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوئی۔

شارب صاحب نے اپنی دس سالہ بچی شعاع فاطمہ سے میرا تعارف کرایا جو ابھی ابھی امتحان سے ارغ ہوئی تھی اور شوخ تتلی کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔ شارب صاحب کی نصف بہتر یعنی شمیم نکہت ھی تک کالج سے واپس نہیں آئی تھیں۔ ان دنوں ان کے کالج میں امتحان چل رہا تھا، جس کے باعث وہ ت زیادہ مصروف تھیں۔ میں ان سے کراچی میں محمد علی صدیقی کے ہاں ضیافت میں مل چکا تھا۔ وڑی دیر میں وہ بھی آگئیں اور ہم دونوں کی گفتگو میں شامل ہو گئیں۔ شارب اور شمیم نکہت کا جوڑا ت ہی خوبصورت، آئیڈیل اور قابل رشک تھا۔ دونوں کا شعروادب سے گہرا تعلق تھا۔ دونوں درس تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے، دونوں زندگی کی جدوجہد میں شانہ بہ شانہ شریک تھے اور سب سے ی بات یہ کہ دونوں میں گہری محبت اور کامل افہام و تفہیم تھی۔ علاوہ ازیں ان میں بہت سی باتیں شترک تھیں، مثلاً دونوں ہم جماعت رہ چکے تھے اور لکھنو یونیورسٹی سے ایک ساتھ ایم۔اے کیا تھا۔ نوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ دونوں پروفیسر احتشام حسین کے د تھے، دونوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اور دونوں کے ادیب بننے میں احتشام حسین کا ہاتھ تھا۔

میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ دل کا مریض ہوتے ہوئے کراچی سے دہلی تک ٹرین کا طویل، ٹ وہ اور تھکا دینے والا سفر طے کرنے کی وجہ سے میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ایسا محسوس ا تھا جیسے میں ابھی غش کھا کر گر پڑوں گا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ مجھے نہیں م تھا کہ ہندوستان کا سفر اتنا جان لیوا ثابت ہو گا اور میری حالت اتنی زیادہ خراب ہو جائے گی۔ میں ب صاحب اور شمیم بھابی سے تھوڑی دیر گفتگو کرتا رہا۔ پھر ان سے اجازت لے کر آرام کرنے کی ں سے چلا گیا اور بے حال ہو کر بستر پر گر پڑا اور اس طرح سویا کہ دونوں میاں بیوی کو تشویش ہوئی

کہ مبادا مجھے کچھ ہو نہ گیا ہو۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا تھا یا خواب غفلت میں محو تھا۔ اس دوران شارب اور شمیم بھابی میری خبر گیری کے لیے کئی بار مہمان خانے میں آئیں اور مجھے سوتا ہوا دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ جب کئی پہر گزر گئے اور صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی اور میں بیدار نہ ہوا تو دونوں گھبرا گئے۔ بالآخر میں رات دس بجے بیدار ہوا اور شارب اور شمیم بھابی نے مجھے زندہ اور سلامت پایا تو ان کی جان میں جان آئی۔ بعد میں شمیم بھابی نے بتایا کہ میری وجہ سے وہ سب بہت پریشان تھے۔ میں نے ان سے معذرت طلب کی اور انہیں اپنے ہولناک سفر کی روداد سنائی۔

شارب صاحب نے اس دوران اردو اکیڈیمی دہلی کے سیکرٹری شریف الحسن نقوی کو فون کر کے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ دوسرے روز اردو اکیڈیمی کی جانب سے غالب اکیڈیمی کی سماعت گاہ میں "دلی والے" کے عنوان سے خاکہ نگاری کے موضوع پر سہ روزہ سیمینار منعقد ہونے والا تھا، چنانچہ شارب صاحب اور نقوی صاحب نے اپنے تئیں سیمینار میں مجھ سے مقالہ پڑھوانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی اطلاع مجھے اس وقت ملی جب میں نیند سے بیدار ہو کر نیچے آیا۔ معلوم ہوا کہ مجھے آزمائش میں ڈالنے کا ان دونوں نے پہلے ہی پروگرام بنا لیا ہے۔ شارب صاحب کے اس منصوبے سے میں بہت گھبرایا، اس لیے کہ میں نے اس سے قبل کبھی کسی ادبی اجتماع سے خطاب نہیں کیا تھا۔ اس کی اصل وجہ میری لکنت تھی۔ میں ان کی تجویز سے بہت گھبرایا اور شارب صاحب کو اپنی پریشانی سے مطلع کیا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا، "اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ خاکہ نگاری کے بارے میں چند صفحات لکھ ڈالیے اور اسے آہستہ آہستہ رک رک کر پڑھیے۔ یہاں کے لوگوں کو کیا معلوم کہ آپ کی زبان میں لکنت ہے۔ لوگ اسے آپ کے پڑھنے کا اسٹائل سمجھیں گے۔"

ان کے ہمت دلانے پر میری جان میں جان آئی، ان کی تجویز پسند آئی اور میں نے مضمون پڑھنے کی حامی بھر لی۔ دوسرے روز جب اردو روزنامہ "قومی آواز" آیا تو اس کے آخری صفحے پر اردو اکیڈیمی کے مجوزہ سیمینار کے اشتہار میں میرا نام بھی جلی حروف میں چھپا ہوا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ پاکستان کے مشہور ادیب اور نقاد شہزاد منظر بھی مجوزہ سیمینار سے خطاب کریں گے۔ میں دل ہی دل میں گھبرایا کہ میری رسوائی کا سارا سامان مکمل ہو چکا ہے اور اب فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اتنے بڑے اجتماع میں اب میری قلعی کھل کر رہے گی۔ شارب صاحب کے حوصلہ دلانے پر میں مضمون لکھنے کے لیے بیٹھا اور چند منٹوں میں مضمون لکھ کر ان کے حوالے کر دیا تاکہ وہ پڑھ کر اس کے بارے میں مشورہ دیں۔

انہوں نے مضمون پڑھا اور پسند فرمایا۔

میں نے دہلی روانہ ہونے سے قبل جوگندر پال اور اپنے دیرینہ دوست، اردو اور انگریزی کے مشہور صحافی اور ادیب شمس الزماں کو اپنی آمد اور شارب ردولوی کے ہاں قیام کی اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے میری آمد سے قبل ہی شارب صاحب کو کئی بار فون کر کے میرے بارے میں دریافت کیا تھا۔ شمس الزماں کو جب معلوم ہوا کہ میں 28 مارچ کو دہلی پہنچ رہا ہوں تو اس نے مجھ سے اسی روز فون پر رابطہ قائم کیا۔ اور مجھ سے فوراً ملنے کے لیے شارب ردولوی کے ہاں پہنچ گیا۔

شمس الزماں میرے ان چند نہایت عزیز و مخلص اور مشفق دوستوں میں سے تھا، جنہیں میں زندگی یں کبھی فراموش نہ کر سکا۔ ہم پورے اکیس سال کے بعد ایک دوسرے سے مل رہے تھے، چنانچہ اس کے پہنچتے ہی ہم دونوں والہانہ انداز میں بغل گیر ہو گئے۔ بچوں کی طرح ایک دوسرے کے رخساروں کو ہ دیا اور ہماری آنکھیں خوشی کے مارے پُرنم ہو گئیں۔ شمس الزماں کا شمار آج ہندوستان کے اردو اور نگریزی کے مشہور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اس دوران بڑی شہرت اور عزت حاصل کی ہے۔ لی کا شاید ہی کوئی اردو، ہندی اور انگریزی کا ادیب اور صحافی ہوگا جو اس کے نام سے واقف نہ ہو۔ لی کے سولہ روزہ قیام کے دوران میں جس ادیب و شاعر سے بھی ملا، اس نے شمس سے اپنی گہری نیت اور دوستی کا اعتراف کیا۔ اتنے بڑے شہر کے ادبی، سیاسی اور صحافتی حلقوں میں اس کی غیر مولی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ مقبولیت کی اصل وجہ اس کی فعال ر متحرک شخصیت، اس کی شگفتہ بیانی، خلوص اور ہر کسی کی مدد کی عادت تھی۔ میں نے سولہ روز کے ران دیکھا کہ اس کے حلقہ احباب میں صرف ادیب و شاعر ہی نہیں، بہت سے سیاست داں اور لیمنٹ کے ممبران اور اخبارات کے مدیران کے علاوہ بڑی بڑی صنعتوں کے بزنس ایگزیکٹو بھی ل تھے۔ اس نے اس دوران سیاسی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا۔ وہ اس وقت ہ ڈالمیا گروپ آف انڈسٹریز کے نوجوان مالک سنجیے ڈالمیا کا پریس آفیسر تھا، لیکن وہ پارلیمنٹ کے ت سے ایسے ممبران کی گاہے بگاہے خدمات بھی انجام دیتا رہتا تھا۔ جنہیں اخبارات میں بیانات دینے، وں میں خطبہ صدارت پڑھنے یا اخبارات و رسائل میں مضامین چھپوانے کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ۔ اس نے سنجیے ڈالمیا کی سرپرستی میں ہندوستان کے مختلف فرقوں اور قوموں کے درمیان دوستی، ئی چارے اور یکجہتی قائم کرنے کے لیے ایک ملک گیر تنظیم قائم کر رکھی تھی، جس کا وہ سیکرٹری تھا س کی مجلس عاملہ میں ہندوستان بھر کی مختلف زبانوں کے سربرآوردہ ادیب، شاعر، صحافی اور دانش ور

شامل تھے۔ اس ادارے کی طرف سے ہر سال قومی یک جہتی کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے پر کسی ایک زبان یا علاقے کے کسی ایک ادیب، شاعر، صحافی یا سماجی اور سیاسی رہنما کو انعام دیا جاتا تھا۔ اس طرح اس کی ہندوستان کے تقریباً تمام اہم اخبار نویسوں، مصنفوں اور رہنماؤں سے شناسائی تھی۔

شمس الزماں کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع مونگیر سے تھا۔ ابتدا میں اسے شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی اور اسی حوالے سے اس سے میری 1962ء میں کلکتے میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اکاؤنٹینسی میں زیر تعلیم تھا اور میں کلکتے کے مشہور ہفت روزہ "آثار" سے نائب مدیر کی حیثیت سے وابستہ تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس ہفت روزہ کے توسط سے اپنے دو نہایت عزیز اور باصلاحیت دوستوں شمس الزماں اور محمود ایوبی (اسسٹنٹ ایڈیٹر اردو بلیٹز بمبئی) کو صحافتی حلقوں سے متعارف کرایا۔ آج یہ دونوں ہندوستان کے مشہور صحافی تصور کئے جاتے ہیں اور انہیں بڑا نام اور شہرت حاصل ہے۔ اکیس سال کے بعد شمس سے ملنے کے باعث یہ ساری باتیں چشم زدن میں یاد آگئیں اور ایسا محسوس ہوا جیسے میں شمس کے ساتھ کیس سال قبل کے کلکتے میں پہنچ گیا ہوں۔ جہاں ہم دونوں نے عرصے تک "آثار"۔ "آزاد ہند" اور دوسرے اخبارات میں ایک ساتھ کام کیا تھا اور اپنے اپنے صحافتی کیرئیر بنانے کی دھن میں مصروف تھے۔

میں نے شمس کو دوسرے روز صبح ایک بار پھر آنے کے لیے کہا، تاکہ میں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دے سکوں۔ دونوں ملکوں کے معاہدے کے تحت ہر پاکستانی کو ہندوستان پہنچنے کے 48 گھنٹے کے اندر پولیس کو اپنی آمد کی اطلاع دینی ضروری تھی اور میں جلد از جلد اس عذاب سے نجات پانا چاہتا تھا۔

اندر پرستھ

دوسرے روز صبح کو شمس الزماں کے پہنچتے ہی میں اس کے ساتھ سی۔ ٹی او (سنٹرل ٹیلی گراف آفس) روانہ ہو گیا۔ اس طرح میں نے پہلی بار ہندوستان کے دارالحکومت کو اپنی نظروں سے دیکھا۔ دہلی بلاشبہ بہت بڑا، صاف ستھرا اور متاثر کرنے والا شہر ہے۔ کشادہ اور صاف ستھری سڑکوں پر کاریں اور بسیں اس قدر تیز رفتاری سے چلتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ تیز رفتاری سے تو خیر کراچی میں بھی گاڑیاں چلتی ہیں، لیکن یہاں ٹریفک کی جس قدر بے قاعدگیاں اور خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔ میں نے دہلی کے سولہ روزہ قیام کے دوران کہیں نہیں پائیں۔ اس کی وجہ اگر ایک جانب ٹریفک کا عمدہ نظام ہے تو دوسرے جانب مسافروں اور ڈرائیوروں کا ٹریفک سینس بھی ہے۔ ایشیائی گیمز کے دوران دہلی کی سڑکوں کی نئے سرے سے منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ جابجا فلائی اوور تعمیر کی گئی تھی اور شاہراہوں کا ایسا نظام ترتیب دیا گیا تھا کہ گاڑیوں کو درمیان میں رکنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ دہلی میں چوراہے یا انٹر سیکشن سڑکیں بہت کم ہیں اور جہاں ہیں وہاں مسافروں اور ڈرائیوروں کا ضبط و نظم دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سی، ٹی، او کے قریب واقع چوراہے پر میں نے کسی راہ گیر کو درمیان سے سڑک پار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ راہ گیر زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کرتے تھے اور وہ بھی سبز بتی جلنے کے بعد۔ ٹریفک پولیس ایک جانب کھڑی تھی اور گاڑیاں ٹریفک کے ضابطے کے عین مطابق گزر رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے بڑے شہر میں ٹریفک کا یہ ضبط و نظم کیوں کر ممکن ہوا۔ شمس الزماں ایک ماہر گائیڈ کی طرح مجھے دہلی کی قدیم تاریخ کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں ایک مشتاق اور متجسس سیاح کی طرح گوش بر آواز تھا۔ شمس کہہ رہا تھا

دلی دنیا کے چند قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ دلی سب سے پہلے کب بسی اور کس نے

بسائی۔ یہ بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس لیے کہ جب ہندوستان میں تاریخ لکھنے کا آغاز ہوا۔ اس سے بہت پہلے دلی آباد ہو چکی تھی، لیکن اس کی شکل یہ نہیں تھی جو آج ہے اور نہ اس کا یہ نام تھا، جو آج ہے۔ آج سے ہزاروں سال قبل مہا بھارت کے زمانے میں دروپدی کو سوئمبر میں جیتنے کے بعد جب پانڈو ہستنا پور پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ ان کی بہادری، قابلیت اور ان کی شرافت کے دم بھرنے لگے۔ پانڈوؤں کی اس قدر تعریف و توصیف سے کوروؤں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں پانڈو راج پاٹ پر اپنا حق نہ جما لیں، چنانچہ ان دونوں کے سربراہ دھرت راشٹ نے بھائیوں کی آپس کی ناچاقی دور کرنے کے لیے جمنا کے کنارے واقع آس پاس کی زمین پانڈوؤں کو دے کر تنازعہ ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ پانڈوؤں کے سردار یدھشٹر نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اس علاقے میں ایک بہت بڑا جنگل واقع تھا، جسے "کھانڈو بن" کہتے تھے۔ یہ جنگل بہت بڑا اور بے حد گھنا تھا۔ پانڈوؤں کو معلوم تھا کہ اس بن کو کاٹ کر آباد کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے بزرگ دھرت راشٹ کے فیصلے کو مان لیا اور وہ خوشی خوشی کھانڈو بن کی طرف روانہ ہو گئے اور اندر دیو کی خوشی سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام اندر پرستھ رکھا۔

قدیم ہندوستان کا یہ شہر اندر پرستھ کیسا تھا؟ اس کے بارے میں ایک مورخ کا خیال ہے کہ اس شہر کے چاروں طرف پانی سے بھری ہوئی کھائیاں تھیں۔ شہر کے مختلف حصوں میں جانے کے لیے بڑی بڑی اور کشادہ سڑکیں تھیں۔ قسم قسم کے خوب صورت مکانات تھے۔ اس شہر میں سب ویدوں کے جاننے والے اعلیٰ پائے کے برہمن مستقل سکونت کے لیے آتے تھے۔ چہار جانب سے دولت حاصل کرنے کے خواہش مند لوگ بھی آتے اور مختلف فنون اور علوم میں دسترس رکھنے والے لوگ بھی۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں اندر پرستھ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی، چنانچہ اس کی آبادی تیزی سے بڑھتی گئی اور آس پاس کے جنگل کو کاٹ کر مزید مکانات اور محل بنانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ مہابھارت میں اس شہر کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ اندر پرستھ اور اس کے محلوں نے چند برسوں میں اتنی شہرت حاصل کی کہ یہ شہرت کوروؤں کو ہستنا پور سے اندر پرستھ کھینچ لائی اور انہوں نے یہاں کے محلوں کی سیر کی۔ اندر پرستھ میں پانڈوؤں کی ترقی دیکھ کر کوروؤں میں حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے پانڈوؤں کو نیچا دکھانے کے لیے ایک چال چلی، شکونی کو معلوم تھا کہ یدھشٹر کو پانسوں کے کھیل کا بہت شوق ہے۔ اسے کسی طرح کھیل کا لالچ دے کر ہستنا پور بلایا جائے اور اسے جوئے میں شکست دے کر ان کے راج پاٹ پر قبضہ کر لیا جائے اور اگر ہو سکے تو

دروپدی کو بھی ذلیل کیا جائے۔ دھرشٹ راشٹ کو معلوم تھا کہ جوا بہت بری شے ہے اور یہ تمام فساد کی جڑ ہے، چنانچہ انہوں نے پہلے تو اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں دریودھن کے اصرار پر اجازت دے دی اور ودھی کو اندر پرستھ بھیجا کہ یدھشٹر اور ان کے بھائیوں اور بیوی دروپدی کو کھیل کے لیے ہستناپور لائیں۔ یدھشٹر کو معلوم تھا کہ شکونی پانسے کا بہت چالاک اور ہنرمند کھلاڑی ہے اس سے جوئے میں جیتنا مشکل ہے، لیکن یہ ان کی شان و شوکت اور وقار کے خلاف تھا کہ ہستناپور سے دھرت راشٹ کا بلاوا آئے اور وہ محض جوئے میں ہار جانے کے خوف سے وہاں جانے سے انکار کر دیں۔ چنانچہ وہ سب ہستناپور پہنچے۔ پانسے کا مقابلہ ہوا اور اندیشے کے عین مطابق وہ جوئے میں راج پاٹ سب ہار گئے حتیٰ کہ دروپدی کو بھی اور دریودھن نے سر دربار دروپدی کو ذلیل کیا۔ اندر پرستھ کو جس مقصد سے آباد کیا گیا تھا، وہ حاصل نہ ہو سکا اور جوئے میں اس شہر کے ہارنے کے بعد اس شہر کو بسانے والے پانڈو شہر چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے اور نیا شہر صدیوں ویران رہا۔ مہابھارت کے اس بیان کے مطابق اندر پرستھ کے بسنے اور اجڑنے کے اس واقع کی تاریخ کا اندازہ مورخوں نے ساڑھے تین ہزار سال قبل از مسیح لگایا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ اندر پرستھ اس جگہ آباد تھا جہاں اس وقت پرانا قلعہ اور سندر نگر آباد ہے۔

سی۔ ٹی۔ او کی عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچتے ہی شمس نے قدیم دلی کے بارے میں اپنی دیو مالائی داستان ختم کر دی اور میں سوچنے لگا کہ دلی کے بسنے کی یہ داستان خواہ افسانہ ہو یا حقیقت۔ ہے بہت دلچسپ۔ اس سے کم سے کم اس قدیم شہر کے بارے میں یک کہانی تو جنم لیتی ہے۔ اس طرح کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ دہلی ہے بہت پرانا شہر اور اس کے بسنے اور اجڑنے اور پھر بسنے کی داستان صدیوں پر محیط ہے۔ اس اعتبار سے اگر دہلی کو دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جائے تو شاید غلط نہیں ہے۔

سی۔ ٹی۔ او کے باہر کار کھڑی کرنے کے بعد میں، شمس کے ساتھ غیر ملکی باشندوں کے رجسٹریشن آفس میں داخل ہوا۔ میرے پاس بریف کیس تھا، جس کا صدر دروازے پر تعینات مسلح پہرے داروں نے کھول کر معائینہ کیا اور مکمل اطمینان کر لینے کے بعد اندر جانے کی اجازت دی۔ جب سے اندرا گاندھی کا قتل ہوا ہے اور سکھ انتہا پسندوں کی دہشت پسندانہ سرگرمیاں تیز ہوئی ہیں، دہلی کی تمام سرکاری عمارتوں اور دفتروں میں سخت پہرہ لگا دیا گیا ہے اور ہر آنے جانے والے کی سختی کے ساتھ تلاشی لی جاتی ہے، چنانچہ میری بھی تلاشی لی گئی۔ رجسٹریشن آفس میں کام منٹوں میں ہو گیا اور مجھے

اقامتی پروانہ دے دیا گیا۔ جسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا ضروری قرار دیا گیا۔

ابھی واپسی میں کافی وقت تھا۔ اس لیے شمس مجھے اپنی کار پر شہر کی سیر کرانے کے لیے لے گیا۔ شمس طبعاً بہت باتونی واقع ہوا تھا لیکن اس کی شگفتہ بیانی سے اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی چنانچہ وہ پھر دہلی کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرنے لگا۔ میں نے اس سے ہنستے ہوئے کہا "یار! تم صحافت کا پیشہ چھوڑ کر گائیڈ کا کام شروع کر دو۔ تم نے اس میں بڑی مہارت حاصل کر لی ہے اور معلوم ہوتا ہے تم نے دہلی کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔"

شمس نے جواب دیا، "بات دراصل یہ ہے کہ پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت میں نے دہلی کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور دہلی پر اردو اور انگریزی میں کئی مضامین لکھ چکا ہوں۔"

سی۔ ٹی۔ او سے روانہ ہوتے ہی شمس نے پھر دلی کی داستان شروع کر دی۔

"ایک قدیم بستی (اندر پرستھ) اتنا بڑا شہر اور سارے ملک کا دارالحکومت کس طرح بن گئی؟ یہ حیرت کی بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بستی دریائے جمنا کے کنارے واقع تھی اور یقیناً بہت زرخیز رہی ہوگی، ورنہ اس پر قبضہ کرنے کے لیے جنگیں کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اندر پرستھ کا حال مہابھارت کے علاوہ راماین میں بھی ملتا ہے۔ اس سرزمین کے لیے قدیم ہندوستان میں بڑی بڑی جنگیں لڑی گئی تھیں۔ 70 لاکھ نفوس پر مشتمل یہ شہر ہمیشہ ایسا خوبصورت اور وسیع و عریض نہیں تھا۔ اس شہر کا قدیم نام دلی بھی نہیں تھا۔ ابتدا میں اس کے کئی نام بدلے۔ دلی ہندوؤں کا رکھا ہوا نام ہے۔ جسے بعد میں مسلمانوں نے فصاحت کی غرض سے دہلی بنا لیا۔ دہلی کا نام پہلے پہل بھاٹوں کے کبتوں میں آیا ہے۔ ایک کبت میں ذکر ہے کہ 792 برس تک دلی اجاڑ رہی۔ اس میں کوئی آباد ہی نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر یہ آباد ہوئی۔ دہلی خواہ جب بھی آباد ہوئی ہو، اسے ابتدا میں زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ اس لیے کہ محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملہ کر کے متھرا اور قنوج کو لوٹا اس وقت تک دہلی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ 1052 ء میں جب وہ قطعی طور پر ہندوستان میں آ بسا اس وقت بھی دہلی ویران تھی۔ دہلی کو تنوار خاندان کے حکمراں راجہ اننگ پال نے پہلی بار اپنا دارالحکومت بنایا اور اسی دور میں پرانی دہلی میں فصیلیں تعمیر کی گئیں۔ 1151 ء میں چوہان راجپوتوں میں سے وساریو نامی ایک راجہ نے اس شہر کو فتح کر لیا۔ پھر ترک حکمراں محمد بن سام اور قطب الدین غوری نے اس پر قبضہ کر لیا، چنانچہ 1193 ء سے آج تک دہلی مختلف عہد حکومت میں ہندوستان کا دارالحکومت چلی آ رہی ہے۔ اس عرصے میں قطب الدین غوری، التتمش، جلال الدین خلجی، غیاث الدین تغلق، بابر، ہمایوں، شیر

شاہ سوری، اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب اور بہادر شاہ ظفر بے شمار تاج دار آئے اور گزر گئے لیکن دہلی کی مرکزیت اپنی جگہ قائم رہی۔ صرف انگریز حکمراں ایسے تھے جنہوں نے دہلی کے لال قلعے پر فتح و نصرت کا پرچم لہرانے کے باوجود ابتدا میں دہلی کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنانے سے گریز کیا اور کلکتے کو راج دھانی بنا کر اس کی لندن کے طرز پر تعمیر شروع کی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انگریزوں نے پہلے بنگال میں قدم رکھا اور پھر رفتہ رفتہ پورے ہندوستان کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انگریز حکمراں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے ایک نیا شہر آباد کرنا اور نیا دارالحکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد میں انہیں بہت حد تک کامیابی ہوئی اور عرصے تک انگریز حکمراں کلکتے سے سارے ہندوستان پر حکومت کرتے رہے، لیکن 1911ء میں انہیں اچانک احساس ہوا کہ دہلی کو جب تک دارالحکومت نہیں بنایا جائے گا۔ ہندوستان کے عوام کے دل و دماغ پر برطانیہ عظمیٰ کا رعب و دبدبہ قائم نہیں ہو گا، چنانچہ اسی سال 11 جون 1911ء کو انگلستان کے لیے بادشاہ، شاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کی عظیم الشان تقریب ہوئی اور اس کا دہلی میں فقید المثال جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ مغل بادشاہوں کی روایت کے عین مطابق دہلی میں ایک عظیم الشان شاہی دربار منعقد ہو گا۔ برطانوی ہند کی تاریخ میں یہ واقعہ آج بھی "دہلی دربار" کے نام سے موسوم ہے۔

اس ڈرامے کا مقصد صرف یہ تھا کہ شاہ برطانیہ اور ہندوستان کا شہنشاہ اپنی عظمت اور رعب و دبدبہ کا نہ صرف خود نظارہ کرے بلکہ ہندوستانی رعایا پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر مرتسم ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں، نام نہاد "خود مختار" ہندوستانی راجاؤں اور نوابوں کو بھی ان کی اوقات بتا دی جائے، چنانچہ 12 دسمبر 1911ء کو اسی ہزار ہندوستانی غلاموں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے سامنے دہلی دربار منعقد ہوا اور فرماں برداری اور وفاداری کے مظاہرے کے لیے جو شاہی جلوس نکلا۔ اس کی قیادت متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور خود مختار "مسلم" ریاست حیدر آباد (دکن) کے والی، ہز ایگزلینڈ ہائی نیس نظام حیدر آباد نے کی، جو سلطنت برطانیہ کے "وفادار ساتھی" ہونے کا اعزاز رکھنے کے باوجود اس جلوس میں محض ایک معمولی باج گزار بن کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے سارے نوابوں، راجاؤں اور شہزادگان تخت شاہی پر جلوہ افروز شہنشاہ برطانیہ کے حضور باریاب ہو کر بار بار جھک کر سلام کیا اور انہیں ذاتی تحسین و آفرین کا نذرانہ پیش کیا

دارالحکومت کی کلکتے سے دہلی منتقلی ایک تاریخی فیصلہ سہی، لیکن اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ یعنی اس پر چالیس لاکھ اسٹرلنگ پونڈ خرچ آیا تھا (1911ء میں چالیس لاکھ اسٹرلنگ

پونڈ کی رقم کا اندازہ کیجیے) اس خرچ سے برطانوی پارلیمنٹ میں تہلکہ مچ گیا۔ ارکان پارلیمنٹ کو شکایت پیدا ہوئی کہ اتنا اہم اور تاریخی فیصلہ کرنے سے قبل انتظامیہ نے پارلیمنٹ کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا۔ اگر انتظامیہ پارلیمنٹ سے اجازت لیے بغیر اسی طرح آزادانہ طور پر فیصلے کرتی رہی تو برطانیہ میں پارلیمانی نظام حکومت کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ ان اعتراضات نے حکومت کے اہل کاروں کو قدرے پریشان کر دیا۔ تاریخ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب ہندوستان کی رعایا کو مکمل طور پر غلام اور وفادار بنایا جا رہا تھا، عین اس وقت برطانیہ میں جمہوریت اپنے پورے نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور پارلیمنٹ شاہ برطانیہ کے ہر اقدام پر سختی کے ساتھ گرفت کر رہی تھی۔ کلکتے سے دہلی دارالحکومت منتقل کرنے کے فیصلے پر ارکان پارلیمنٹ کو سخت اعتراض تھا اور وہ انتظامیہ کے یک طرفہ فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اہل کاروں کو اندیشہ تھا کہ اگر پارلیمنٹ نے اس کی منظوری نہ دی تو تاج برطانیہ کا وقار خاک میں مل جائے گا، چنانچہ ارکان پارلیمنٹ کو سمجھایا گیا کہ یہ اقدام ہندوستانی عوام و خواص پر شہنشاہ معظم کا رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور دہلی دربار کے تخت سے قدیم ہندوستان کی شاہی روایت کے عین مطابق شہنشاہ معظم کی زبان سے اس کا اعلان کرانا مقصود ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ مذکورہ اعلان پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے سے قبل اس پر شہنشاہ کے ذاتی حکم اور اختیار کی مہر تصدیق ثبت ہو۔ اس طرح ہندوستانی عوام کے سامنے شہنشاہ برطانیہ کی بالا دستی کی کھوکھلی شاہی روایت کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ دہلی دربار کا سب سے بڑا اور تاریخی اعلان تقسیم بنگال کی منسوخی تھی۔ یعنی بنگال کے مسلمانوں کو مشرقی بنگال کے الگ صوبے کے قیام سے جو سیاسی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوئے تھے، وہ اس اعلان کے ذریعے منسوخ کر دیئے گئے۔

"دلی والے" سیمی نار

دلی اردو اکیڈیمی کی طرف سے "دلی والے" کے عنوان سے سیمینار کا افتتاحی اجلاس تھا۔ مذاکرے کا اہتمام غالب اکیڈیمی میں کیا گیا تھا اور اس میں دہلی کے ان مشاہیر اہل قلم اور اہل علم کے بارے میں سوانحی خاکے پڑھے جانے والے تھے، جنہوں نے دلی کو مستقل طور پر اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اس کے لیے دلی کا خاص باشندہ ہونا ضروری نہ تھا، البتہ جنہوں نے دلی میں رہ کر زندگی کے مختلف شعبہ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ ان میں ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، سیاست داں بھی تھے اور سماجی اور مذہبی مصلح بھی۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا سیمینار تھا۔ اس سے قبل اس موضوع پر آج تک کوئی مذاکرہ نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں افتتاحی اجلاس کا وقت قریب آرہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور سیمینار سے خطاب کرنے کے تصور ہی سے ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ بالآخر سیمینار کا وقت قریب آ گیا۔ شارب ردولوی انتظامات کی نگرانی کے لیے صبح سے ہی غالب اکیڈیمی روانہ ہو گئے۔ وہ اکیڈیمی کے کارپردازوں میں سے تھے۔ اس لیے ان کا صبح سے وہاں رہنا ضروری تھا۔ طے پایا کہ میں، شمیم بھابی اور ان کی بیٹی شعاع کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سماعت گاہ روانہ ہو جاؤں گا۔

دوپہر تین بجے میں، شمیم (نکہت) بھابی اور ان کی بیٹی شعاع سیمینار میں جانے کے لیے رکشا پر روانہ ہو گئے اور رکشا نہایت برق رفتاری سے راستہ طے کرتی ہوئی بستی نظام الدین کی جانب روانہ ہوئی۔ ماڈل ٹاؤن سے بستی نظام الدین کا اچھا خاصا فاصلہ ہے، لیکن دہلی میں گاڑیاں اتنی تیز رفتاری سے چلتی ہیں کہ فاصلے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ ٹریفک کا عمدہ نظام ہے۔ دہلی میں کسی جگہ ٹریفک جام نہیں ہوتا اور جابجا فلائی اوور ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی رفتار سست کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دس بیس میل کا فاصلہ چند منٹوں میں طے ہو جاتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے

کہ اتنی تیز رفتاری کے باوجود حادثات رونما نہیں ہوتے۔ بسیں مقررہ مقامات پر رکتی اور روانہ ہوتی ہیں۔ مسافر بھی مقررہ مقامات سے چڑھتے اور اترتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ دہلی میں کراچی کی بہ نسبت ٹیکسیاں بہت کم ہیں۔ ٹیکسیاں عام طور پر ریلوے اسٹیشنوں، ہوائی اڈوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں کے گرد و نواح میں مل جاتی ہیں، لیکن عام شاہراہوں پر بہت کم نظر آتی ہیں۔ لوگ اس کمی کو آٹو رکشاؤں اور بسوں سے پوری کر لیتے ہیں، خصوصاً بسوں سے۔ دہلی میں بسوں کی اتنی زیادہ تعداد ہے اور اتنے مختلف روٹس پر چلتی ہیں کہ راہ گیروں کو ٹیکسیوں اور رکشاؤں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور پھر بس کی بہ نسبت ٹیکسی اور رکشا کا کرایہ بہت زیادہ ہے اور شہر بہت بڑا ہونے کے باعث ٹیکسیوں اور رکشاؤں کا کرایہ بھی بہت زیادہ اٹھتا ہے۔ اس لئے عام لوگ بسوں پر ہی سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں جب تک دہلی میں رہا، پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتا رہا اور کبھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ دہلی میں تمام بسیں سرکاری تحویل میں ہیں لیکن ان کی شکل و صورت اور صفائی ستھرائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان پر سرکاری بس ہونے کا قطعی گمان نہیں ہوتا، جب کہ ہمارے ہاں نئی سے نئی غیر ملکی بسیں بھی چند دنوں میں اپنے "سرکاری" اور "عوامی" ہونے کا ثبوت مہیا کرنے لگتی ہیں اور سیاسی اور مذہبی جماعتیں اور طلباء تنظیمیں ان پر اس قدر نعرے لکھتی ہیں کہ ان پر بس کے بجائے سائن بورڈ ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دلی کی بسیں بہت لمبی اور تیز رفتار ہوتی ہیں۔ بس کے کرائے کے لیے نہ کنڈکٹر سے تو تو میں میں ہوتی ہے اور نہ بسیں اسٹاپ پر غیر ضروری طور پر کھڑی رہتی ہیں۔ جو ہمارے ہاں کا معمول ہے۔ ہندوستان اپنی تمام ٹرانسپورٹ گاڑیاں خود بناتا ہے۔ غیر ملکی گاڑیوں کی در آمد قطعی بند ہے۔ دہلی کی سرکاری بسوں میں جو ایک نئی بات نظر آئی وہ یہ کہ اس میں کنڈکٹر بس کے پچھلے حصے میں اپنی نشست پر بیٹھا رہتا ہے۔ مسافر بسوں پر سوار ہونے کے بعد بس کے اندر قطار باندھ کر ٹکٹ خریدتے ہیں، جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کی نشستیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں۔ عورتوں کی نشستیں خالی ہونے کی صورت میں مرد حضرات ان پر بیٹھ جاتے ہیں لیکن عورتوں کو دیکھتے ہی بغیر کہے نشستیں خالی کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے مردوں کی طرح بسوں میں عورتوں کی نشستوں پر قابض نہیں رہتے اور عورتوں کی نشستیں خالی کرنے کے لیے کہنے پر لڑنے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے حالانکہ ہمارا ملک اسلامی ہے۔ ہمارے ہاں اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا ہے، جن میں عورتوں کو بڑا بلند درجہ دیا گیا ہے، لیکن ہمارے مرد بسوں میں عورتوں کو ان کی نشستیں دینے کے لیے

آمادہ نظر نہیں آتے۔ میں نے دلی میں بسوں میں عورتوں اور مردوں کو شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے، لیکن کسی عورت کو دھکا مارتے یا ان سے بد تمیزی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مجھے دہلی کے ادیبوں کی ایک بات بہت پسند آئی اور وہ یہ کہ ان کی اکثریت بلا تکلف بسوں میں سفر کرتی ہے اور ہم جیسے پاکستانی مہمانوں کو بھی بسوں میں لے کر سفر کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتی، جبکہ ہم پاکستانی کسی ہندوستانی ادیب و شاعر کے آنے پر ٹیکسی اور پرائیویٹ کار سے کم باتیں نہیں کرتے۔ اس کی وجہ ہماری پر تصنع زندگی اور ان کی سادگی پسندی کا فرق ہے۔ دہلی میں بہت کم ایسے ادیب ہیں جن کے پاس نجی کاریں ہیں۔ زیادہ تر ادبا رکشا اور بس میں سفر کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے۔

دلی کی شاہراہوں پر ہر طرف ہندی ہی ہندی نظر آئی۔ سڑکوں اور شاہراہوں کے نام ہوں یا دکانوں، مکانوں اور سینما گھروں کے نام۔ ہر نام ہندی میں لکھا ہوا تھا البتہ بعض شاہراہوں میں ہندی اور انگریزی کے ساتھ خفی حروف میں اردو میں بھی نام نظر آ جاتا ہے۔ لیکن بہت کم مقامات پر۔ میرے ذہن میں معاً کراچی کا طارق روڈ اور کلفٹن ابھرا، جہاں بمشکل اردو کا کوئی سائن بورڈ نظر آتا ہے۔ ہر طرف انگریزی ہی انگریزی کا راج ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے طارق روڈ اور کلفٹن پاکستان میں نہیں، برطانیہ یا امریکہ میں واقع ہوں۔ ہمارے ہاں اب تک قومی تشخص کا احساس پیدا نہیں ہوا، حالانکہ اس بارے میں کتنے سیمینار اور کتنے مذاکرے ہو چکے ہیں، لیکن ہمارے قومی رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پاکستانی قومیت کا احساس نہ پیدا ہونے کی وجہ سے ہی آج تک اردو کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو ہندوستان میں ہندی کو حاصل ہو چکا ہے۔

اچانک میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا، "اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اور پاکستان معرض وجود میں نہ آتا تو کیا یہاں صورتحال یہی ہوتی؟ یا ہندی کے شانہ بہ شانہ اردو کو بھی مساوی درجہ حاصل ہو جاتا؟ شاید ایسا نہیں ہوتا یا شاید ایسا ہوتا! اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ سہی، لیکن کیا ملک کی تقسیم کی ایک بڑی وجہ اردو نہیں تھی؟" میرا ذہن الجھ کر رہ گیا اور میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ ذہن خیالات کے بہاؤ میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ رکشا کے رکتے ہی میرے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ شمیم بھابی نے اس دوران کیا کچھ کہا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

رکشا بستی حضرت نظام الدین کے قریب رک گئی اور ہم تینوں تیزی سے راستہ طے کر کے سماعت گاہ میں پہنچ گئے۔ بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکیڈیمی کا آڈیٹوریم حاضرین سے بھرا

ہوا تھا۔ میرے پہنچتے ہی سیمینار کے ڈائریکٹر صلاح الدین نے (جو نظامت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے) نام پکارنا شروع کر دیا۔ بزرگ شاعر گلزار دہلوی صدارت کے لیے بلائے گئے۔ اس کے بعد ناچیز کو مہمان خصوصی کا اعزاز بخشا گیا۔ پھر انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری، مشہور ناقد اور محقق خلیق انجم بلائے گئے۔ اس کے بعد اردو کے معروف اور بزرگ شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر تشریف لائے، پھر دہلی کی معروف شخصیت انور دہلوی آئے اور آخر میں ماہنامہ "بیسویں صدی" کے مالک اور مدیر رحمن نیر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نشستیں پر ہو گئیں۔

سیمینار کے پہلے دن زیادہ تر رسمی تقریریں ہوئیں اور ڈائرکٹر سیمینار ڈاکٹر صلاح الدین اور سیکرٹری سید شریف الحسن نقوی نے اردو اکادمی کے اغراض و مقاصد اور خدمات اور "دلی والے" کے عنوان سے منعقدہ اس سیمینار کی نوعیت پر روشنی ڈالی۔

اردو اکادمی دلی، ایک بہت ہی فعال ادبی ادارہ ہے، جس نے 1981ء میں اپنے قیام کے بعد سے اردو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کارناموں میں مذاکرات کا خاص حصہ ہے اور اب اس مذاکرے نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔ میری آمد سے چند روز قبل اس کی جانب سے اردو افسانے پر ایک ورک شاپ منعقد ہوا تھا جس کے ڈائریکٹر گوپی چند نارنگ تھے اور جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے افسانہ نگاروں اور ناقدوں نے حصہ لیا تھا اور جمیل الدین عالی اور کشور ناہید وغیرہ نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ اردو اکادمی کا قیام دہلی کے اردو خواں طبقے کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی کے ایماء پر عمل میں آیا تھا۔ اس کا ایک باضابطہ آئین ہے، جس کی رو سے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر اس کے مستقل صدر ہوتے ہیں اور اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کیا جاتا ہے۔ اکادمی کی سرگرمیوں کو روبہ عمل لانے کے لیے تین ذیلی کمیٹیاں ہیں، جن کے نام پروگرام کمیٹی، ایوارڈ کمیٹی اور تعلیمی کمیٹی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے کنوینر اور رکن، نامزد اراکین میں سے ہی مقرر کئے جاتے ہیں۔ اردو اکادمی نے تعلیمی میدان میں اردو کی نشر و اشاعت کے ضمن میں کیا کارنامہ انجام دیا۔ اس کا تو علم نہیں ہے، البتہ اس نے ادیبوں کو انعامات دینے اور سیمینار منعقد کرنے کے سلسلے میں کافی سرگرمیاں دکھائی ہیں۔

صدارتی کلمات سے قبل خاکسار کو اپنا مضمون پڑھنا پڑا اور میں زندگی میں پہلی بار اتنے بڑے اجتماع سے مخاطب ہوا۔ خلیق انجم کو اندیشہ تھا کہ میں مائک کے سامنے شاید بول نہ سکوں گا اور خواہ مخواہ میری رسوائی ہو گی چنانچہ انہوں نے ڈائریکٹر سیمینار ڈاکٹر صلاح الدین کو کئی بار اشارے کئے تاکہ وہ مجھے

تقریر کرنے کی زحمت نہ دیں لیکن انہوں نے مائیک پر میرا نام پکار ہی لیا اور مجھے مجبور آرڈسٹرم پر جانا پڑا۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مضمون پڑھتے وقت نہ دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں۔ نہ پسینہ آیا اور نہ زبان میں لکنت ہوئی۔ مجھ میں نہ جانے کہاں سے خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور میں دھیمی آواز میں رک رک کر نہایت اطمینان سے اپنا مضمون پڑھتا گیا۔ میں نے اس درمیان نہ سامعین کی طرف دیکھا اور نہ صاحب صدر کی جانب اور نہایت کامیابی کے ساتھ مضمون پڑھ کر اپنی نشست پر واپس آگیا۔ مجھے اپنی کارکردگی پر خود بھی حیرت ہوئی۔

صدر جلسہ خار دہلوی بڑی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ سرخ و دمکتا ہوا چہرہ، سر کے بال روئی کے گالے کی طرح بالکل سفید، اس پر سفید چوڑی دار پائجامے اور سفید شیروانی میں وہ بہت ہی سج رہے تھے اور صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب کے آخری نمائندہ لگ رہے تھے۔ ان کی تقریر درحقیقت قدیم دہلی کی تہذیبی تاریخ تھی۔ وہ دہلی، جب داغ، سائل اور ان کے والد بزرگوار زار دہلوی زندہ تھے۔ وہ دہلی، جو اب خواب و خیال ہو چکی ہے۔ جس کی قدیم تہذیب مٹ چکی ہے، جو اب صرف بزرگوں کی یادداشتوں میں محفوظ ہے یا پھر تاریخ کے صفحات پر، لیکن خار دہلوی کی تقریر میں ان کے زمانے کی دلی ایک بار پھر زندہ ہو کر سامنے آگئی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ کس طرح وہ اپنے والد محترم زار دہلوی کے ساتھ سائل دہلوی کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور وہاں بلا تکلف کھایا پیا کرتے تھے اور اس دور کی دلی کی تہذیب اور آداب محفل کیا تھے اور کس طرح مشاعرے کی محفلیں سجتی تھیں۔ دبستان دہلی کی شعری روایت کے آخری امین خار دہلوی سے مل کر اور ان کی تقریر سن کر میں خود کو واقعی خوش نصیب سمجھنے لگا کہ دلی کی قدیم تہذیب اور روایت کی اس زندہ و جاوید تصویر کو کم از کم اپنی نظروں سے دیکھ سکا، جنہیں میرے بعد آنے والی نسلیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔ خار دہلوی بڑے اہتمام کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں قطعی منفرد انداز میں شعر سناتے ہیں۔ وہ حال ہی میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور اب اردو کو سینے سے لگائے زندہ ہیں، لیکن ان کے بعد آنے والی نسل اردو سے نابلد ہے۔ کائستھوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ محفوظ رہے گی، لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب کائستھ تو کیا خود ہندوستانی مسلمان بھی اردو سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کم از کم دہلی اور اتر پردیش کی حد تک مسلمانوں کی نئی پود اردو رسم الخط سے بالکل نابلد ہو چکی ہے۔ اردو زبان کی معاشی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے اسے نہ مسلمان پڑھ رہے ہیں اور نہ ہندو۔ لاتعداد اردو اکادمیوں اور اردو ترقی بورڈ کے ایک کروڑ روپے کے

سالانہ بجٹ کے باوجود ان علاقوں میں اردو زبان اور رسم الخط کا چلن روک دیا گیا ہے۔ صرف چالیس سال سے اوپر کی نسل اردو کے نام پر رقص کر رہی ہے اور اس نے اردو کو اپنا ذریعہ شہرت اور بعض نے ذریعہ معاش بنا رکھا ہے ورنہ اردو کے مسلمان اور ہندو ادیبوں کے بچے بھی اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں (کیا یہ اردو کا المیہ نہیں ہے؟)

خار دہلوی سے مل کر اور ان سے باتیں کر کے قطعی احساس نہیں ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ ان کی زبان، ان کے لباس، ان کی شکل وصورت اور نشست و برخاست کے انداز سے اس بارے میں قطعی گمان نہیں ہوا۔ یہ تو سائل دہلوی کے بارے میں ان کے خاکے سے معلوم ہوا کہ ان کا اہل ہنود سے تعلق ہے ورنہ میں تو انہیں اپنی طرح کا نسلی مسلمان سمجھ رہا تھا۔ یہ جان کر مزید حیرت ہوئی کہ آج بھی ایسے برگزیدہ بزرگ موجود ہیں۔

افتتاحی اجلاس کے بعد "شام غزل" منعقد ہوئی، جس میں استاد حفیظ احمد خاں، استاد جاوید احمد خاں اور دیگر کئی فن کاروں نے غزلیں سنائیں، جن میں غیر اردو داں لڑکیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ "شام غزل" ان معنوں میں بڑی اہمیت کی حامل نظر آئی کہ اس میں غیر اردو داں فن کاروں نے نہایت شستہ لب ولہجے میں عمدہ غزلیں سنائیں اور یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ ان میں سے کسی کا بھی تلفظ غلط نہیں تھا۔ ایک جانب اردو زبان اور رسم الخط سے یہ غیریت اور دوسری جانب صنف غزل خصوصاً غزل کی گائیکی سے یہ رغبت حیران کن تھی۔ حسن نعیم مرحوم نے اپنے دورہ پاکستان میں یہ تو بتایا تھا کہ ہندوستان میں غزل کی گائیکی بہت مقبول ہے، جس کے باعث غزل گانے والے فن کاروں کا ایک بڑا طبقہ کمرشل سطح پر وجود میں آ چکا ہے، جس میں غیر اردو داں فن کاروں کی کثیر تعداد ہے، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ غزل واقعی گائیکی کے طور پر ہندوستان کے عوام الناس میں بھی اس قدر مقبول ہے۔ اس محفل میں پاکستانی گلوکار سلیم رضا کی آمد متوقع تھی لیکن وہ بعض وجوہ کی بنا پر نہ پہنچ سکے۔ ان کے بغیر بھی شام غزل بہت کامیاب رہی اور سامعین نے فن کاروں پر دل کھول کر داد وتحسین کے ڈونگرے برسائے۔

اس روز سیمینار میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر صغریٰ مہدی اور جوگندر پال وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی سے میں پہلے ہی پاکستان میں "نیاز و نگار سیمینار" میں مل چکا تھا اور ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوا تھا، خصوصاً قدیم ہندی اور سنسکرت ادب کے بارے میں ان کے مطالعے اور گہری نظر سے، چنانچہ یہاں بھی علیک سلیک کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ میرے

ہندوستان کے دورے کا ایک مقصد راجندر سنگھ بیدی کی حیات اور فن کے بارے میں مواد فراہم کرنا ہے۔انہوں نے کمال صاف گوئی سے کہا، "میں اس ضمن میں آپ کے کسی کام نہیں آؤں گا۔ آپ اس بارے میں گوپی چند نارنگ اور قمر رئیس سے رجوع کیجیے، جنہوں نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔"

ڈاکٹر تنویر احمد علوی مظفر پور، ضلع کیرانہ کے رہنے والے ہیں اور گذشتہ پچیس سال سے دلی کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ ان کا شمار دیوبند کے ممتاز طلبا میں ہوتا ہے۔ یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ طبیب اور ماہر جراحت بھی ہیں۔ انہوں نے طبیہ کالج پٹیالہ سے ماہر طب و جراحت کی سند اور سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا ہے۔ انہوں نے بی۔اے میں اڈوانس انگلش لی تھی اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے "ذوق۔ سوانح اور انتقاد" کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کیا اور دہلی کالج میں شعبہ اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ 1970ء میں کلیات ذوق کی تحقیق اور تدوین پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انہیں ڈی۔لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ جامعہ ملیہ میں شعبہ اردو کا باقاعدہ قیام انہی کی نگرانی میں عمل میں آیا۔ وہ ان دنوں اردو ہندی لغت کی ترتیب کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کے ذمے "ہندی فارسی لغت" کا کام بھی تھا وہ تیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اصولیات تحقیق پر ان کی کتاب "اصول، تحقیق و ترتیب متن" بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا مختلف موضوعات پر گہرا مطالعہ ہے، جن میں تاریخ، تصوف، اردو میں عوامی شعر و ادب اور تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ان کا شعری مجموعہ "لمحوں کی خوشبو" شائع ہو چکا ہے۔

ظہیر احمد صدیقی بڑے تپاک سے ملے۔ مزید ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں اور بہت محبت اور خلوص سے ملتے ہیں۔ ان سے بھی ایک دفعہ پاکستان میں ماہنامہ "افکار" کے دفتر میں مل چکا تھا۔ دہلی میں ملاقات ہونے پر انہوں نے اپنے والد ضیاء احمد بدایونی کی انگریزی کتاب عنایت کی۔ وہ پہلے دلی کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے۔ آج کل دلی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں، لیکن ان کا اصل میدان تنقید و تحقیق ہے۔ اس میدان میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے اور مومن اور فانی پر قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کے والد ضیاء احمد بدایونی نامور محقق اور نقاد گزرے ہیں۔ وہ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی کافی جانے پہچانے جاتے ہیں۔

غالب اکیڈیمی کی سماعت گاہ میں صغریٰ مہدی سے عجیب و غریب انداز میں ملاقات ہوئی۔ میں ان کا

سفر نامہ پڑھ چکا تھا اور ان کے طرز نگارش سے بہت متاثر تھا۔ اس لیے ان سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ لیکن میں نے نہ انہیں کبھی دیکھا تھا اور نہ ان کی تصویر دیکھی تھی۔ مجھے اچانک معلوم ہوا کہ صغریٰ مہدی میرے عقب کی نشست پر بیٹھی ہوئی ہیں چنانچہ میں نے ایک خاتون سے جا کر گفتگو شروع کر دی اور "کتاب نما" میں شائع ہونے والے ان کے سفر نامے کی تعریف شروع کر دی۔ وہ خاتون خاموشی سے میری باتیں سنتی رہیں اور جب میری بات ختم ہو گئی تو انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا، "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں صغریٰ مہدی نہیں ہوں۔ صغریٰ میرے پیچھے بیٹھی ہوئی ہیں۔"

مجھے اپنی عجلت اور غلطی پر بڑی ندامت ہوئی اور میں ان سے معذرت کر کے اصل صغریٰ مہدی کی طرف بڑھا اور انہیں جب اپنی غلطی کے بارے میں بتایا تو وہ خوب ہنسیں اور مجھ سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔

صغریٰ مہدی میرے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ میں نے "کتاب نما" میں ان کا امریکہ کا قسط وار سفر نامہ تو پڑھا تھا، لیکن ان کی دیگر تخلیقات کے مطالعے سے محروم تھا۔ "کتاب نما" میں ان کی کتابوں کا اشتہار نظر سے گزر چکا تھا، لیکن ان کتابوں کی ادبی قدر و قیمت اور اہمیت سے واقف نہیں تھا، لیکن سفر نامہ پڑھ کر، خصوصاً ان کی رواں دواں اور نہایت شگفتہ نثر پڑھ کر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ان میں لکھنے کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ اس کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب میں نے ان کے افسانوں اور ناولوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اس وقت ان سے صرف علیک سلیک ہوئی اور ان سے ان کی رہائش گاہ کا پتہ لے کر آئندہ ملنے کے وعدے پر رخصت ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں دہلی پہنچتے ہی سب سے پہلے جن لوگوں سے رابطہ قائم ہوا۔ وہ شمس الزماں اور جوگندر پال تھے۔ جوگندر پال ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں، جن سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی پر کشش اور دل نواز شخصیت ہے۔ جوگندر پال جتنے مقبول اور مشہور ہیں اس کے پیش نظر انہیں مغرور اور لیے دیئے رہنے کا عادی ہونا چاہیئے تھا، لیکن ان میں اتنی انکساری اور خلوص ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ نئے اور جونئیر ادیبوں سے ان کی بے پناہ محبت دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ ان سے کراچی میں عجیب و غریب انداز میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی اہلیہ کرشنا پال کے ساتھ صرف تین روز کے لیے کراچی آئے ہوئے تھے اور صہبا لکھنوی کے ہاں مقیم تھے۔ ان کا پہلے سے تمام پروگرام طے تھا۔ نہ انہیں صبح کے وقت فرصت تھی، نہ دوپہر کو اور نہ رات کے وقت، چنانچہ جوگندر پال نے مشورہ دیا، "میں رات کے کھانے کے بعد دس ساڑھے دس بجے

ٹل صہبا کے گھر واپس آجاؤں گا اگر آپ لوگ مجھے اس وقت اغوا کرلیں تو میں آپ لوگوں کے ساتھ
رات بھر گفتگو کر سکتا ہوں۔ دوسرے روز صبح دس بجے کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔"

ان کی تجویز کے مطابق فکشن گروپ کے ارکان علی حیدر ملک، اے۔ خیام، صبا اکرام، ممتاز احمد
ٹان، رحمن شریف اور میں نے پروگرام مرتب کر لیا اور خیام کی کار پر ٹھیک رات دس بجے صہبا
للمنوی کے گھر پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ پال جی ابھی تک انجم اعظمی کے ہاں سے واپس نہیں آئے ہیں۔
ہ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے آئے۔ ہم لوگ فوراً انہیں کار پر لے کر روانہ ہو گئے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کون
ا ہوٹل ہے جو رات بھر کھلا رہتا ہے۔ خیام نے بتایا کہ صرف کراچی ایئرپورٹ میں "اسکائی روم" ہی
امد ریستوراں ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا، چنانچہ ہم سب پال جی کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ میرے پاس
یپ ریکارڈر اور رحمن شریف کے پاس کیمرہ تھا، چنانچہ ہم لوگ پال جی کے ساتھ رات بارہ بجے سے
ُ پانچ بجے تک مسلسل گفتگو کرتے رہے۔ ان کی نجی اور ادبی زندگی، ان کے فن، ان کے نظریے،
یدافسانے کے مختلف مسائل اور ادب کے مختلف رجحانات اور میلانات کے بارے میں ان سے
ٹیں ہوتی رہیں۔ یہ گفتگو باقاعدہ ٹیپ کی گئی، جو بعد میں اخبار "جسارت" کے ادبی ایڈیشن میں شائع
ائی۔ ٹھیک چھ بجے صبح ہم لوگوں نے انہیں صہبا لکھنوی کے گھر پر پہنچا دیا اور ان سے رخصت
ئے۔ جوگندر پال ہم لوگوں کی اس یادگار ملاقات سے بہت متاثر ہوئے اور وہ جب بھی پاکستان کے
رے پر آئے۔ ہم لوگوں سے ضرور ملاقات کی، چنانچہ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں دہلی آیا ہوا ہوں تو
اری نہ ہونے اور ماڈل ٹاؤن سے بہت دور گریٹر کیلاش میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود انہوں
نے مجھ سے فون پر رابطہ قائم کیا اور مجھ سے ملنے کے لیے خاص طور پر سیمینار میں آئے۔ جوگندر پال نے
بنار کے پہلے ہی دن مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں سیمینار ختم ہونے کے بعد شارب ردولوی کے ہاں
ان کے گھر منتقل ہو جاؤں گا۔ سیمینار میں ان سے زیادہ باتیں تو نہیں ہوئیں البتہ ان کے گھر منتقل
نے کے بعد ان سے جی بھر کر گفتگو ہوئی۔

شمس الرحمن فاروقی

دہلی پہنچنے کے بعد میں جن لوگوں سے ملنے کا متمنی تھا ان میں شمس الرحمن فاروقی بھی شامل تھے، چنانچہ میں نے شارب ردولوی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے فوراً ٹیلی فون پر شمس الرحمن فاروقی سے میری بات کروادی۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے فوراً گھر پر بلا لیا۔ طے پایا کہ میں سیمینار کے دوسرے روز شارب ردولوی کے ساتھ وہاں سے نکل کر شام کو ان کے کاکا نگر والے گھر میں پہنچ جاؤں گا۔ شارب ان کی رہائش گاہ سے واقف تھے۔ اس لیے ان کے مکان تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

شمس الرحمن فاروقی آزادی کے بعد منظر عام پر آنے والے اردو کے اہم ناقدین میں سے ہیں۔ وہ اردو تنقید میں طوفان کی طرح آئے اور ابر کی طرح چھا گئے اور بوسیدہ روایتوں کے بہت سارے کمزور اور لڑکھڑاتے ہوئے پیڑوں کو اکھاڑ پھینکا اور شہرت اور مذمت کے درمیان اپنی کامیابی کا جھنڈا گاڑ دیا۔ شاید شمس الرحمن فاروقی جیسے لوگوں کے لیے ہی کہا گیا ہے کہ "وہ آیا، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔" شمس الرحمن فاروقی نے اپنی ہنگامہ آرائیوں، اپنے تہلکہ خیز مقالوں، اشتعال انگیز تبصروں اور اپنے جریدے "شب خون" کے ذریعے چند برسوں میں جس طرح برصغیر ہند اور پاکستان کے ادبی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی، اس کی اردو ادب میں بہت کم مثال ملتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اپنی شخصیت کے اثبات کے لیے دوسروں کی نفی کا راستہ اختیار کیا اور اردو ادب میں بت شکنی کا بیڑا اٹھا لیا اور شاید نئی نسل کو اپنی شناخت منوانے کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی تھا، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے جس سے ٹکر لی وہ ترقی پسند ادیب تھے۔ یہ 1960ء کی دہائی کا واقعہ ہے کہ اچانک اردو ادب میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا اور نئی نسل کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کے خلاف جدیدیت کی حمایت میں مہم شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند ادیبوں کی انتہا

پسندی، حد سے زیادہ مقصدیت اور سیاست زدگی اور اسی کے ساتھ نعرے بازی اور سطحیت نے ادبی حلقوں میں پہلے ہی کافی حد تک بے اطمینانی پیدا کر رکھی تھی۔ دوسری جانب عالمی اشتراکی تحریک کی قیادت کے سوال پر روس اور چین کے نظریاتی اختلافات اور اسٹالن کے دور حکومت کے مظالم کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات نے بہت سے ترقی پسندوں کے عقائد کو متزلزل، بلکہ منہدم کر کے رکھ دیا تھا چنانچہ نئی نسل ترقی پسند ادیبوں سے بدظن ہو گئی اور اس نے اس کے رد عمل میں قطعی مختلف اور انتہاپسندانہ رویہ اختیار کیا اور ادب کی مقصدیت اور اس کے معاشرتی کردار ہی سے انکار کر دیا اور صرف جمالیاتی قدروں کو شعر و ادب کو پرکھنے کا واحد معیار قرار دیا۔ جن ادیبوں اور ناقدوں نے اس رجحان کی بڑھ چڑھ کر وکالت بلکہ قیادت کی ان میں شمس الرحمن فاروقی کا نام سرفہرست ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا تھا اور جدید انگریزی اور امریکی ادب، خصوصاً امریکہ کی نئی تنقید سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اس لیے وہ خم ٹھونک کر ترقی پسندوں کے مقابلے میں آ گئے۔ اس سے قبل کسی نے ترقی پسند ادیبوں، خصوصاً سکہ بند ترقی پسندوں کو اس انداز سے چیلنج نہیں کیا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے اردو ادب میں تہلکہ مچ گیا۔ ہر جانب سے ان کی مذمت میں مضامین لکھے جانے لگے۔ انہیں سامراجیوں کا ایجنٹ کہا گیا اور ترقی پسندوں نے "شب خون" کے جواب میں "سب رنگ" شائع کیا، لیکن نئی نسل کی بغاوت بڑھتی گئی۔

شمس الرحمن فاروقی کے ہاتھ میں چونکہ ایک رسالہ بھی تھا اس لیے انہوں نے اپنے ارد گرد نئے اور نوخیز ادیبوں کا حلقہ بنا لیا، جن کی کچی پکی اور اچھی بری اور ادھ کچری تحریریں "شب خون" میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔ چند ہی دنوں میں ترقی پسندی سے منحرف ادبا مثلاً آل احمد سرور، خلیل الرحمن اعظمی، باقر مہدی اور وارث علوی وغیرہ "شب خون" میں لکھنے اور ترقی پسندوں پر گولہ باری کرنے لگے، جس سے شمس الرحمن فاروقی کے گروہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اس اثنا میں انہوں نے "نئے نام" کے نام سے نئی نسل کے شاعروں کا ایک انتخاب شائع کیا جن میں ان شعراء کو پیش کیا گیا جو بالکل نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس انتخاب میں شمس الرحمن فاروقی کا ایک ایسا متنازعہ فی دیباچہ شائع ہوا جو بہت عرصے تک ادبی حلقوں میں تنازع کا باعث بنا رہا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے شعر و ادب کی فنی قدروں کے تعین کے سلسلے میں کوئی نئی بات نہیں کہی تھی جو اس سے قبل محمد حسن عسکری نے نہ کہی ہو، البتہ ان کی اصطلاحات مختلف تھیں۔ فرق یہ تھا کہ محمد حسن عسکری کے لکھنے کا زمانہ (میری مراد ان کے ادبی کیریئر کے ابتدائی دور سے ہے) ترقی پسند ادبی تحریک کے

عروج کا زمانہ تھا اور شمس الرحمن فاروقی کے لکھنے کا زمانہ، ترقی پسند ادبی تحریک کے زوال کا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے جدیدیت کے نام سے اپنے رسالہ "شب خون" کے ذریعے نئے ادیبوں کو اس قدر نہیں بنایا، جتنا انہیں بگاڑا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو ادب کی دنیا میں کہنیاں مارتے اور بڑے اور ثقہ ادیبوں کو دھکے دیتے ہوئے آگے نکل گئے، البتہ ان کے پیروکار راستے پیچھے رہ گئے کہ اب ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے متنازعہ فیہ شخص سے ملنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی، چنانچہ میں سیمینار سے فارغ ہوتے ہیں شارب ردولوی کو لے کر شمس الرحمن فاروقی کے گھر روانہ ہو گیا۔

شمس الرحمن فاروقی میری توقع سے بہت کم عمر نکلے۔ ان کے بھاری بھاری مضامین پڑھ کر ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے اور نانا ابا اور دادا ابا بن چکے ہوں گے، لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ یوں تو وہ نانا ابا بن چکے تھے لیکن ان کی عمر اتنی نہیں تھی۔ جتنی عام طور پر نانا اباؤں کی ہوتی ہے۔ وہ مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے گھر پہنچے اور آتے ہیں دریافت کیا، "قمر احسن نہیں پہنچے؟ میں نے انہیں پانچ بجے پہنچ جانے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ آپ لوگوں کو انٹرٹین کرے۔ بہرحال، معذرت خواہ ہوں کہ دفتر میں ایک کام نکل آنے کی وجہ سے فارغ ہونے میں بہت دیر ہو گئی۔"

میں نے انہیں بتایا کہ "آپ جب کراچی آئے تھے، میں اسلام آباد میں تھا۔ اس لیے ملاقات نہیں ہوئی آپ سے ملنے اور آپ سے باتیں کرنے کا بڑا اشتیاق تھا، اس لیے دہلی پہنچتے ہی ملنے کے لیے حاضر ہوا ہوں"۔

اسی کے ساتھ میں اپنا ٹیپ ریکارڈر درست کرنے لگا تاکہ ان سے جو ادبی گفتگو ہو، اسے ٹیپ کر لوں۔

میں نے انہیں بتایا، "آپ کے چچا زاد بھائی ریحان صدیقی میرے بڑے اچھے دوست ہیں اور آپ کے چچا رضوان اللہ بھی میرے رفیق کار رہ چکے ہیں۔ ہم دونوں نے عرصے تک "عصر جدید" (کلکتہ) میں ایک ساتھ کام کیا ہے۔"

یہ جان کر وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے فوراً رضوان اللہ بھائی کو فون کے ذریعے میری آمد کی اطلاع دے دی۔ رضوان اللہ بھائی سے ٹھیک اکیس سال کے بعد فون پر گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو میں وہی محبت بھرا انداز اور وہی والہانہ پن موجود تھا، جو ان کا خاصہ تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اڑ کر ماضی میں پہنچ گیا ہوں اور ہم دونوں 1962 ء میں "عصر جدید" کے دفتر میں ایک ساتھ نیوز ڈیسک پر بیٹھے کام کر

رہے ہیں۔ وہ خبر رساں ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے ذریعے بھیجی ہوئی خبروں کا ترجمہ کر رہے ہیں اور میں اسپورٹس رپورٹر کے طور پر محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے آئی۔ایف۔اے شیلڈ کے فائنل میچ کی رپورٹ لکھ رہا ہوں۔

وقت کی رفتار کتنی تیز ہوتی ہے! دیکھتے ہی دیکھتے دو جگ بیت گئے اور ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ کل کی بات ہے۔ رضوان اللہ بھائی مجھے دوسرے روز دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رہے ہیں۔ میں دعوت قبول کر رہا ہوں، لیکن ساتھ ہی ان کی رہائش گاہ تک پہنچنے سے معذوری ظاہر کر رہا ہوں، کیوں کہ میں شہر میں اجنبی ہوں اور دہلی کے راستوں سے ناواقف۔ وہ فون پر شمس الرحمن فاروقی کو کچھ ہدایت دے رہے ہیں۔ فاروقی ایک سعادت مند بھتیجے کی طرح "جی جی" کر رہے ہیں۔ پھر رسیور میرے حوالے کر رہے ہیں۔ رضوان اللہ بھائی کہہ رہے ہیں، "شمس الرحمن، کل آپ کو غالب اکیڈیمی سے پک اپ کر کے میرے گھر پہنچا دیں گے اور پھر میرے گھر سے آپ کو واپسی میں غالب اکیڈیمی میں چھوڑ دیں گے۔ آپ کل دوپہر کے کھانے پر ضرور آئیے گا۔ بھولیے گا نہیں۔"

میں بھلا رضوان اللہ بھائی کی دعوت کیوں کر بھول سکتا تھا۔ ان سے اکیس سال کے بعد ملنے کا موقع ملا تھا، چنانچہ شمس الرحمن فاروقی سے طے پایا کہ وہ ٹھیک بارہ بجے دوپہر غالب اکیڈیمی پہنچ جائیں گے اور میں ان کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔

دوسرے دن 30 مارچ 85ء ہفتہ کے روز میں صبح دس بجے شارب ردولوی کے ساتھ سیمینار میں پہنچ گیا۔ اس روز پہلی نشست کے صدر آفاق حسین آفاق دہلوی اور مہمان خصوصی پاکستان کے آفاق دہلوی اور دوسرے نشست کے صدر حکیم عبدالحمید (ہمدرد دواخانہ) اور مہمان خصوصی ظہیر احمد صدیقی تھے۔ پہلی اور دوسری نشست میں جن خاکہ نگاروں نے خاکے سنائے۔ ان میں انور علی دہلوی، (سردار دیوان سنگھ مفتون) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (زار دہلوی) ڈاکٹر خلیق انجم (مولانا عبدالسلام نیازی) ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (خواجہ حسن نظامی) بیگم صالحہ عابد حسین (مختار احمد انصاری) ڈاکٹر کامل قریشی (بیخود دہلوی) رشید حسن خاں (مولانا سید احمد دہلوی) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (اندرا گاندھی) اور علامہ اخلاق دہلوی (حکیم اجمل خاں) شامل ہیں۔

اس روز ہمدرد دواخانہ (وقف) کے سربراہ حکیم عبدالحمید سے بڑے دلچسپ انداز میں ملاقات ہوئی۔ سیمینار کی پہلی نشست میں میں پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری بغل والی نشست خالی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ سفید چوڑی دار پائجامے اور سفید شیروانی میں ملبوس ایک سانولے رنگ کے

بزرگ میری بغل میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اردو اکادمی دہلی کے سیکرٹری شریف الحسن نقوی آئے اور مؤدبانہ انداز میں اکڑو بیٹھ کر ان سے سرگوشی میں باتیں کرنے لگے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی غیر معمولی ہستی ہیں۔ میں نے اپنے بغل میں بیٹھے ہوئے صاحب سے دریافت کیا "یہ کون بزرگ ہیں؟ کیا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟"۔

انہوں نے حیرت سے جواب دیا۔ "آپ انہیں نہیں پہچانتے؟ تعجب ہے! یہ ہمدرد دواخانے کے سربراہ حکیم عبدالحمید ہیں"۔

میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے شکلاً انہیں پہچان نہ سکا، لیکن میں ان کے نام اور ان کی خدمات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اتفاق سے میں بھی پاکستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن سے بحیثیت معاون ادبی وابستہ تھا اور حکیم محمد سعید کی 60 دیں سالگرہ کے موقع پر حکماً حکیم عبدالحمید صاحب کے ایک مضمون سے استفادہ کر کے اپنے حکیم محمد سعید صاحب کے بارے میں "نونہال" کے لیے ایک مضمون لکھ چکا تھا، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی بڑی شخصیت اتنی سادگی پسند بھی ہو سکتی ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن (پاکستان) کی طرح ہمدرد دواخانہ (وقف) بھی بہت بڑا تجارتی ادارہ ہے اور سالانہ کروڑوں روپے کا کاروبار کرتا ہے۔ حکومت ہند نے اس کی فلاحی سرگرمیوں کے پیش نظر بہت سے محصولات معاف کر دیئے ہیں۔ اس طرح حکیم عبدالحمید کے اس ادارے کا شمار بھی ہندوستان کے بڑے تجارتی اداروں میں ہوتا ہے، لیکن ہمدرد فاؤنڈیشن کے حکیم محمد سعید کے مقابلے میں حکیم عبدالحمید کی سادگی دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ حکیم محمد سعید کہیں آتے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ لاؤ لشکر بھی ساتھ ہوتا ہے، یعنی وڈیو اور اسٹل فوٹو گرافر، پبلک ریلیشن آفیسر سے لے کر ہمدرد کا پورا شعبہ نشر و اشاعت حرکت میں آ جاتا ہے۔ اخبارات ہیں خوب تصویریں اور خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس حکیم عبدالحمید کہیں آتے جاتے ہیں تو کسی کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی، مثلاً انہوں نے "دلی والے" سیمینار کی دوسری نشست کی صدارت کی، لیکن نہ اخبارات میں ان کی تصویر شائع ہوئی اور نہ خبر ہی۔ ایسی بات نہیں کہ ہندوستان کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں انہیں یا ان کے ادارے کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکاری اور اخباری حلقوں میں ان کا بڑا احترام تھا، لیکن حکیم عبدالحمید ذاتی شہرت اور تشہیر سے گرزاں تھے، جبکہ حکیم محمد سعید کا انحصار ہی اسی پر تھا۔

شریف الحسن نقوی کے رخصت ہوتے ہی میں نے حکیم عبدالحمید سے اپنا تعارف کراتے ہوئے

کہا، "میں آپ کے نام سے تو اچھی طرح واقف تھا، لیکن آج پہلی بار آپ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی۔" میں نے انہیں بتایا۔ "میں بھی پاکستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے شعبہ مطبوعات سے وابستہ ہوں اور ڈائریکٹر پبلیکیشنز مسعود احمد برکاتی کا اسسٹنٹ ہوں۔"

وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے اور دریافت فرمایا، "آپ پاکستان کے رہنے والے ہیں یا ہندوستان سے گئے ہیں؟" میں نے انہیں بتایا، "میں کلکتے کا رہنے والا ہوں۔ کلکتے سے مشرقی پاکستان گیا اور وہاں سے مغربی پاکستان منتقل ہو گیا۔"

پہلی نشست ختم ہونے کے بعد اکیڈمی کے بیسمینٹ میں لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا، جہاں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر محمد حسن، مجتبیٰ حسین، خلیق انجم، ظہیر احمد صدیقی اور تنویر احمد علوی سے دوبارہ ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر محمد حسن سے میرے بہت پرانے مراسم تھے۔ 1962ء میں وہ جب لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ تھے اور ایک بالکل نئے نقاد اور ڈراما نویس کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ اس وقت میں ہفت روزہ "آثار" (کلکتہ) سے وابستہ تھا اور نائب مدیر کی حیثیت سے ان سے بڑی خط و کتابت رہتی تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے "آثار" کے لیے سب سے زیادہ لکھا اور ان سے خط و کتابت کے ذریعے بنگال کے اسٹیج ڈراموں کے بارے میں سب سے زیادہ گفتگو رہی۔ اسی زمانے میں ان کا مشہور مقالہ "اردو ادب میں رومانوی تحریک" شائع ہوا اور وہ راتوں رات سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔ اس دور میں انہوں نے کئی کامیاب ڈرامے بھی لکھے اور "سوغات" (بنگلور) میں جدید اردو افسانے پر مقالہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد میں ترک وطن کر کے مشرقی پاکستان چلا آیا اور ان سے خط و کتابت قطعی بند ہو گئی۔ پھر بنگلہ دیش معرض وجود میں آ گیا اور مجھے ایک بار پھر ہجرت کر کے مغربی پاکستان آنا پڑا۔ طویل عرصہ گزر جانے کے بعد پروفیسر محمد حسن سے 1984ء میں اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ اپنی اہلیہ روشن آرا کے ساتھ پاکستان کے دورے پر آئے اور ہم دونوں دو جگ کے بعد ایک دوسرے سے ملے۔ اس کے بعد وہ جب بھی پاکستان آئے۔ ان سے ضرور ملاقات ہوئی۔ اس دفعہ بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑے جوش و خروش سے ملے اور میں نے انہیں بتایا کہ میرے دورے کا مقصد راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں مواد فراہم کرنا ہے۔ اس لیے ان سے خصوصی انٹرویو کرنے آؤں گا۔"

یہیں خواجہ احمد فاروقی سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ میں ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "میر، حیات اور شاعری" پڑھ چکا تھا۔ لیکن ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بڑے وجیہہ لگے۔ ان کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ سفید دمکتے ہوئے چہرے اور سفید سوٹ میں وہ بالکل یورپین

لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ان سے میرا تعارف کرایا اور ہم دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ہندوستان میں اردو کے پہلے پروفیسر ایمریطس ہیں۔ یہ اعزاز ان سے قبل کسی دوسرے اردو معلم یا مصنف کو حاصل نہیں ہوا۔ ان کا شمار دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے معماروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی کوششوں سے ہی شعبہ اردو یونیورسٹی کے اہم ترین شعبوں میں گنا جانے لگا۔ وہ عرصے تک ڈین آف فیکلٹی اور صدر شعبہ رہے اور کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی۔ انہیں ساہتیہ اکیڈیمی نے بھی انعام سے نوازا ہے اور وہ ہندوستان میں بہت ہی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی اور نہرو خاندان سے بہت قریب تھے اور اندرا گاندھی ان کا بڑا احترام کرتی تھیں۔

دوسرے روز سیمینار میں جن ادیبوں سے ملاقات ہوئی ان میں قمر رئیس اور مجتبیٰ حسین شامل ہیں۔ قمر رئیس سے میں 62ء سے واقف تھا۔ جب وہ علی گڑھ میں ایم اے فائنل میں تھے اور ماہنامہ "ادیب" (علی گڑھ) مرتب کر رہے تھے۔ مجھے اس دور میں "آثار" (کلکتہ) میں ان کے متعدد مضامین شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ اس دور میں وہ اگرچہ آج کی طرح اتنے مشہور نہیں تھے، لیکن ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ آگے چل کر بہت نام پیدا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان سے جب 84ء میں کراچی میں ملاقات ہوئی تو وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور اردو کے سرکردہ ناقدین میں شامل ہو چکے تھے اور پریم چند پر اتھارٹی تصور کئے جاتے تھے۔ ان دنوں وہ ہندوستان کی جامعات کے اردو اساتذہ کی تنظیم کے وفد کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ قاضی عبدالستار، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر عنوان چشتی اور وفد کے قائد ڈاکٹر محمد حسن بھی تھے۔

ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے اور ماضی کی باتیں یاد کرتے رہے۔ اس کے بعد قمر رئیس سے پھر غالب اکیڈیمی میں ملاقات ہوئی۔ وہ سیمینار کے دوسرے روز مجلس صدارت کے رکن کی حیثیت سے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی کسی طرح اسٹیج سے نیچے اتر آئے اور مجھے لے کر بستی نظام الدین کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ بستی حضرت نظام الدین شکل و صورت سے خالص مسلمان محلہ لگ رہا تھا اور وہاں داخل ہو کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم جدید شہر دہلی کے بجائے کسی پس ماندہ علاقہ میں آگئے ہیں۔ اس لئے کہ بستی نظام الدین میں آج بھی ایسی تنگ و تاریک اور چھوٹی چھوٹی گلیاں موجود ہیں جو صرف دہلی کے قدیم شہر میں ہی ہو سکتی ہیں۔ ہم جس ہوٹل میں آکر بیٹھے وہ خالص مسلمان ہوٹل لگ رہا تھا اور کراچی کی مضافاتی بستیوں میں واقع ہوٹلوں

سے بہت مشابہ تھا۔ ہوٹل کی ہر جانب قرآنی آیتیں اور طغرے آویزاں تھے اور دروازے پر ہی کباب پراٹھے سجے ہوئے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ خالص مسلمان ہوٹل ہے۔ قمر رئیس مجھے یہاں اس لئے لے آئے تھے کہ وہ مجھ سے اطمینان کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں ایک بار پھر "آثار" (کلکتہ) کے زمانے میں ان سے ہونے والی خط و کتابت یاد دلائی اور ہم دونوں اپنے اپنے تشکیلی دور کی گفتگو میں محو ہو گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ "میرے دورہ ہندوستان کا ایک مقصد راجندر سنگھ بیدی کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرنا ہے۔ آپ نے "عصری آگہی" کا حال ہی میں ایک بہت ہی عمدہ بیدی نمبر نکالا ہے۔ اگر آپ اس ضمن میں میری مدد کریں تو بڑی نوازش ہو گی۔" قمر رئیس نے مجھے اپنے گھر پر مدعو کیا اور کہا کہ "آپ میرے ہاں دو چار روز قیام کیجئے۔ میں آپ کو بیدی کے غیر مطبوعہ خطوط اور تصاویر فراہم کر دوں گا اور مزید باتیں بھی ہوں گی" انہوں نے میری ڈائری میں اپنے گھر کا تفصیلی پتہ لکھ کر دیا اور اپنے گھر کا جائے وقوع بھی سمجھا دیا۔

میں جب قمر رئیس کے ساتھ سیمینار میں واپس پہنچا تو ایک نئے چہرے کو اسٹیج پر بیٹھا ہوا پایا۔ قمر رئیس سے ان کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین ہیں اور میرے باس ابراہیم جلیس مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ میں مجتبیٰ حسین کے نام سے اچھی طرح واقف تھا اور "کتاب نما" میں ان کے مزاحیہ مضامین اور خاکوں کے علاوہ جاپان کا مشہور و معروف سفرنامہ بھی پڑھ چکا تھا اس لئے میں ان کا پہلے ہی معتقد بن چکا تھا، لیکن مجھے جب معلوم ہوا کہ وہ ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں تو میں ان سے ملنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ بحیثیت سینئر ادیب اور بحیثیت باس ابراہیم جلیس سے میرے دیرینہ تعلقات تھے، میں نے ان کے ساتھ ان کے آخری ایام میں روزنامہ "مساوات" میں کام کیا تھا۔ وہ "مساوات" کراچی کے ایڈیٹر تھے اور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر (لیڈر رائٹر) ان سے روز ملاقات ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بنیادی طور پر بہت نیک، شریف اور ہمدرد انسان ہیں اور دوسروں کے دکھ درد کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ بہت کم عرصہ کام کرنے کا موقع ملا، لیکن میں نے انہیں نجی طور پر ایک عظیم انسان پایا۔ ان میں بہت سی کمزوریاں ہو سکتی ہیں، لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسان دوستی اور شرافت تھی اور اپنے سے جونئیر ادبا کا احترام۔ وہ ضیاالحق کے مارشل لا کا انتہائی سخت زمانہ تھا۔ "مساوات" چونکہ پیپلز پارٹی کا اخبار تھا، اس لئے مارشل لا حکام کی اس اخبار پر خاص نظر

عنایت تھی۔ کرنل عقیل، جلیس مرحوم کو روز اپنے دفتر میں طلب کرتے اور نت نئے احکامات کے ذریعے اخبار کی اشاعت میں رکاوٹ ڈالتے، بالآخر ایسا دور بھی آیا جب مارشل لا حکام نے "مساوات" کی اشاعت پر مکمل پابندی عائد کر دی اور تقریباً ڈھائی سو ملازمین اچانک بے روزگار ہو گئے۔ ابراہیم جلیس کو اس واقعے کا گہرا صدمہ پہنچا اور وہ اخبار کو واگزار کرانے کے لئے مارشل لا حکام کے دفتر کے پھیرے لگاتے رہے اور اسی صدمے کے باعث ان پر اچانک دل کا دورہ پڑا۔ مساوات پر پابندی کے بعد وہ مسلسل ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہے۔ میں، سرکولیشن منیجر رؤف شیرازی اور جلیس مرحوم دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔ اس روز حسب معمول کھانا کھا ہی رہے تھے کہ وہ اپنی نشست پر اچانک غش کھا کر گر پڑے۔ انہیں فوراً جناح ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں وہ چند گھنٹوں کے بعد چل بسے۔ ابراہیم جلیس کی وفات کا یوں تو سارے ملک میں گہرا صدمہ محسوس کیا گیا، لیکن میں نے ان کی موت کو قطعی ذاتی نقصان محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے ایک بت بڑے محسن سے محروم ہو گیا۔ ایسے شخص کا چھوٹا بھائی میرے سامنے ہو اور میں اس سے نہ ملوں۔ یہ کیوں کر ممکن تھا۔ میں نے اپنی گھڑی کی جانب دیکھا۔ تھوڑی دیر میں شمس الرحمان فاروقی مجھے لینے کے لئے پہنچنے والے تھے؛ چنانچہ میں اپنی نشست سے اٹھا۔ اسٹیج پر جا کر ان سے اپنا تعارف کرایا، اپنی دونوں کتابیں انہیں دیں اور ان سے تفصیلی ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور یہ بھی بتا دیا کہ میں اس وقت شمس الرحمان فاروقی کے ساتھ اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں۔ وہاں سے پھر سیمینار میں واپس آؤں گا۔

تھوڑی ہی دیر میں شمس الرحمان فاروقی سماعت گاہ میں نظر آئے اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ رضوان اللہ بھائی جامعہ نگر (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے قریب ذاکر نگر میں رہتے تھے اور انہوں نے وہاں اپنا نجی گھر بنا لیا تھا۔ بستی حضرت نظام الدین سے ذاکر نگر کا فاصلہ خاصا ہے۔ لیکن شمس الرحمان فاروقی نہایت تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے چند منٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ ذاکر نگر شکل و صورت کے اعتبار سے ایک مضافاتی بستی لگا۔ اس بستی کا نام ہندوستان کے مشہور قوم پرست رہنما اور صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام پر رکھا گیا تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متصل تھا۔ جس کی وجہ سے جامعہ سے وابستہ اساتذہ اور دیگر اہل کار اسی بستی میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ جامعہ ملیہ سے ملحق علاقہ اوکھلا، جہاں ہندوؤں کا اعلیٰ اور اعلیٰ متوسط طبقہ آباد تھا۔ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا اور وہاں بڑی بڑی کشادہ سڑکیں اور عالی شان عمارتیں

تھیں، لیکن جہاں اصل ذاکر نگر واقع تھا، وہ کسی قدر پس ماندہ تھا، زیادہ تر عمارتیں سرخ اینٹ کی بنی ہوئی تھیں، جو پلستر سے عاری تھیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی پس ماندگی کی منہ بولتی ہوئی تصویریں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی زیادہ تر گلیاں تنگ تھیں۔ بستی کی صورت دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے۔

رضوان اللہ بھائی ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں ملے اور اندر کمرے میں لے گئے اور کلکتہ اور کراچی میں رہنے والے مشترکہ دوست واحباب کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ رضوان اللہ بھائی بہت ضعیف ہو چکے تھے، لیکن ان میں اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ کلکتے میں "عصر جدید" میں کام کرتے ہوئے بھی امریکی دفتر اطلاعات سے وابستہ تھے اور اس وقت دہلی میں واقع امریکی دفتر اطلاعات میں اردو کے ایڈیٹر تھے۔ شمس الرحمان فاروقی رشتے میں رضوان بھائی کے بھتیجے تھے۔ لیکن اتنے بے تکلف تھے جیسے دوست ہوں۔ انہوں نے خود اس کا اعتراف کیا اور کہا، "رضوان اللہ میرے چچا تو ہیں لیکن ہم دونوں دوست بھی ہیں۔"

رضوان اللہ بھائی سے زیادہ تر ہندوستان میں اردو صحافت، ہندوستان کی سیاست اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہندو مسلم مسئلہ کو برصغیر کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھتا ہوں، یہ مسئلہ حل نہ ہونے کے باعث ہی پاکستان معرض وجود میں آیا تھا اور بے انتہا خون بہنے اور عورتوں کی عصمتیں لٹے جانے کے علاوہ ایک کروڑ افراد نے ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کی تھی، جو تاریخ انسانی کی سب سے بڑی نقل مکانی تھی۔ اس مسئلہ نے کروڑوں افراد کی زندگی کو متاثر کیا تھا اور چالس سال گزر جانے کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں قائم تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آج سے چالیس سال قبل جن ہندوستانی مسلمانوں نے زمینی رشتوں کو ایک نئے "وطن" کی خاطر چھوڑ کر پاکستان میں ہجرت کی تھی، اس سرزمین نے انہیں ابھی تک پورے طور پر قبول نہیں کیا تھا اور ایک نومولود ملک میں مختلف لسانی گروہوں، علاقائی ثقافتوں اور نسلی قومیتوں کے مفادات کے باہمی تصادم کے نتیجے میں ان کی حیثیت متنازعہ فیہ بن کر رہ گئی تھی۔ جو لوگ چالیس سال قبل ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے وہ کافی متمول اور خوشحال تھے، لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی بنیادیں اس سرزمین میں پیوست نہیں ہوئی تھیں اور جن لوگوں نے اپنے آبائی وطن کی جدائی گوارانہ کرتے ہوئے وہاں رہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان پر چند ہی برسوں میں یہ ناخوشگوار حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ جس سرزمین کو وہ اپنا سمجھتے

تھے۔ وہ اب ان کی نہیں رہی تھی۔ ہندو اکثریت کی سرزمین تھی اور وہ لسانی، تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے تنہا اور بے سہارا ہو کر رہ گئے ہیں اور ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔

میں اس مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت اس لئے بھی دیتا تھا کہ میں خود اس مسئلے کا شکار ہوا تھا اور اسی مسئلے نے مجھے پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ میرے لئے ہندوستان میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور اپنا گھر بار، بھائی بہن، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو چھوڑ کر ایک اجنبی ملک میں آبسنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ چالیس برس گزر جانے کے باوجود ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان کی سیکولر ریاست ان فسادات پر قابو پانے میں کیوں ناکام ہے۔؟ اس کے باوجود میں نے رضوان بھائی سے اس کے اسباب دریافت کئے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے جوابات اطمینان بخش نہیں ہوں گے۔

میرے ان سوالات کا رضوان بھائی نے تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا، البتہ اتنا کہا کہ "پاکستان ٹوٹنے اور بنگلہ دیش بننے کے بعد اب ہندوستانی مسلمان پاکستان کی جانب تکتے نہیں ہیں۔ ان میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے اور انہوں نے ہر حال میں ہندوستان میں ہی رہنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا دفاع خود کرنے لگے ہیں اور فسادات کے پیش نظر وہ بعض اوقات اپنے دفاع کے لئے خود ہی حملہ کر دیتے ہیں۔ اگر انتظامیہ فریق نہ بنے تو وہ اپنا دفاع خود ہی کر لیتے ہیں، لیکن جہاں انتظامیہ بلوائیوں کا ساتھ دیتی ہے وہاں مسلمانوں کو بہت جانی اور مالی نقصان پہنچتا ہے۔"

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اور رضوان بھائی سے رخصت ہونے کے بعد شمس الرحمان فاروقی نے مجھے پھر بستی حضرت نظام الدین میں پہنچا دیا۔ راستے میں فاروقی نے، محمود ہاشمی کو دیکھ کر اپنی کار روک لی۔ میں محمود ہاشمی کے ساتھ تھوڑی دیر بستی نظام الدین کے اسی ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا جہاں اس سے قبل قمر رئیس کے ساتھ آکر بیٹھا تھا دراصل غالب اکیڈیمی کے قریب اور کوئی سلیقے کا ہوٹل نہیں تھا اور میں محمود ہاشمی سے ملنے کے بعد سیمینار میں جانے والا تھا۔

محمود ہاشمی سے اگرچہ میری یہ پہلی ملاقات تھی، لیکن میں ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ 60ء کی دہائی میں کامٹی (ودربھ) (بھارت) سے شائع ہونے والے ماہنامہ "خیال" کی مجلس ادارت میں

فیض انصاری کے ساتھ ان کا نام بھی شامل تھا۔ وہ اس زمانے میں زیادہ مشہور نہیں تھے۔ اس کے برعکس ان کے ہم نام یعنی "کشمیر اداس ہے" کے مصنف محمود ہاشمی کا زیادہ شہرہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات پر ان کا اسی عنوان سے مشہور رپور تاژ "نیا دور" کراچی (مدیر صمد شاہین اور ممتاز شیرین) کے "فسادات نمبر" میں شائع ہو کر بہت مشہور ہو چکا تھا، خصوصاً ممتاز شیرین نے اپنے مضامین میں اس کا بار بار ذکر کیا تھا اور ادبی حلقہ اسی حوالے سے محمود ہاشمی کے نام سے واقف تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے محمود ہاشمی نے شاید لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ میں ایک مدت تک "خیال" والے محمود ہاشمی کو ہی "کشمیر اداس ہے" والا محمود ہاشمی تصور کرتا رہا۔ یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوئی جب مظہر امام پاکستان کے دورے پر آئے اور انہوں نے اس بارے میں تفصیل بتائی۔

موجودہ محمود ہاشمی اس دوران اس کچھ عرصے قطعی گمنام رہے اور ان کا دوبارہ ورود اس وقت ہوا جب صلاح الدین پرویز اچانک ادبی منظر نامے میں نمودار ہوئے اور ان کی آمد کے ساتھ بہت سارے ادبی اور غیر ادبی اسکینڈل مشہور ہوئے۔ معلوم ہوا کہ محمود ہاشمی ناقد بن گئے ہیں اور صلاح الدین پرویز اور جدیدیت کے بارے میں یکے بعد دیگرے مضامین لکھ رہے ہیں۔

محمود ہاشمی نے بتایا کہ وہ اس وقت آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے وابستہ ہیں اور اس وقت ریڈیو جا رہے ہیں، چنانچہ میں نے انہیں زیادہ دیر روکنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے میری مختصر ملاقات رہی، انہوں نے اپنے گھر کا پتہ دیا اور گھر پر ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں محمود ہاشمی سے رخصت ہو کر جب سیمینار میں پہنچا تو خواجہ احمد فاروقی اندرا گاندھی کے بارے میں اپنا خاکہ سنا رہے تھے۔ یہ خاکہ کیا تھا۔ نثر میں قصیدہ تھا اور قصیدہ کیوں نہ ہوتا۔؟ نہرو خاندان سے ان کے دیرینہ مراسم تھے اور اندرا گاندھی نہ صرف ان کی ہم عمر تھیں، بلکہ لڑکپن میں ان کے ساتھ کھیل چکی تھیں اور اندرا گاندھی نے انہیں سائیکل چلانا بھی سکھانا چاہا تھا اور پھر 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں مسز اندرا گاندھی کا ان پر ذاتی احسان بھی تھا۔ خاکہ بہت دلچسپ، شگفتہ اور پر از معلومات تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ خواجہ احمد فاروقی کا اندرا گاندھی سے کتنے گہرے مراسم تھے۔ خواجہ فاروقی کہہ رہے تھے:۔

" جس زمانے میں بنگلہ دیش کی تحریک چل رہی تھی، میں جرمنی میں تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ الطاف بھائی مشرقی پاکستان کے کنٹرولر جنرل مقرر کئے گئے ہیں۔ آخر ایک روز یہ خبر ملی کہ ڈھاکہ کا

سقوط ہوگیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سے فوجی اور سول حکام (غالباً 90 ہزار) قید ہو کر ہندوستان آگئے ہیں اور ان کا ایک کیمپ رڑکی میں بھی ہے۔ اس پورے عرصہ میں الطاف بھائی کی مطلق کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ ان سے رشتے سے زیادہ دوستی کا تعلق تھا۔ ہر وقت ان کی اچھی اچھی باتیں، مزے مزے کی حکایتیں یاد آتی تھیں اور طبیعت بے چین ہو جاتی تھی۔ میں اس بات کا برسر عام اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ میں بڑا گناہ گار آدمی ہوں، ہفتوں اور مہینوں نماز بھی نہیں پڑھتا اور اگر پڑھتا ہوں تو کبھی صبح کی پڑھ لی، کبھی عشا کی پڑھ لی، ایک روز صبح کو بہت سویرے آنکھ کھل گئی۔ میں نے وضو کی، نماز پڑھی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ الطاف بھائی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ خیریت سے ہوں، خدا کی رحم کے قربان جائیے ابھی صبح کے صرف چھ بجے تھے کہ کسی نے گھنٹی بجائی، میں دروازہ پر گیا۔ دیکھا کہ ایک فوجی افسر کھڑے ہیں۔

انہوں نے پوچھا، آپ فاروقی صاحب ہیں؟ آئی اے فاروقی کے کزن؟"

"جی ہاں"

"میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں"

"بسم اللہ، یہاں ڈرائنگ روم میں آجائیے۔"

انہوں نے فرمایا، آپ کے بھائی میرے پاس رڑکی کے پی او ڈبلیو کیمپ میں ہیں۔ وہ اتنے اچھے اور پیارے آدمی ہیں کہ میں بے اختیار مجبور ہوگیا کہ اپنے اوپر اعتراض مول لوں اور ان کی خیریت آپ کو سناؤں۔ ان کا خط بھی لایا ہوں۔ پروفیسر صاحب، دل کے مریض ہیں۔ ان کو دواؤں کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "اس خط میں انہوں نے دواؤں کے نام نہیں لکھے۔ اچھا میں ریڈ کراس کے ذریعے دوائیں بھجوا دوں گا۔ فی الحال یہ روپیئے، یہ کتابیں آپ ان کو دے دیں اور میرا سلام پہنچا دیں۔"

میں نے مسز اندرا گاندھی کو کبھی کوئی زحمت نہیں دی تھی۔ دوسرے ان سے مراسم بھی تھوڑے سے تھے۔ ایسے مراسم ان کے کم از کم ایک لاکھ آدمیوں سے ہوں گے، لیکن اس وقت دل پر قابو نہیں رہا۔ میں نے مسز گاندھی کو خط لکھا کہ الطاف بھائی میرے عزیز قریب ہیں۔ قلب کے مریض ہیں اور ان کو دہلی کے کسی کلینک میں میرے خرچ پر داخل کرا دیجئے یا اچھا تو یہ ہے کہ ان کو کراچی ان کے بچوں کے پاس بھیج دیجئے، خط کے پہنچتے ہی مسز گاندھی نے ان کی رہائی کا انتظام کیا اور انٹرنیشنل ریڈ کراس کے ذریعے انہیں کراچی پہنچوا دیا۔

عید کا دن تھا۔ جنرل مانک شا کا ٹیلی فون آیا کہ آپ کے بھائی دہلی میں ہیں۔ ان کے کراچی بھیجنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو اس جگہ آ کر مل لیں۔"

خواجہ احمد فاروقی اپنے تاثرات بیان کر رہے تھے، "میں معاملہ کے ہر پہلو پر غور کرتا ہوں تو میری روح دوزانو ہو جاتی ہے۔ یہ کام کوئی پرائم منسٹر نہیں کر سکتا تھا۔ صرف مسز گاندھی کر سکتی تھیں۔ ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جواب نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیکی اور بھلائی کا فرشتہ ہیں جو صرف دکھ درد کو دور کرنے اور آنکھوں سے آنسو پوچھنے کے لئے زمین پر اتری ہیں۔"

اس روز تیسری اور چوتھی نشست میں ڈاکٹر محمد حسن نے خواجہ غلام السیدین پر، ظہیر احمد صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزاد پر، ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے ڈاکٹر سید عابد حسین پر، عبداللطیف اعظمی نے پروفیسر مجیب پر، ڈاکٹر شمیم نکہت نے رضیہ سجاد ظہیر پر، ڈاکٹر اشرف نے سلام مچھلی شہری پر، سید سلیمان صابری نے محمد عثمان فارقلیط پر اور خار دہلوی نے سائل دہلوی پر خاکے پڑھے، لیکن میں کسی خاکے سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تو وہ اندرا گاندھی پر خواجہ احمد فاروقی کا خاکہ تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے ٹوٹتا ہوا دیکھا تھا۔ یہ خاکہ مدح سرائی سے پر سہی، لیکن اس میں اندرا گاندھی کی انسان دوستی کی ایک جھلک ضرور نظر آتی تھی۔

خواجہ احمد فاروقی کا خاکہ ختم ہوا ہی تھا کہ ایک نوجوان میرے قریب آیا اور اس نے سرگوشی میں کہا، "بستی نظام الدین میں مجتبیٰ حسین صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ ان کے پاس لے جاؤں"

میں مجتبیٰ حسین سے ملنے اور باتیں کرنے کا مشتاق تھا چنانچہ فوراً اس نوجوان کے ساتھ روانہ ہو گیا، میں بستی نظام الدین کے نہایت پر پیچ اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا اینٹ کھولا کے ایک گھر میں داخل ہوا، جہاں مجتبیٰ حسین اور شبیہ احمد میرے منتظر تھے۔ ان گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے مجھے بڑی اپنائیت کا احساس ہوا، جیسے میں اپنے حقیقی ماحول میں واپس آ گیا ہوں۔ ایسا ماحول میں نے کلکتے میں صرف ان بستیوں میں دیکھا تھا جو شہر کے قلب میں واقع تھیں اور جہاں اس وقت تک بلند و بالا عمارتیں قائم نہیں ہوئی تھیں اور جہاں صرف غریب طبقہ رہتا تھا۔ کراچی میں ایسا ماحول اور ایسی فضا مفقود تھی۔ اس لئے کہ وہ ایک جدید شہر تھا اور کلکتہ اور دہلی سے قطعی مختلف تھا۔ یہ ماحول صرف کلکتے میں ملتا تھا، خصوصاً غریب بستیوں میں۔ والان میں داخل ہوتے ہی عورتوں کو پردہ کوا دیا گیا اور میں ایک تنگ سے کمرے میں داخل ہوا، وہاں مجتبیٰ حسین اور ایک نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ مجتبیٰ

حسین نے ان سے میرا تعارف کرایا، "ان سے ملئے۔ آپ شبیہ احمد ہیں، ترقی پسند ادیب اور سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کی کتابوں کے ناشر" وہ بڑے تپاک سے ملے اور انہوں نے رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں کا مجموعہ "اللہ دے بندہ لے" کے علاوہ اپنے ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں کا سیٹ دیا، شبیہ احمد نے کتابوں کی اشاعت کا نیا کاروبار شروع کیا ہے اور وہ بڑی خوبصورت کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ یہاں مجتبیٰ حسین سے جی بھر کے باتیں ہوئیں، انہوں نے کہا کہ "میں 4 اپریل 85ء کو آپ اور علی باقر کے اعزاز میں لنچ کا اہتمام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ تشریف لائیں تو نوازش ہو گی۔"

میں نے ان کی دعوت قبول کر لی اور 4 اپریل 85ء کو ان کے ہاں آنے کا وعدہ کر لیا، علی باقر سجاد ظہیر کے داماد تھے اور میں ان سے بحیثیت افسانہ نگار واقف تھا۔ "شمع" دہلی میں ان کے کئی افسانے پڑھ چکا تھا اور ان سے ملنے کا مشتاق تھا۔ میں مجتبیٰ حسین اور شبیہ احمد سے مل کر پھر غالب اکیڈیمی لوٹ آیا اور سیمینار میں اختتام تک رہا۔

سیمینار کے اختتام پر میں، شارب، بھابی شمیم نکہت اور شعاع فاطمہ کے ساتھ پبلک بس پر ان کے گھر روانہ ہو گیا۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن 2 کے بس اسٹاپ پر اتر گئے اور گھر کی جانب پیدل روانہ ہو گئے۔

بس اسٹاپ سے ان کا گھر ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ شارب صاحب کے مکان کے قریب ہی سکھوں کا گردوارہ تھا جو اندرا گاندھی کے قتل کے وقت بہت متاثر ہوا تھا۔ مشتعل ہندوؤں نے سکھوں کو نشانہ بنانے کے بعد اس پر بھی حملہ کر دیا تھا۔ جسے محفوظ رکھنے کے لئے پولیس کو کئی راؤنڈ گولیاں چلانی پڑی تھیں اور سکھ مخالف بلوے میں شارب صاحب کا گھر بھی نذر آتش ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس لئے کہ ان کے مکان کی دوسری منزل پر سکھ کرائے دار رہتے تھے اور مشتعل ہجوم نے انہیں زندہ نذر آتش کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ انہیں بڑی مشکلوں سے یہ کہہ کر باز رکھا گیا کہ یہ سکھ کا نہیں مسلمان کا گھر ہے۔ اس لئے اسے جلانے سے سکھوں کے بجائے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اندرا گاندھی کے قتل کے موقع پر دہلی میں جو بلوہ ہوا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس میں دو ہزار چار سو سکھ ہلاک، چار ہزار بچے یتیم چھ سو عورتیں بیوہ اور پچھتر ہزار افراد بے گھر ہوئے تھے۔ یہ اعداد و شمار ایک غیر سرکاری تحقیقاتی ادارے نے فراہم کئے ہیں۔

شارب ردولوی اور بھابی شمیم نکہت کے اپنے ہندو پڑوسیوں اور اہل محلہ سے بڑے اچھے اور

برادرانہ مراسم ہیں اور وہ ایک دوسرے کی سماجی تقریبات میں بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب ایک ہندو فیملی سے ہم سب کی سرراہ ملاقات ہو گئی اور سب نے ہاتھ جوڑ کر "نمسکار" کہتے ہوئے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ یہ منظر میرے لئے عجیب غریب تھا اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے عجیب سا محسوس ہوا، حالانکہ میری عمر کا بڑا حصہ ہندوستان (بنگال) میں گزر چکا تھا اور میں خود نمسکار کہہ کر اپنے ہندو دوستوں کو سلام کیا کرتا تھا۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد سے میرے کان اس لفظ سے ناآشنا تھے، مشرقی پاکستان میں بھی بنگالی مسلمان ایک دوسرے سے "السلام علیکم" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ چنانچہ میں حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگا اور میرا ذہن فوراً سوچنے لگا۔

"تو چالیس سال کے دوران پڑھے لکھے ہندوستانی مسلمانوں میں یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے؟ جس اسلامی تہذیب و تمدن اور سماج و ثقافتی روایت کی حفاظت اور تقدس کے نام پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور بالآخر پاکستان حاصل کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی ہندوستان میں رہ جانے والے بارہ کروڑ مسلمانوں کے "بھارتیہ کرن" (یا انڈین نائزیشن) کا عمل ہنوز جاری ہے؟ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے دو راہیں تھیں یا تو وہ عام قومی دھارے میں شامل ہو کر ہندوستانی قوم کا حصہ بن جائیں اور اپنی علیحدہ تہذیبی شناخت ختم کر دیں یا پھر عام قومی دھارے سے خود کو الگ تھلگ رکھ کر اپنی علیحدہ تہذیبی شناخت قائم رکھیں، اس وقت ہندوستانی مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے خود کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی غرض سے ہندوؤں سے شادی بیاہ رچانا اور اس طرح متحدہ قومیت کے تصور کے تحت خود کو ہندوستانی قوم میں ضم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے دوسرے گروہ نے خود کو اپنے خول میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ گروہ عام قومی دھارے سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اعلیٰ اور اعلیٰ متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے اور لبرل اور ترقی پسند حلقوں میں ہندو مسلم شادی کا رواج اس قدر عام ہو چکا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ جہاں آدرش پرستی ہے وہاں سماجی تحفظ اور مالی منفعت کی غرض سے حکمران طبقے میں شامل ہو کر مراعات کے حصول کی خواہش بھی ہے۔ میں نے خود سے کہا، "ہم پاکستانیوں کو یہ ساری باتیں خواہ عجب ہی کیوں نہ لگیں۔ اس بارے میں اپنی رائے مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم نے برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ اپنی بہتری اور روشن مستقبل کے لئے جو چاہیں کریں۔ ہم بولنے والے کون؟

خواجہ نظام الدینؒ

31 مارچ 85ء کو سیمینار کا آخری دن تھا اور میں اس میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ میں سیمینار میں جانے سے قبل حضرت نظام الدینؒ اولیا کی درگاہ کی بھی زیارت کر لوں، گذشتہ دو روز سے میں سیمینار میں اس قدر مصروف تھا کہ مجھے یہاں کی زیارت کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا چنانچہ میں صبح ہوتے ہی تنہا بستی نظام الدین کے لئے نکل گیا اور ماڈل ٹاؤن سے بس پر سیدھے بستی حضرت نظام الدین پہنچ گیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ غالب اکیڈمی کے قریب واقع تھی جو دہلی کے گنجان آباد علاقوں میں سے ہے۔ دہلی میں یوں تو بہت اولیائے کرام کے مزار موجود ہیں، لیکن سب سے زیادہ جنہیں شہرت اور عظمت حاصل ہے۔ وہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا ہیں۔ ان کا اصل نام محمد بن احمد البخاری ہے اور خواجہ نظام الدینؒ اور محبوب الٰہی ان کے لقب ہیں۔ دیکھا جائے تو وہ خالص ہندوستانی ہیں۔ وہ 634ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے اور 25 سال کی عمر میں غیاث الدین بلبن کے عہد میں دہلی تشریف لائے اور غیاث پورہ میں سکونت اختیار کی۔ غیاث پورہ وہی مقام ہے جہاں موجودہ بستی نظام الدین واقع ہے۔ آپ نے بقیہ عمر اسی جگہ بسر کی۔ آپ بچپن میں بہت ذہین، تیز طبع اور دانش مند تھے۔ انہوں نے 41 سال کی عمر میں اس زمانے کے سب سے بڑے محدث مولانا کمال الدین سے دینی تعلیم حاصل کی، دہلی آنے کے بعد انہوں نے پہلے نجیب الدین متوکل سے فیض حاصل کیا۔ پھر شیخ فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بعیت کی۔ ربیع الثانی کی 18 تاریخ 725ھ کو انہوں نے رحلت فرمائی۔

آپ کی رحلت کے بعد مختلف حکمرانوں نے آپ کے روضے کی تعمیر میں حصہ لیا۔ سلطان محمد تغلق نے سب سے پہلے آپ کے مزار کے اوپر ایک گنبد بنوایا، جس کا اب نام و نشان نہیں ہے فیروز شاہ تغلق نے حجرے کے اندرونی حصہ کی مرمت کرائی اور اس کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ صندل

کے کواڑ چڑھائے اور چاروں کونوں پر سونے کے کٹورے آویزاں کئے۔ 970 ھ میں اکبر بادشاہ کے عہد میں سید فریدوں خاں نے آپ کے مزار کے گرد بارہ ستون ایستادہ کئے۔ ان پر گنبد بنوایا اور درون میں سنگ مرمر کی جالیاں لگائیں اور آپ کے سرہانے ایک سنگ مرمر کی لوح نصب کرائی۔ اس کے بعد 1017 ھ میں جہاں گیر کے عہد میں فرید خاں، نے جنہوں نے فرید آباد بسایا تھا۔ ایک صندل کا چوبی چھپرکھٹ چڑھایا۔ جس پر سیپ سے نہایت عمدہ پچی کاری کا کام ہوا تھا۔ 1063 ھ میں شاہجہاں کے عہد میں خلیل اللہ خاں نے مزار کے گرد سنگ سرخ کی غلام گردش بنوائی، جس کے ہر ضلع میں پانچ در ہیں اور دو دروں پر 1149 ھ میں عالمگیر ثانی نے ایک سنگ مرمر کی تختی پر کچھ اشعار کندہ کرا کے مزار کی پائنتی پر لگائے تھے۔ مولانا فخرالدین نے غلام گردش کے ستونوں کو سنگ مرمر کا بنوایا تھا اور ستون خرید بھی لئے تھے مگر بنوانے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ارادے کو نواب احمد بخش والئ فیروز پور نے پورا کیا اور سنگ مرمر کے ستون لگوائے۔ فیض اللہ خاں نے 1226 ھ میں تانبے کی چھت، جس پر سنہری اور لاجوردی کا کام تھا، چڑھوائی۔ روضہ پر اکبر ثانی نے چونے کے برج کی جگہ سنگ مرمر کا برج بنوایا تھا اور اس پر سنہری کلس لگا دیا تھا۔ پھر دہلی کے انگریز ڈپٹی کمشنر آر کلارک نے غلام گردش کی چھت کو از سر نو درست کرایا۔

خواجہ نظام الدین اولیا، سقراط کی طرح اپنے شاگرد امیر حسن سجزی کی بنا پر مشہور ہیں۔ امیر حسن سجزی نے ہی اپنے مرشد کے اقوال اور مکالمے "فواد الفواد" کے عنوان سے مرتب کئے تھے۔ جسے خود مرشد نے بھی پسند کیا تھا۔ اس تصنیف کو فن سلوک کا دستور العمل قرار دیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ اس صوفی دانشور حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا کے ذہنی ارتقا کے اعلیٰ ترین مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے اس میں ان کے ستر برس کی عمر کے بعد کے ملفوظات شامل کئے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب کے نزدیک شریعت اور طریقت دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور یکساں طور پر اہم ہیں۔

میں نے خواجہ نظام الدینؒ اولیا کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور برصغیر کے صوفیائے کرام میں ان کی ذات سے اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ دوسرے راسخ العقیدہ علماء کی بہ نسبت بہت لبرل اور روشن خیال واقع ہوئے تھے اور ان کے افکار کی اساس محبت کے تصور پر رکھی گئی تھی۔ ایک ایسی محبت، جو گروہوں اور گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر تمام نسل انسانی کو اپنے حلقہ میں لے لیتی ہے۔ راسخ العقیدہ علماء کے برعکس خواجہ نظام الدینؒ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد ذات باری تعالیٰ کی محبت ہے، لیکن وہ خدا کے لئے محبت کو

انسانیت کے لئے محبت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر خدا کی محبت نامکمل رہتی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیا آج کے مفہوم میں اس زمانے کے بہت بڑے ترقی پسند صوفی تھے اس لئے کہ وہ نسل انسانی کے لئے محبت، سماجی انصاف، ظلم و تشدد کا خاتمہ اور روحانی اور ذہنی آزادی ضروری تصور کرتے تھے۔ ان سب کے بغیر خواجہ نظام الدین کے نزدیک خدائی محبت کی تکمیل نہیں ہوتی تھی ان کا عمومی رویہ انسان دوستی کا تھا۔

برصغیر کی تاریخ میں خواجہ نظام الدین کی اس لئے بھی بہت اہمیت تھی کہ انہوں نے اس نئی ثقافت کے لئے نظریاتی اساس فراہم کی تھی جو برصغیر کے شمالی حصے میں ہندو مسلم ملاپ سے تشکیل پا رہی تھی۔ بعد کے دور میں بقول قاضی جاوید اس نظریاتی اساس نے وحدت الوجود کی مابعد الطبیعیات کی صورت اختیار کر لی تھی۔

خواجہ نظام الدینؒ کی ذات اقدس سے میری دلچسپی کی ایک وجہ فنون لطیفہ سے ان کی دلچسپی تھی. جن کی بنا پر سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت میں جب راسخ العقیدہ عناصر کو اقتدار حاصل ہوا تو خواجہ نظام الدین اولیا کی روشن خیالی کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ان پر شرعی اصولوں کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا گیا اور اس سلسلے میں خاص طور پر موسیقی سے ان کی دلچسپی کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔ بالآخر اس الزام کی تحقیق کے لئے ایک مذہبی عدالت تشکیل دی گئی جو 253 علمار پر مشتمل تھی۔ خواجہ نظام الدین اولیا کو عدالت میں طلب کیا گیا وہ اپنے خاص شاگردوں کے ساتھ پیش ہوئے اس مذہبی عدالت کے فیصلے کے بارے میں کوئی واضح اطلاع موجود نہیں "سیرالعارفین" کے مصنف کے بیان کے مطابق سلطان غیاث الدین تغلق نے مولانا علم الدین کی رائے سے آگاہ ہونے کے بعد خواجہ نظام الدین اولیا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ خواجہ نظام الدینؒ اولیا کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دیگر انسان دوست صوفیا کی طرح نجی ملکیت کے مخالف تھے، چنانچہ ان کے مریدوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ نجی ملکیت سے نجات حاصل کر لیں۔ میں جب ان کی درگاہ پر فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ اس دور میں بھی آج کی طرح ترقی پسند اور انقلابی تصورات کے حامل صوفیا بھی ہوتے تھے اور انتہائی قدامت پسند صوفیا بھی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیار کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد حضرت امیر خسرو کے مزار کی جانب بڑھا، جو قریب ہی واقع تھا۔ امیر خسرو کا چرچا گذشتہ چند برسوں سے بہت زیادہ ہونے لگا ہے۔

کیونکہ ہندوستان اور پاکستان، روس اور دیگر ملکوں میں ان کا ہفت صد سالہ جشن ولادت بہت شاندار طور پر منایا گیا حالانکہ اس نابغہ روزگار ہستی کی اہمیت پہلے بھی کم نہ تھی۔ اس سے قبل ان کے مزار پر نہ کوئی سائبان تھا اور نہ گنبد 1014ھ میں طاہر محمد عماد الدین نے موجودہ گنبد اور مجر سنگ مرمر کا ستون اور گنبد کے گرد سنگ سرخ کی جالیاں لگائی تھیں۔ امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں تیزی سے غالب اکیڈیمی کی جانب روانہ ہو گیا۔ جہاں سیمینار کا آخری سیشن شروع ہونے والا تھا۔

اس روز سید ضمیر حسن نے شاہد احمد دہلوی پر، ڈاکٹر صلاح الدین نے نور الدین بیرسٹر پر، پروفیسر عبدالودود اطہر نے منظور حسن موسوی پر سعید خاں نے آصف علی پر، ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مولانا ابوالکلام آزاد پر اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے استاد رسا دہلوی پر خاکے پڑھے، صبح سے شام تک سیمینار میں شرکت کرنے اور لوگوں سے ملنے میں اتنا مصروف رہا کہ شارب اور شمیم بھابی سے یکسوئی کے ساتھ باتیں کرنے کا بہت کم موقع ملا۔ خدا خدا کر کے اب سیمینار ختم ہو چکا تھا اور اب میں اپنے میزبانوں سے اطمینان کے ساتھ باتیں کر سکتا تھا۔ آج شارب کے ہاں میری آخری رات تھی۔ دوسرے دن صبح میں جوگندر پال جی کے ہاں منتقل ہونے والا تھا۔ پال جی کی خواہش تھی کہ میں چند روز ان کے ہاں بھی گزاروں۔ انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ مدعو کیا تھا۔ اس لئے میں انکار نہ کر سکا۔ دوسری جانب شارب رودولوی کے ہاں سے رخصت ہوتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ شارب صاحب کو جب جوگندر پال نے بتایا کہ وہ مجھے چند روز اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فوراً اجازت دے دی اور میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اس روز شارب صاحب اور شمیم بھابی سے دل کھول کر باتیں کرنے کا فیصلہ کیا اور میں نے ان سے بہت سی باتیں معلوم کیں۔

شارب اور شمیم نکہت

شارب ردولوی اور شمیم نکہت کا جوڑا بہت ہی خوبصورت، آئیڈیل اور قابل رشک جوڑا ہے۔ دونوں کا شعر و ادب سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ دونوں زندگی کی جدوجہد میں شانہ بہ شانہ شریک ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں میں گہری محبت اور زندگی گزارنے کے بارے میں کامل افہام و تفہیم ہے۔ دونوں لکھنو یونیورسٹی میں ہم جماعت تھے، ایک ساتھ ایم اے کیا تھا۔ دونوں احتشام حسین کے چہیتے طلبار تھے اور دونوں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ دونوں کے ادیب بننے میں احتشام حسین کی ذہنی اور ادبی تربیت اور سرپرستی شامل تھی۔ دونوں نے سید سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کی معیت میں اپنے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ شارب احتشام حسین کے ان شاگردوں میں شامل تھے، جنہوں نے آگے چل کر بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں احمد جمال پاشا، عابد سہیل، خلیل الرحمان اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن اور حسن عابد شامل ہیں۔

میں جتنے دن شارب صاحب کے ہاں رہا۔ میں نے دیکھا کہ شمیم نکہت علی الصبح اٹھتیں، نماز پڑھتیں، اپنی بچی شعاع فاطمہ کو اسکول کے لئے تیار کرتیں شارب اطمینان سے اٹھتے، اخبار پڑھتے، ناشتے کی میز پر تینوں ساتھ ناشتہ کرتے اور شمیم بھابی اور شعاع کے جانے کے بعد وہ پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ شارب ایوننگ کالج میں تھے۔ اس لئے انہیں پڑھنے لکھنے کا وافر موقع مل جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے دوسرے رفقا اور ہم عصر ادبا کی بہ نسبت زیادہ ادبی کام کیا ہے۔

طویل القامت، گورے چٹے، سر کے بال کچھ سفید اور کچھ سیاہ، دبیز عینک کے پیچھے سے چمکتی ہوئی روشن آنکھوں والے وجیہ و شکیل شارب کا اصل نام مسیب عباس ہے، لیکن وہ ڈاکٹر ایم عباس شارب ردولوی کے نام سے مشہور ہیں۔ آج سے 56 سال قبل وہ یکم ستمبر 1935 ءمیں ضلع بارہ بنکی کے مقام ردولی میں پیدا ہوئے، جہاں کے مشہور افسانہ نگار محمد علی ردولوی آج بھی

اردو ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید ہیں۔ شارب نے ثانوی تعلیم رودولی اور کانپور میں حاصل کی 1957ء میں لکھنو یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور 1965ء میں "جدید اردو تنقید، اصول اور نظریات" کے موضوع پر سید احتشام حسین کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس پیش کی۔

شارب کی ادبی زندگی کا آغاز شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ شکل و صورت اور ڈیل ڈول سے بھی وہ نقاد سے زیادہ شاعر معلوم ہوتے تھے۔ چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھے کہ ماحول کے زیر اثر شعر کہنا شروع کیا اور شارب اپنا تخلص تجویز کیا۔ اعظم گڑھ کے کلاس ٹیچر مولوی حبیب الرحمان نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کے باعث وہ باقاعدگی سے شعر کہنے لگے شارب کے شعری ذوق کو نکھارنے میں گھریلو ماحول کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے پھوپا نیرؔ سلطان پوری اچھے شاعر تھے اور مجروح سلطان پوری اور اقبال عظیم کا ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ بلکہ تینوں کی تثلیث کافی مشہور تھی، چنانچہ ان کے کان میں مسلسل اشعار گونجتے رہے۔ شارب نے جب 53ء میں لکھنو یونیورسٹی مین داخلہ لیا تو وہ اس وقت تک مشہور شاعر بن چکے تھے۔ چنانچہ مشاعرے میں باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی تھی۔

انہوں نے 1950ء کی دہائی میں ہی نثر نگاری شروع کر دی تھی چنانچہ ان کا پہلا مضمون 52/53ء میں روزنامہ "سیاست" کانپور میں شائع ہوا جو ہندوستان میں اردو کی صورتحال کے بارے میں تھا۔ اس کے بعد وہ "نیا دور" لکھنو "قومی آواز" (لکھنو) اور ہفت روزہ "آثار" (کلکتہ) میں باقاعدگی سے ادبی و علمی مضامین لکھتے رہے۔ ان کی پہلی کتاب 1951ء میں "مراثی انیس میں ڈرامائی عنصر" کے نام سے شائع ہوئی، جو دراصل ایم اے کا مقالہ تھا اور جسے انہوں نے احتشام حسین کی رہنمائی میں لکھا تھا۔ شارب کی دوسری کتاب "گل صد رنگ" تھی جو 1960ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل زندہ غزل گو شعرا کا انتخاب تھا۔ جس کا انہوں نے بہت ہی تفصیلی مقدمہ لکھا تھا۔ اس انتخاب کی تقلید میں کئی انتخابات شائع ہوئے، لیکن معیار کے اعتبار سے کوئی بھی انتخاب اس بلندی تک نہیں پہنچا۔ ان کی تیسری کتاب 1961ء میں "جگر، فن اور شخصیت" کے نام سے شائع ہوئی، جس میں انہوں نے جگر کے شعری مقام اور شاعرانہ حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی تھی۔ چوتھی کتاب 1960ء میں مرزا محمد رفیع سودا پر "افکار سودا" کے نام سے شائع ہوئی ان کی پانچویں اور سب سے اہم کتاب "جدید اردو تنقید، اصول اور نظریات" 1968ء میں شائع ہوئی۔ جو اگرچہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، لیکن جو اپنے معیار، پھیلاؤ، وسعت اور افادیت کے اعتبار سے ڈاکٹریٹ کے عام مقالات

سے کہیں بہتر ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس کے ابھی تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد شارب کی مزید دو کتابیں، "مطالعہ دلی" (1974) ء اور "تنقیدی مطالعے" (1948) ء میں شائع ہوئیں اور وہ اس وقت "نقاد اور تنقید" کے عنوان سے ایسی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں حالی اور شبلی سے لے کر 70 ء کی دہائی کے رجحان ساز ناقدین کی تنقید کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔

وہ 1961 ء سے درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہنے کے باوجود آج بھی صرف ریڈر ہیں ورنہ ان کے بہت سے جونیئر رفقا توڑ جوڑ اور زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہیں۔ ایک بار دہلی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر شپ کی گنجائش نکلی۔ انہوں نے اس کے لئے درخواست دی، ان کے مقابلے میں جتنے بھی امیدوار تھے۔ وہ ان میں تصانیف کی تعداد اور تجربے کے اعتبار سے زیادہ اہل اور تجربہ کار تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ اس عہدے کے لئے ضرور منتخب کر لئے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور ان کی جگہ ایک ایسا شخص منتخب کر لیا گیا جو ان سے زیادہ بااثر اور بارسوخ تھا۔ سب سے افسوس ناک واقعہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے ایک ہم پیشہ ادیب اور ناقد کو اس کی اطلاع دی اور توقع ظاہر کی کہ وہ اس ضمن میں ان کی مدد کریں گے۔ لیکن یہ جادو بیان مقرر، معلم، اور نقاد جو خود بھی ایک باوقار دانش گاہ میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس عہدے کا امیدوار بن گیا اور اسے طویل عرصے تک ڈھوکے میں رکھا اور جب شارب کو اس فریب کا علم ہوا تو اتنا ذہنی صدمہ پہنچا کہ وہ کئی ماہ تک پڑھنے لکھنے سے معذور ہو گئے۔ اس کے باوجود شارب آج بھی ان سے ہمیشہ کی طرح ملتے ہیں۔ بیمار پڑنے پر ان کی عیادت کے لئے جاتے ہیں اور ان پر قطعی ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ ان کی وجہ سے انہیں کس قدر جذباتی صدمہ پہنچا تھا۔ یہ ہے شارب ردولوی کی اعلیٰ ظرفی۔

شارب اور شمیم بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ سادہ کھاتے ہیں، سادہ پہنتے ہیں اور ہندوستان کے متوسط طبقے کے لوگوں کی طرح سادہ زندگی گزارتے ہیں ان کی زندگی میں قطعی نمائش اور دکھاوا نہیں۔ شمیم نکہت نے اگرچہ تدریسی ضرورت کے تحت احتشام حسین کی نگرانی میں "پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کر لیا ہے لیکن وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور 58_57 ء سے باقاعدگی سے افسانہ لکھ رہی ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے پچاس سے زیادہ افسانے لکھے ہیں جو اردو کے موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "دو

ادھے" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ہفت روزہ "عوامی دور" میں "مٹر پلاؤ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ اس کی اشاعت کے چند دنوں کے بعد اس کا ہندی ترجمہ مشہور ہفت روزہ "ہندوستان" میں شائع ہوا وہ اس وقت ایک ناول لکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ شارب ردولوی سے 1965ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئیں اور گذشتہ بیس سال سے ریڈر کی حیثیت سے پڑھا رہی ہیں۔

اس روز میں شارب اور بھابی شمیم سے بہت رات تک ادبی اور نجی گفتگو کرتا رہا اور دوسرے روز صبح جوگندر پال کے ہاں منتقل ہو گیا۔

جوگندر پال کی کہانی

جوگندر پال پہلے ہی میرے منتظر تھے، چنانچہ میں جب شمس الزمان کے ساتھ ان کے ہاں پہنچا تو انہوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا اور میرا سوٹ کیس خود اٹھا کر گیسٹ روم میں لے گئے۔

جوگندر پال جس محلے میں رہتے تھے وہ کالکا جی کے نام سے مشہور تھا اور نئی دہلی کے مضافات میں واقع گریٹر کیلاش کا حصہ تھا اور چترنجن پارک کے قریب تھا۔ یہ علاقہ دہلی ڈیولپ مینٹ اتھارٹی کے تحت زیر تعمیر تھا اور نئے نئے فلیٹس تعمیر ہو رہے تھے، لیکن یہ علاقہ عرف عام میں کالکاجی کے نام سے ہی مشہور تھا۔ کالکا جی دراصل کالکا مندر کا نام تھا، جو تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ ہندو عقیدے کے مطابق درگا کے تین روپ ہیں۔ اول، مہا کالی، دوم مہا لکشمی، اور سوم سرسوتی، مہا کالی ان تینوں میں سے ایک روپ ہے۔ جس کے نام پر کالکا جی کا مندر ہے۔ عہد تغلق میں جب ابن بطوطہ نے دہلی کا سفر کیا تو اس نے بھی یہ مندر دیکھا تھا اور اپنے سفر نامے میں اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ مندر 1821 ر بکرما جیت میں بنوایا گیا تھا۔ اسے محمد اکبر شاہ بادشاہ ثانی کے عہد میں راجہ کیدار ناتھ نے تعمیر کروایا تھا۔ جو وزارت میں پیش کار تھے۔ اس کے گنبد کا آرٹ ہندو مسلم فن تعمیر و مصوری سے بہت مشابہ ہے۔ اس مندر کے آگے دو سنگ سرخ کے شیر اور ایک ترشول بنا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ایک بڑا گھنٹہ بھی آویزاں ہے جسے بجا کر لوگ "دیوی جی کی جئے" بولتے ہیں۔ مندر میں شب و روز بارہ مہینے گھی کی جوت جلتی رہتی ہے اور اس کا بجھنا برا شگون تصور کیا جاتا ہے۔

جوگندر پال کے گھر میں بڑی اپنائیت کا احساس ہوا، ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے گھر میں آگیا ہوں۔ میرا کرشنا بھابی سے پہلے ہی پاکستان میں تعارف ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی بڑی محبت اور خنداں پیشانی سے میرا استقبال کیا اور اپنے بچوں امیت، بہو سنیتا اور اپنی پوتی سے تعارف کرایا۔

جوگندر پال کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر اور چھوٹا بیٹا آرکیٹک ہے۔ چھوٹا بیٹا امیت، پال جی کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ پال جی کی بہو سنیتا، مشہور افسانہ نگار اور شاعر بلراج کومل کی بیٹی ہیں،

ہ اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ جوگندر پال اور بلراج کومل باہم سمدھی ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ دونوں ادیبوں نے اپنے بچوں کی آپس میں شادی کی ہے۔ پال جی کا بڑا بیٹا اپنی بنگالی بیوی کے ساتھ امریکہ میں آباد ہے۔ پال جی کی بیٹی شوکریتا بھی مشہور مصور اور انگریزی کی مصنفہ اور انگریزی ماہنامہ اسپان اور دوسرے انگریزی رسائل میں علمی و ادبی موضوعات پر مضامین لکھتی رہتی ہیں۔ وہ اگرچہ اردو میں نہیں لکھتیں، لیکن وہ اردو زبان اور رسم الخط سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کرشنا بھابی اگرچہ اردو لکھ نہیں سکتیں، لیکن وہ اردو اچھی طرح پڑھ لیتی ہیں اور ہندی اور انگریزی میں مضامین لکھتی ہیں۔ جوگندر پال کے زیادہ تر افسانوں کے ہندی تراجم کرشنا بھابی نے ہی کئے ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ میں انگریزی ادب پڑھاتی ہیں۔ میں جوگندر پال کے گھر کا علمی اور ادبی ماحول دیکھ کر بڑا متاثر ہوا خصوصاً کرشنا بھابی کی پر کشش شخصیت نے گہرا اثر مرتب کیا اور یہ امر سمجھ میں آیا کہ جوگندر پال کے جوگندر پال بننے میں کرشنا بھابی کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے ادیب، شاعر اور فن کار پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے پیچھے جو شخصیت کارفرما رہی ہے۔ وہ ان کی رفیقہ حیات ہی ہے۔ اس کے سہارے کے بغیر ان کا بڑا ادیب اور فن کار بننا آسان نہیں تھا۔ کرشنا پال بھی جوگندر پال کی پشت پر رہی ہیں اور انہوں نے شوہر کی خوشی اور خوشنودی کے لئے وہ سب کچھ کیا جس کی پال جی نے خواہش کی۔ اگر کرشنا بھابی دوسری دنیادار اور اسٹیٹس کانشش عورتوں کی طرح ہوتیں تو شوہر کو محض روپے پیدا کرنے والی مشین میں بدل دیتیں اور وہ پال جی کو ہرگز کل وقتی ادیب بننے نہ دیتیں لیکن جوگندر پال کی طرح کرشنا پال بھی عام عورتوں کی طرح جاہ طلب نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد پال جی نے اورنگ آباد کے کالج کی پرنسپل شپ سے استعفیٰ دے کر صرف برطانوی حکومت کے پینشن پر گزارا کرنے اور کل وقتی مصنف بننے کا فیصلہ کیا تو کرشنا بھابی نے اس کی مخالفت نہیں کی، بلکہ پال جی کی حوصلہ افزائی کی، ان کا دل و جان سے ساتھ دیا اور ضروریات زندگی کو ممکنہ حد تک گھٹا کر انتہائی سادہ اور قناعت پسندی کی زندگی گزارنا پسند کی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پال جی کے گھر کا ہر فرد حصول روزگار میں مصروف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی بہو سنیتا بھی، ہر روز صبح سات بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر اسکول چلی جاتی ہیں۔ اس کے بعد امیت اپنے دفتر روانہ ہوتے ہیں اور اس کے بعد کرشنا بھابی کے جامعہ ملیہ جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ پال جی گھر پر تنہا رہ جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی پوتی، اس کی آیا اور گھریلو ملازم، جو گھر

کا سارا کام کرنے کے علاوہ کھانا پکانے کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ پال جی دن بھر پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جوگندر پال، کرشن چندر کے بعد اردو کے دوسرے ادیب ہیں جنہیں کل وقتی ادیب کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے انہیں بڑی تیاگ اور تپسیا کرنی پڑی ہے جوگندر پال طبعاً درویش صفت واقع ہوئے ہیں۔ انہیں روپے پیسے کمانے یا سماجی حیثیت منوانے کی کبھی خواہش نہیں رہی، وہ ایک سچے ادیب کی طرح ہمیشہ ان باتوں سے دور رہے اور تصنیف اور تخلیق کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پینشن پر گزارا کیا اور اپنا تمام وقت لکھنے پڑھنے کے لئے وقف کر دیا۔

میں جوگندر پال کے ہاں جتنے دن رہا، ان سے یہی جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ انہوں نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کس طرح کیا۔ جوگندر پال نے اس بارے میں بتایا۔

"میں ستمبر 1925ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ میں نے ابتدائی تعلیم گنڈا سنگھ ہائی سکول میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم مرے کالج، سیالکوٹ سے۔ بی، اے تک میری تعلیم میں تسلسل رہا۔ اس کے بعد دو ایک سال کے لئے ادھر ادھر کام کرتا رہا۔ پھر ملک کی تقسیم ہو گئی اور ہم لوگ انبالہ آ گئے انبالہ میں بھیاں جی، یعنی میرے والد صاحب نے دودھ کی دکان کھول لی اور ڈیری فارم قائم کیا۔ وہ دودھ خرید کر مکھن نکالتے تھے اور میں مکھن کی پیکٹ بیچا کرتا تھا۔ اس وقت تو سب سے بڑا مسئلہ وجود کو برقرار رکھنا تھا۔ چنانچہ میں نے پڑھائی چھوڑ رکھی تھی۔ یہاں آ کر میں ان کی دودھ کی دکان میں کام کرنے لگا۔ اس وقت میں ایم اے انگلش کا سٹوڈنٹ تھا۔ میں صبح ہونے سے قبل تاروں کی چھاؤں میں سائیکل لے کر نکل جاتا۔ بیس سیر دودھ کا کین ایک طرف اور بیس سیر دودھ کا کین دوسری طرف رکھ کر تقریباً دو ڈھائی بجے رات کو نکل جاتا اور قریب کے گاؤں سے دودھ بھر کر لانا میرا روز کا معمول تھا۔ دودھ لے کر میں صبح پانچ چھے بجے گھر پہنچتا تھا۔ تیس چالیس کیلو میٹر کی ہماری روز سائیکلنگ ہوا کرتی تھی۔ ہمارا ایک سال اس طرح گزرا۔ پھر میں کینیا چلا گیا۔ وہ اس طرح کہ میری ہونے والی بیوی کے ماں باپ بر کی تلاش میں انبالہ آئے ہوئے تھے۔ ہم ان کے ساتھ بر ڈھونڈتے رہے۔ بر کی تلاش میں ہم نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ انہیں لڑکا بالآخر مل گیا۔ وہ لڑکا میں تھا۔ انہیں میں اس لئے پسند آ گیا کہ انہیں ایک ایسا ضرورت مند لڑکا چاہیئے تھا جو ان کے ساتھ کینیا جا سکے۔

میں اب بھی اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ لوگ تو بیوی کی ڈولی لاتے ہیں، تم میری ڈولی لے

جاؤں یا جزوی پینشن لے کر ہندوستان واپس چلا جاؤں یا انگلینڈ میں جا کر آباد ہو جاؤں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے وطن واپس جانے کا موقع فراہم کر دیا۔ میں نے فوری طور پر استعفیٰ دے دیا اور کرشنا کو بعد میں آکر بتایا کہ کہیں وطن واپس جانے میں رکاوٹ کھڑی نہ ہو جائے اور سب لوگ مخالفت نہ کرنے لگیں۔ اس کے بعد بھی اسکول والوں نے کئی ماہ روکے رکھا۔

جہاں تک کہانی نویسی کا تعلق ہے۔ میں کہانی ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی لکھ رہا تھا۔ وہاں جانے کے بعد بھی میں نے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ فن کار بننے کے لئے آپ کے ہاں ضروری ہے کہ اداسیوں کا امکان بنا رہے۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ آپ کی ذلتوں کا بھی امکان بنا رہے اور اس سے آپ اداس ہو جائیں اور اداسیوں میں آپ کے ہاں، فیلو شپ جو ہوتی ہے دنیا کے ساتھ وہ قائم رہے۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو یہ سمجھئے کہ میں نے اپنی کشتی جلا ڈالی تھی۔ ہندوستان واپس جانے کا سوال نہیں تھا۔ یہاں آکر ہم دہلی میں جب دو چار ماہ رہے تو یہاں کی لائف کو نسبتاً مشکل پایا۔ اس وقت میرے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اسکول جانے کے لئے صبح سویرے نکل جاتے اور شام کو گھر واپس آتے۔ میں نے سوچا کہ چھوٹے شہر میں جا کر رہنا چاہئے۔ سلیمان اریب حیدر آباد میں رہتا تھا اور ماہنامہ "صبا" نکالتا تھا۔ اس نے مجھے لکھا کہ آپ یہاں آجائیں عثمانیہ یونیورسٹی میں گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس نے ایک ہی خط لکھا تھا کہ ہم سامان اٹھا کر وہاں چلے گئے۔ وہاں گئے تو چھ سات روز سلیمان اریب کے ہاں رہے۔ وہ بے چارا روز ناشتے میں انڈے منگواتا اور کھانے کا اہتمام کرتا۔ ہمیں پتا نہیں تھا کہ اسے کیا دقتیں پیش آ رہی ہیں، لیکن جب پتا چلا کہ وہ تو روز کے روز کمائی کرتا ہے۔ تو ہم نے جلدی سے الگ ہونے کا بندوبست کیا۔ وہاں حیدر آباد میں تقریباً چار پانچ مہینے رہا، اس انتظار میں کہ شاید نوکری مل جائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ سے ملا تو انہوں نے کہا کہ آپ باہر سے پڑھا کر آئے ہیں۔ ہم آپ کو رکھ لیں گے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے جب میرا بائیو ڈیٹا دیکھا تو کہا کہ "آپ بی اے میں تھرڈ کلاس ہیں۔ یہاں قانون ہے کہ ڈگری کم سے کم سیکنڈ کلاس ہو۔ ہم انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ بیرون ملک اتنے سال پڑھا چکے ہیں۔ ہمارا یہ تعلیمی بیک گراؤنڈ ہے اور آپ ہم سے ڈگری کی باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی باتوں سے میرا حوصلہ ٹوٹ گیا اور میں اداس ہو کر گھر واپس آگیا۔ گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک شریف آدمی بیٹھا ہوا ہے اور میری بیوی اس سے اونچی آواز میں کہہ رہی ہے "نہیں، نہیں، صاحب ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ میرے بچے یہاں اسکول میں داخل ہو

گئی۔ان دنوں میرے پتاجی کا انتقال ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد میں یہاں اپنی بہن کی شادی کر کے اپنی ماں کو ساتھ لے کر کینیا چلا گیا۔ وہاں جا کے ایک سال تک میرے اندر احساس جرم پرورش پاتا رہا۔ وہ یہ کہ بہن کی شادی کے فوراً بعد مجھے نہیں آنا چاہیئے تھا۔ ایک طرح سے باپ کی موت کے بعد مجھے اس کا احساس ہونے لگا تھا کہ اگر میری بہن خوش نظر نہ آئے تو یہ میری ذمے داری تھی کہ میں وہاں رہتا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا ہلکا سا اظہار کیا تھا۔ میرے خسر نے کہا کہ جہاز کی روانگی بند ہونے والی ہے۔ اس لئے فوراً یہاں سے چلو۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ مجھے جلدی سے یہاں سے لے جائیں۔ میرے جانے کے ایک سال کے بعد میری چھوٹی بہن کی ڈیلیوری کیس میں موت واقع ہوئی۔ ہم یہاں ہوتے تو بھی وہ مر جاتی، لیکن مجھے یوں لگا کہ ڈیلیوری کے وقت مجھے یہاں رہنا چاہیئے تھا۔ وہاں پہنچ کے کینیا میں مجھے ایسا لگا جیسے وہاں میرا عارضی قیام ہے۔ اسی احساس میں چودہ سال گزر گئے۔ میں اس مدت کو ایک طرح سے اپنا بن باس تصور کرتا ہوں۔

یہاں ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے تھے۔ دوست احباب، رشتے دار، بہن بھائی، ماں باپ سب ساتھ تھے۔ سیالکوٹ میں بھی اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ ہم غریب تھے۔ خطرناک حد تک غریب۔ اپنے وطن کا ماحول ایسا تھا کہ اپنے محلے میں داخل ہو جاتے تھے تو یوں لگتا تھا۔ جیسے اپنے گھر کے آنگن میں آگئے ہیں۔ یہاں محبتیں تھیں، اپنائیت تھی۔ اگرچہ ماں میرے ساتھ تھی، لیکن وہ بھی دکھی تھی۔ اسے اس کا افسوس تھا کہ میں بیٹی کو تنہا چھوڑ آئی ہوں۔

کینیا سے میں 1955 میں ہندوستان واپس آیا۔ اس خیال سے کہ اب واپس نہیں جاؤں گا۔ کینیا میں میں اسکول ماسٹر تھا اور میں ہندوستان سے ایم اے کی تعلیم چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اگر یہاں ایم اے کر لوں تو ہندوستان میں رہنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے 1955ء میں تین چار مہینے سر توڑ کوشش کر کے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا، لیکن روانگی کے وقت پھر بستر باندھ کر تیار ہو گیا، کیوں کہ حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ وہاں کی نوکری چھوڑ کر یہاں معمولی تنخواہ پر کام کروں۔ دوسری دفعہ میں 1960ء میں آیا۔ اس وقت تک حالات مزید بہتر ہو چکے تھے۔ تنخواہ مزید بڑھ گئی تھی۔ میں ترقی کر کے ایجوکیشن آفیسر بن چکا تھا۔ اندر سے خواہش تھی کہ کسی طرح ہندوستان واپس چلا جاؤں۔ وہاں جی بھی نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن میں ہندوستان آکر ڈر سے پھر واپس چلا گیا۔ بالآخر 63ء میں جب کینیا کو آزادی ملی تو کینیا کی گورنمنٹ نے اوپشن دیا کہ یا تو اگریمنٹ کر کے وہاں رہ

چکے ہیں، ہم یہیں رہیں گے۔

انہوں نے مجھے دیکھا تو مخاطب ہو کر کہا "ملازمت کے سلسلے میں آپ کے شعبہ انگریزی کے سربراہ سے جو بات چیت ہو رہی تھی۔ تو میں وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے لیکچرر کے عہدے کے لئے نہیں بلکہ پروفیسر کے عہدے کے لئے آدمی چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہمیں ہر لحاظ سے سوٹ کرتے ہیں۔ آپ آئیے اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو سنبھال لیجئے۔ دیکھئے کہ زندگی میں اتفاقات کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہم ان کے کالج میں گئے تو انہوں نے گورننگ کونسل سے رسمی انٹرویو کا بندوبست کیا اور مجھے اپوائنٹ مینٹ مل گیا۔ میں نے وہاں کام شروع کر دیا اور ایک سال کے بعد مجھے کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

جیسا کہ اس سے قبل کہہ چکا ہوں۔ میں نے 43۔1942ء میں کالج میگزین میں لکھنا شروع کیا تھا۔ 1944ء میں شاہد احمد دہلوی نے جب اپنے رسالے "ساقی" میں میرا افسانہ "تیاگ سے پہلے" چھاپا تو خوشی کے مارے میری باچھیں کھل گئیں۔ میں ابھی تک اس کا عنوان نہیں بھولا۔ اس وقت میری عمر بائیس تئیس سال تھی۔ اس عرصے میں "ساقی" کے علاوہ "آج کل" اور دوسرے رسائل میں چھپتا رہا۔ اس دور میں میں زیادہ باقاعدگی سے کہانیاں نہیں لکھتا تھا۔ کینیا میں ریڈیو اسٹیشن سے اردو میں کہانیاں نشر کی جاتی تھیں، چنانچہ میں گاہے گاہے کہانیاں لکھتا رہا۔ پھر میں ریگولر لکھنے لگا، لیکن میں اس دور کی کہانیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ 1955ء کے بعد میں نے وہاں کے تعلق سے افریقی کہانیاں لکھیں۔ 1960ء میں جب ہندوستان آیا تو میں نے یہاں افریقہ کی زندگی کے تعلق سے ایک دو کہانیاں پڑھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ میری کہانیوں میں شریک ہو رہے ہیں۔ کرشن چندر نے میری کہانیاں پڑھ کر مشورہ دیا کہ میں پوری کتاب چھپواؤں۔ اس کتاب کا دیباچہ خود کرشن چندر نے لکھا میری ایک ہی کتاب ہے جس میں دیباچہ شامل ہے۔ اس کتاب کا نام "دھرتی کا کال" ہے۔ اس کے بعد کہانی میری آدبسیشن ہوتی چلی گئی۔ جوں جوں میں لکھتا گیا توں توں مجھے محسوس ہوا کہ میں بنا ہی اس کام کے لئے ہوں۔ یا کہانی بن جاؤں یا کہانی لکھوں۔ ایک معصوم سی خواہش تھی کہ ہندوستان آئیں گے تو گزر اوقات کے لئے میری چھوٹی سی پینشن کافی ہو گی۔ تو ہم صرف کہانیاں لکھا کریں گے۔ فری لانسنگ کریں گے۔ پھر وہ معصومیت آئیڈیلزم معلوم ہوئی۔ لندن سے ایک روز خط موصول ہوا کہ میری پینشن فل کر دی گئی ہے۔ اس طرح میری پینشن کی رقم تقریباً اتنی ہو گئی جتنی میری تنخواہ تھی چنانچہ میں نے سوچا کہ دو تنخواہیں لے کر ہم کیا کریں گے۔

ہم اتنے دنوں تک اپنے آپ سے کہتے رہے ہیں کہ اگر موقع ملا تو صرف لکھیں گے۔ پڑھیں گے اور ملازمت نہیں کریں گے۔ خدا جب موقع دے رہا ہے تو اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے؟ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پرنسپل شپ سے استعفیٰ دے کر یہاں سے نکل بھاگنا چاہیئے۔ میں نے پرنسپل شپ 76ء میں چھوڑنا چاہا تھا۔ لیکن اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر میں نے کام چھوڑ دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی بالکل مجہول سی ہو کر رہ جائے۔ بہتر ہے کہ پہلے ایک سال بلا تنخواہ چھٹی لے کر دیکھیں کہ کیسا محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دہلی آگئے۔ ایک سال بلا کام کاج کئے گزارا تو ٹھیک ہی لگا۔ زندگی میں کوئی گڑبڑ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے استعفیٰ دے دیا۔

میں جون 78ء میں مستقل طور پر دہلی آگیا۔ اس وقت سے اب تک میرا کام آوارگی کرنا، لکھنا پڑھنا اور سیر و سیاحت کرنا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں، میرے دوست کہ جب آپ کے پاس کوئی منصب ہوتا ہے۔ کوئی اسٹیٹس ہوتا ہے تو وہ کئی اعتبار سے آپ کے فن کو نقصان پہنچاتا ہے وہ یوں کہ لوگ اپنے مطلب کی خاطر، آپ کے منصب کی وجہ سے یا مرعوب ہو کے آپ سے غلط مسلط باتیں کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اداسیوں اور ناکامیوں کا جو امکان بننا چاہیئے۔ وہ نہیں بن پاتا ہے۔ اس لئے آپ کو اگر فن کی طرف جھکنا ہے تو نہایت ضروری ہے کہ آپ اپنے سارے تمغے اور امتیازی نشانیاں اپنے سے الگ کر دیں اور آپ بالکل ایک سادہ سے، درویش سے بن جائیں اور صعوبتوں کو قبول کرنے کے لئے ہاتھ پھیلائیں اور اس آدمی کے بارے میں لکھنا ہے، دکھوں کے بارے میں لکھنا ہے، اب میرے لئے ان دکھوں میں پوری طرح شریک ہونے کا سماں بندھ گیا ہے۔ آپ جب تک اس کے وسیلے نہ پیدا کریں گے میں سمجھتا ہوں آپ کے لئے فن کار کی حیثیت سے رہنا مشکل ہے۔"

شمیم حنفی کے گھر پر

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کر شنا بھابی جامعہ ملیہ میں انگریزی کی لیکچرر تھیں اور وہاں روز پڑھانے کے لئے جاتی تھیں۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں شمیم حنفی سے ملنے اور ساتھ ہی جامعہ ملیہ دیکھنے کا خواہاں ہوں تو وہ مجھے ایک دن رکشا پر اپنے ساتھ جامعہ ملیہ لے گئیں اور میں بہت ہی اشتیاق اور تجسس کے ساتھ ان کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں میں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور اس دانش گاہ اور اس کے معماروں کا میرے دل میں بڑا احترام تھا خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ایم مجیب اور ان کے رفقائے کار کا۔ اس کی اصل وجہ ہندوستانی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم اور جدوجہد آزادی میں اس دانش گاہ اور اس کے زعما کی بے لوث خدمات اور قربانیاں تھیں۔ برصغیر میں یوں تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی سب سے بڑی دانش گاہ تھی۔ جس کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی محض ایک دانش گاہ نہیں، بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی، فکری اور تہذیبی تحریک بھی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی سے قبل علی گڑھ یونیورسٹی مسلمانوں میں برٹش امپیریلزم کے وفادار مسلمان سول سرونٹ پیدا کرنے والا سب سے بڑا موثر اور فعال ادارہ تھا اور یہاں مسلمان امراو رؤسا کی جو اولادیں اعلیٰ ڈگریوں کے ساتھ پڑھ لکھ کر نکلتی تھیں۔ ان کا کام صرف اور صرف برطانوی سامراج کی جی حضوری کرنا اور انڈین سول سروس کے مقابلوں میں حصہ لے کر اعلیٰ ترین عہدے حاصل کرنا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کو سامراج دشمن جدوجہد میں حصہ لینے سے روکے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس درس گاہ میں ایسے عناصر کو قطعی برداشت نہیں کیا جاتا تھا جو برطانیہ دشمن یا بائیں بازو کے رجحانات رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا محمد علی جوہر اور علی گڑھ یونیورسٹی کے اس دور کے کارپردازوں سے اختلافات پیدا ہوئے اور انہوں نے علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کر کے ڈاکٹر ذاکر حسین اور دوسرے ہم خیال رفقا

کے اشتراک سے دلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک ایسی دانش گاہ کی داغ بیل ڈالی جو مسلمانوں میں صرف اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہی نہیں کرتی ہو بلکہ آزادی اور وطن پرستی کی جوت بھی جگاتی ہو۔ اس دانش گاہ کے قیام اور تعمیر و تشکیل میں ان زعما نے جس طرح خون پسینہ بہایا اور جرمنی اور برطانیہ سے اعلیٰ ترین تعلیمی سندیں حاصل کرنے کے باوجود اعلیٰ سرکاری عہدے قبول کرنے کے بجائے جس طرح تیس روپے پینتس روپے اور چالیس روپے ماہانہ مشاہرے پر درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا وہ ناقابل یقین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشنا بھابی نے جب بتایا کہ وہ جامعہ ملیہ جارہی ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ جانے کے لئے فوراً آمادہ ہوگیا۔ کرشنا بھابی جامعہ ملیہ جانے سے قبل مجھے لے کر شمیم حنفی کے ہاں پہنچ گئیں۔ قرۃ العین حیدر۔ شمیم حنفی کے پڑوس میں رہتی تھیں اور ان کی آمد کا مقصد قرۃ العین کی موجودگی کے بارے میں ان سے معلوم کرنا بھی تھا۔ دراصل میں قرۃ العین حیدر سے خاص طور پر ملنے کا مشتاق تھا اور کرشنا بھابی کا خیال کہ شمیم حنفی ہی اس بارے میں صحیح معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔

شمیم حنفی اور قرۃ العین حیدر پنج ستارہ ہوٹل ا ہوٹل سوریہ" کے مقابل واقع عظیم الشان ٹاور میں رہتے ہیں۔ شمیم حنفی میری اور کرشنا بھابی کی اچانک آمد سے بوکھلا گئے اس لئے کہ کشور ناہید ان کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں اور وہ ان کے ساتھ فوراً باہر نکلنے والے تھے۔ ہم دونوں کی بلائے ناگہانی کی طرح آمد سے ان کا پریشان ہو جانا لازمی تھی (وہ صبح سویرے کسی مہمان کی آمد کے متوقع نہ تھے۔) ہم دونوں جس طرح ان کے ہاں اچانک وارد ہوئے اس سے میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ نہ میں وہاں سے بھاگ سکتا تھا اور نہ وہاں ٹھہرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں شمیم حنفی کو باقاعدہ پڑھتا رہا تھا۔ وہ اردو کے نئے ناقدین میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ میں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جاؤں اور میزبان کو ذہنی کوفت سے نجات دلاؤں۔ بالآخر چائے کی گھونٹ جلد از جلد حلق سے اتاری اور کرشنا بھابی کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ گیارہ بجے جامعہ ملیہ کے شعبہ انگریزی میں کشور ناہید کا استقبالیہ ہے۔

جامعہ ملیہ اپنی عمارتوں کے اعتبار سے کراچی یونیورسٹی یا ہندوستان کی دیگر جدید یونیورسٹیوں کی طرح عظیم الشان تو نہیں ہے البتہ اپنی وسعت کشادگی سادگی اور تعلیمی معیار کے اعتبار سے بہت اہم ہے اور حکومت ہند نے اسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو اس وقت جامعہ میں گرمی کی تعطیل ہو چکی تھی۔ تدریسی سلسلہ بند تھا البتہ عملہ روز صرف حاضری دینے کے لئے آتا تھا

۔ کرشنا بھابی مجھے سیدھے اپنے انگریزی کے شعبے میں لے کر پہنچیں ۔ وہاں معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر میں کشور ناہید آنے والی ہیں ۔ میں جامعہ ملیہ کی لائبریری دیکھنے کے لئے چلا گیا ۔ وہاں سے ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ کشور ناہید محفل سے خطاب کر رہی ہیں اور شعبہ انگریزی اور دوسرے شعبوں کے اساتذہ ان سے پاکستان میں عورتوں کی حالت زار کے بارے میں سوالات پر سوالات کئے جا رہے ہیں ان میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی ۔ پاکستان میں جب سے ضیاالحق کے اسلامی نظام کے قیام کا اعلان ہوا ہے اور پارلیمینٹ میں دیت اور حدود آرڈی نینس منظور ہوا ہے ۔ ہندوستان میں عام تاثر یہ ہے کہ پاکستان میں عورتیں برقعہ کے بغیر قطعی باہر نہیں نکلتی ہیں اور عورتوں کو گھروں میں قید کر دیا گیا ہے ۔ یہ تاثر پیدا کرنے میں جہاں ہندوستانی اور عالمی ابلاغ عامہ کا ہاتھ ہے ۔ وہاں خود ہمارے کٹھ ملاؤں نام نہاد سیاسی اور دینی جماعتوں اور ہمارے اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بھی ہاتھ ہے ۔ جو آئے دن حدود آرڈی نینس میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں ۔ کشور ناہید شاعرہ سے زیادہ پاکستان میں تحریک نسواں کی چیمپین بنی ہوتی تھیں اور عورتوں کے حقوق کی مدافعت میں بیان دے رہی تھیں اور ان کے بغل میں فہمیدہ ریاض بیٹھی گاہے گاہے ان کی تائید کر رہی تھیں ۔ ان دونوں شاعرات سے ادبی گفتگو ہوئی یا نہیں یہ تو معلوم نہ ہو سکا ۔ اس لئے کہ میں تاخیر سے حاضر ہوا تھا ۔ البتہ اتنا معلوم ہوا کہ کشور ناہید سے چند نظمیں سنی گئیں ۔ زیادہ تر باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں اور اساتذہ کی اکثریت یا تو اردو سے ناواقف تھی یا انگریزی میں گفتگو کرنا باعث افتخار سمجھ رہی تھی البتہ کشور ناہید کی گفتگو اور بعد میں پاکستانی شعرا کے اعزاز میں دی جانے والی ضیافتوں اور کاک ٹیل پارٹیوں میں پاکستانی خواتین کی جرات رندانہ نے ثابت کر دیا کہ پاکستان میں خواتین بالکل آزاد اور خود مختار ہیں ۔ کم از کم اعلیٰ طبقے کی خواتین ۔

اردو بازار میں

میں جب تک جوگندر پال کے ہاں رہا۔ وہ شمس الزماں کی کار پر مجھے مختلف ادیبوں سے ملانے کے لئے لے جاتے رہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ دھلی کو گائیڈ اور رہبر کے بغیر ہی گھوم پھر کر دیکھنا چاہیے۔ اس لئے کہ صرف اسی طرح میں دھلی کی گلی کوچوں کو زیادہ قریب سے دیکھ سکوں گا۔ دھلی کے بارے میں بہت کچھ پڑھ اور سن رکھا تھا اور اس کی وسعت اور خوبصورتی سے متاثر بھی تھا لیکن میں تنہا دھلی کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ کسی رہبر کے بغیر تاکہ میں اس کے بارے میں اپنا ذاتی تاثر قائم کر سکوں۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ میں کہیں اس وسیع وعریض شہر میں گم نہ ہو جاؤں لیکن اس بات کا یقین تھا کہ اگر میں گم ہو بھی گیا تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ مجھے جوگندر پال کے مکان کا پتہ یاد ہے۔ میں پوچھتے ہوئے پہنچ جاؤں گا اور پھر میں کلکتے اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں رہ چکا تھا۔ اس لئے میرے لاپتہ ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ چنانچہ میں دوسرے روز جوگندر پال سے اجازت لے کر تنہا باہر نکل گیا اور چترنجن پارک سے اومنی بس پر سیدھے اردو بازار پہنچا۔

اردو بازار اور جامع مسجد کے بارے میں بہت کچھ پڑھ اور سن چکا تھا۔ اس لئے اسے دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ ایک اردو بازار کراچی میں اور دوسرا اردو بازار لاہور میں بھی تھا۔ ان دونوں اردو بازاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں شہر کی اردو کتابوں کی تمام اہم دکانیں مرتکز تھیں اور شاید اسی لئے اس کا نام اردو بازار رکھا گیا تھا۔ دھلی کے اردو بازار کی بھی یہی خصوصیت تھی۔ یہاں مکتبہ جامعہ کے علاوہ بھی بہت ساری اردو کتابوں کی دکانیں تھیں جو کسی زمانے میں اس کی مرکزی حیثیت کی یاد دلاتی تھیں۔ جب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ جب دھلی میں مسلمانوں اور اردو زبان کو اہمیت حاصل تھی اور جامع مسجد کی سیڑھیوں اور اردو بازار میں دھلی کی ٹکسالی اردو رائج تھی اور لوگ کسی لفظ یا محاورے کے غلط استعمال پر یہاں آکر عوام الناس سے سند طلب کیا کرتے تھے لیکن اب یہ ساری باتیں خواب و خیال ہو چکی تھیں۔ اب نہ وہ دھلی تھی اور نہ اردو بازار اور نہ اردو تہذیب اب صرف نام رہ گیا تھا۔ جامع مسجد

اپنی جگہ قائم تھی لیکن اسے مذہبی سے زیادہ سیاسی اہمیت حاصل ہو چکی تھی اور اس کے بڑے امام عبداللہ بخاری ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر بن کر ابھرے تھے۔ وہ اگرچہ پیشہ ور سیاست داں نہیں تھے لیکن وقت نے انہیں خود بخود لیڈر بنا دیا تھا اور انہیں ذرائع ابلاغ میں اس وقت شہرت حاصل ہوئی جب دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے جامع مسجد کے سامنے کی قدیم اور بوسیدہ عمارتوں اور دکانوں کو منہدم کرکے اس کی جگہ نئی عمارتیں اور بازار تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا دیا تھا۔ اس منصوبے کی دھلی کے مسلمانوں نے شدید مزاحمت کی تھی کیوں کہ اس سے ان کی روزی متاثر ہوتی تھی چنانچہ کئی برسوں تک یہ تحریک چلتی رہی لیکن بالآخر انتظامیہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ انتظامیہ کے پیچھے سیاستداں۔ سیاسی جماعتیں اور ریاست کی پوری قوت تھی لیکن اس جدوجہد میں امام بخاری کی آزمائش ہوئی اور وہ اس آزمائش میں کھرے اترے اور وہ خود بخود ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی رہنما تسلیم کر لئے گئے۔

میں اردو بازار میں تنہا گشت کرتا اور دکانوں اور بازاروں کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دارالحکومت دھلی کے بجائے کسی دوسرے شہر میں پہنچ گیا ہوں۔ اس لئے کہ دھلی کے عام لوگوں کا معیار زندگی ہندوستان کے تمام لوگوں کے معیار زندگی سے بہت بلند تھا لیکن اردو بازار کے رہنے والے ویسے ہی غریب اور قلاش نظر آئے جیسے سارے ہندوستان کے عام لوگ۔ اردو بازار کے قرب و جوار کے رہنے والوں کی شکل و صورت سے ہی ان کی حالت زندگی عیاں تھی۔ کیا یہ علاقہ سلم ایریا ہے؟ یعنی شہر کا پس ماندہ علاقہ؟ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ شہر کے قلب میں واقع تھا البتہ یہاں غربت اپنے نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ دھوتی یا لونگی میں ملبوس بنیائن پہنے کئی کئی وقت کے فاقہ زدہ لوگ سستے ہوٹلوں کے سامنے قطار باندھے کھڑے تھے تاکہ کوئی مخیر اور خدا ترس شخص آئے اور انہیں ثواب کی خاطر ایک وقت کا کھانا کھلا دے۔ لوگوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس معاملے میں پاکستان اور ہندوستان اور دھلی اور کراچی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں نے کراچی کے آدم خاں مارکیٹ میں واقع سستے ہوٹلوں کے سامنے اسی طرح افلاس زدہ لوگوں کو قطار میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا اور یہاں بھی مخیر اور خدا ترس لوگ ہوٹل کے مالک کو ایک یا دو آدمیوں کو ایک وقت کا کھانا کھلانے کے لئے پیسہ ادا کر دیتے تھے اور ہوٹل کا مالک قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک یا دو آدمیوں کو ہوٹل کے اندر بلا لیتا تھا لیکن کراچی میں قطار بہت مختصر ہوتی تھی جبکہ دھلی کے اردو بازار میں قطار بہت لمبی تھی اور غیر مختتم۔ اس سے بھی دونوں ملکوں کی اقتصادی صورت حال کا اندازہ ہوتا تھا۔

دھلی کی طرح کراچی میں بھی بھکاریوں کی تعداد کم نہیں تھی لیکن فرق یہ تھا کہ پاکستان کے بھیک منگوں کا معیار ہندوستان کے بھکاریوں سے بلند تھا مثلاً وہ خیرات کے طور پر کم از کم چار یا آٹھ آنے اور زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کرتے تھے جبکہ ہندوستان میں رقم کی کوئی قید نہ تھی۔ کراچی کے بھکاری نذر و نیاز یا چالیسواں کے موقع پر کھانا کھانے کی بہ نسبت نقد رقم وصول کرنے کو ترجیح دیتے تھے بلکہ کھانے کے ساتھ نقد رقم کا بھی مطالبہ کرتے تھے اور اگر کوئی باذوق بھکاری ہوا تو مینو بھی دریافت کر لیتا تھا لیکن ہندوستان میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

ڈی۔ ڈی۔ اے کے بلڈوزروں کی یلغار سے قبل جامع مسجد کی چاروں طرف دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ جنوبی دروازے اور شاہی دروازے کے درمیان کپڑے کی مارکیٹ تھی جسے چوک کہتے تھے۔ اسی چوک کے بیرونی حصے میں فرینڈز ہوٹل نامی ایک چائے خانہ ہوتا تھا جو عرف عام میں بھائی ظہیر کا ہوٹل کہلاتا تھا۔ ہوٹل اور چائے خانہ ہمیشہ سے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ایسا ہوٹل یا چائے خانہ ضرور ہوتا ہے جہاں ادیب و شاعر جمع ہوتے ہیں جیسے کراچی میں کسی زمانے میں کیفے جارج اور ڑے لین اور لاہور میں پاک ٹی ہاؤس۔ دھلی کے اردو بازار میں بھی ایک زمانے میں جگت ٹاکیز (موجودہ جگت سینما) سے لے کر بازار مٹیا محل کے نکڑ تک افضل پشاوری مرحوم کے ہوٹلوں کا سلسلہ تھا۔ اسی سلسلے کا ایک ہوٹل جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے شاندار بیٹری کمپنی کے نیچے واقع تھا اور اسی ہوٹل میں دھلی کے اپنے زمانے کے مشہور شاعر استاد رسا دھلوی اور دوسرے شاعر و ادیب بیٹھا کرتے تھے اور گھنٹوں شعر و ادب پر گفتگو کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اور خلیق انجم نے بہت سی ادبی شخصیتوں کو پہلی بار اسی ہوٹل میں دیکھا تھا لیکن اب نہ اردو بازار کی وہ دکانیں تھیں اور نہ ہوٹل اور نہ ادیبوں اور شاعروں کا مرکز۔ اب وہاں نئے طرز کی دکانیں قائم ہو چکی تھیں جن کا کوئی ثقافتی پس منظر نہ تھا۔

میں اردو بازار کا گشت لگاتا ہوا تاریخی چاندنی چوک کی جانب نکل آیا اور میرا ذہن تاریخ کے مختلف ادوار میں سفر کرنے لگا اور چشم تصور سے آج سے ایک سو سال قبل کے اردو بازار اور چاندنی چوک کو دیکھنے لگا۔ جب اردو بازار اور چاندنی چوک آج سے بہت مختلف تھا لیکن اس کی رونق اور چہل پہل آج سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ تاریخ کے اوراق میں ان قدیم تاریخی بازاروں اور سڑکوں کے بارے میں جو کچھ درج ہے۔ اس پر آج آسانی سے یقین نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہ ساری باتیں اس قدر عجیب اور انوکھی ہیں کہ ان پر بہ آسانی یقین کرنا آسان نہیں مثلاً یہی کہ آج سے سو سال قبل چاندنی

چوک کے بیچوں بیچ اچھی خاصی چوڑی نہر بہتی تھی اور نہر کی دونوں طرف دو سڑکیں تھیں۔ایک نہر کے شمال میں اور دوسری جنوب میں۔ نہر جو اس بازار کے وسط سے گزرتی تھی۔ شہر کے ساتھ ساتھ بنی تھی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ غدر سے کچھ قبل تک نہر چاندنی چوک میں بہتی تھی۔ پھر انگریزوں نے اس کو اوپر سے بند کر کے پیدل چلنے والوں کے لئے پٹڑی کی صورت میں بدل دیا۔ نیچے پانی بہتا تھا اور اوپر لوگ چلتے تھے البتہ جابجا دہانے یا موکھے تعمیر کر کے اسے لوہے اور لکڑی کے تختوں سے ڈھانک دیا تھا اور بوقت ضرورت انہیں کھول کر چھڑکاؤ کے لئے پانی لیا جاتا تھا اور صبح و شام چاندنی چوک میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ دنیا کے مختلف شہروں کے مقابلے میں یہ دلی کی ہی خصوصیت تھی کہ اس کے بازار بلکہ بازاروں میں نہر بہتی تھی اور اس کے حسن کو دوبالا کرتی تھی۔ دنیا میں صرف وینس (اٹلی) ایک ایسا شہر ہے جو نہروں کے درمیان واقع ہے۔ لیکن دھلی اور وینس کا فرق یہ ہے کہ وہاں خشکی کم اور آبی راستے زیادہ ہیں جبکہ قدیم دھلی میں جمنا سے مصنوعی نہر کاٹ کر شہر کے اندر لائی گئی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نہر چاندنی چوک سے اس طرح غائب ہوئی کہ اب اگر کسی سے کہا جائے کہ کسی زمانے میں چاندنی چوک کے درمیان سے نہر گزرتی تھی۔ تو وہ یا تو کہنے والے کو گپ باز سمجھے گا یہ پھر خبطی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزوں نے نہر کو پاٹنے کے بعد چاندنی چوک میں پختہ سڑک تعمیر کر دی تھی اور بازار میں دونوں طرف دکانوں سے ملی ہوئی پٹریاں (فٹ پاتھ) تعمیر کی تھیں جن پر لوگ پیدل چلتے تھے اور درمیان سے ٹراموے اور دوسری قسم کی سواریاں گزرتی تھیں۔

کوئی معاشرہ معاشرتی اعتبار سے کتنا ترقی یافتہ ہے اس کا اندازہ اس کے ذرائع رسل و رسائل سے بھی ہوتا ہے مثلاً دھلی میں ٹراموے اور جدید ٹرانسپورٹ سسٹم کی آمد اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستان دور جدید میں داخل ہو چکا ہے لیکن آج سے ایک سو سال قبل تک صورت حال قطعی مختلف تھی۔ مثلاً موٹر کاروں۔ لاریوں اور ٹانگوں کی جگہ پردہ دار اور بے پردہ یکے۔ پالکیاں۔ فٹن۔ وکٹوریہ اور لینڈو ہوتی تھیں۔ اس دور میں اہل دہلی ٹانگے سے ناواقف تھے البتہ اس سے ملتی جلتی سواری بہلی عام تھی۔ دو پہیے والی گھوڑا گاڑی کو جسے ٹانگہ کہا جاتا ہے۔ وہ لارڈ کرزن کے دربار کے وقت رائج ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام و خواص میں بے حد مقبول ہو گیا۔ امتداد زمانہ دیکھیے کہ اب دھلی سے ٹانگے کا وجود بھی ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ جدید ترین کاریں۔ ٹیکسیاں۔ بسیں اور آٹو رکشائیں رائج ہیں جنے وہاں کی اصطلاح میں ٹیمپو کہتے ہیں۔

میں چاندنی چوک کے نہایت بارونق اور مصروف ترین بازار کے فٹ پاتھ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ

مواصلات کے لئے کام میں آنے والے پہیے کی گردش میں جوں جوں تیزی آتی گئی ہے معاشرے کی ترقی کی رفتار توں توں بڑھتی گئی ہے اور آج جتنی تیز رفتاری سے پہیہ گردش کر رہا ہے انسانی معاشرہ بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ جبکہ آج سے سو سال قبل برصغیر میں معاشرتی ترقی کی رفتار نہ صرف سست تھی بلکہ پورا معاشرہ جمود کا شکار تھا لیکن تاریخ کا پہیہ اور انسانی معاشرہ کبھی ساکت نہیں رہتا۔ نظام پیداوار کی تبدیلی کے ساتھ معاشرہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آج سے ایک سو سال قبل مٹی کا تیل ہندوستان میں آچکا تھا لیکن مقبول نہیں ہوا تھا۔ اسٹیشنوں اور تھانوں میں ارنڈی کا تیل ہی جلایا جاتا تھا۔ پھر 1903ء کے قریب بجلی آئی۔ خصوصاً لارڈ کرزن کے دربار کے موقع پر اس کے استعمال ہوتے ہی معاشرے میں انقلاب برپا ہونا اور تبدیلی آنا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ہنڈے اور گیس لیمپ کا استعمال شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے 1911ء کے دلی دربار کے انعقاد تک دلی کی شکل ہی بدل گئی

میں سوچ رہا تھا کہ چاندنی چوک میں رات کے وقت جو اتنی روشنیاں ہوتی ہیں وہ ایک سو سال قبل کہاں ہوتی ہوں گی۔ میں پھر ماضی کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ ایک سو سال قبل چاندنی چوک میں ہی کیا پورے شہر میں روشنی نہیں ہوتی تھی اور سڑکیں اور شاہراہیں تاریکیوں میں ڈوبی رہتی تھیں۔ اسی لیے شرفا اور رؤسا عموماً رات کے وقت باہر نہیں نکلتے تھے اور اگر ضرورتاً نکلتے تھے تو گھر سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور ان کے آگے ہوادار اور پالکی میں مشعلچی چلتا تھا۔ اس لئے گھر سے باہر رات کی رونق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ انگریزوں کی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ دلی کے بازاروں اور گلیوں میں لالٹین نصب کرنے کا رواج عام ہوا اور سڑکوں اور بازاروں میں رات کے وقت بھی رونقیں ہونے لگیں۔ 1932ء تک دلی کے خاص خاص حصوں میں بجلی کے قمقمے آویزاں ہو گئے اور بجلی کے استعمال نے ہندوستانی معاشرے کو یکلخت بدل کے رکھ دیا۔ ایک زمانہ تھا جب دلی کے گھروں میں کڑوے تیل کے چراغ ٹمٹماتے تھے اور آج دلی اتنی روشن اور بارونق ہے کہ ماضی کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔ واقعی دلی کتنی بدل چکی ہے

صبح بنارس اور شام اودھ کی بس شہرت ہی شہرت ہے۔ اگر دلی کی شام اور چاندنی چوک اور جامع مسجد کی شام کی چہل پہل سے اس کا موازنہ کیا جائے تو یقیناً دلی کی رونقیں زیادہ سہانی ثابت ہوں گی۔ کسی زمانے میں چاندنی چوک دلی کا سب سے بڑا اور بارونق بازار تھا لیکن اب ایسی بات نہیں رہی کناٹ پیلس اور دوسری جگہوں میں اس سے بھی بڑے بڑے اور ایئرکنڈیشنڈ بازار کھل چکے ہیں۔ لیکن چاندنی

چوک کی مرکزیت ہنوز قائم ہے اور سب سے بڑا تجارتی لین دین یہیں ہوتا ہے پاکستانی سکوں کی تبدیلی ہو یا دیگر غیر ملکی کرنسیوں کا تبادلہ سب چاندنی چوک میں ہی ہوتا ہے۔ میں بھی یہاں پاکستانی کرنسی کو ہندوستانی کرنسی میں بدلنے کے لئے حکومت کی منظور شدہ ایجنٹ کے پاس گیا اور کرنسی تبدیل کروا کے جوگندر پال جی کے ہاں بخیر و عافیت واپس آگیا۔ پال جی اور کرشنا بھابی دوپہر کے کھانے پر میرا بے قراری کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ میں راستہ بھٹک کر کہیں پریشان نہ ہو رہا ہوں۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شام کو پال جی مجھے فکر تونسوی سے ملانے کے لئے لے گئے۔

فکر تونسوی

فکر تونسوی سے بحیثیت شاعر اور مدیر ادب لطیف میں تقسیم ملک سے قبل سے واقف تھا اس لئے کہ قیام پاکستان سے قبل وہ چند سال ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور سے وابستہ رہ چکے تھے اور جدید نظم کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ حصول آزادی اور پاکستان سے ترک وطن کر کے ہندوستان آنے کے بعد وہ نثر نگار کی حیثیت سے ابھرے اور روزنامہ "ملاپ" سے وابستہ ہونے کے بعد وہ ایک معروف کالم نویس اور طنز نگار تسلیم کر لئے گئے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے ہم عصروں کے خاکے لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ انہوں نے بعد میں "خدوخال" کے نام سے کتاب مرتب کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے شاعری بالکل ترک کر دی البتہ ادبی رسائل میں ان کے طنزیہ مضامین شائع ہوتے رہے۔ جوگندر پال نے جب بتایا کہ فکر راجندر سنگھ بیدی کے بے تکلف دوستوں میں سے ہیں اور وہ ان کے بارے میں بہت ساری باتیں جانتے ہیں تو میں ان سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ دراصل میرے دورہ ہندوستان کا ایک مقصد راجندر سنگھ بیدی کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا بھی تھا تاکہ میں راجندر سنگھ بیدی پر اپنی مجوزہ تصنیف مکمل کر سکوں۔ چنانچہ پال جی شام ہوتے ہی مجھے ساتھ لے کر فکر تونسوی کے ہاں پہنچ گئے۔

فکر جی پر حال ہی میں فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ زیادہ تر گھر پر ہی وقت گزارتے تھے، چنانچہ میں جب ان کے ہاں پہنچا تو انہوں نے میرا اور پال جی کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ معلوم ہوا کہ انہیں چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ "ملاپ" کے دفتر نہیں جاتے اور گھر پر ہی کالم لکھ کر بھجوا دیتے ہیں۔ وہ ایک چوکی پر بیٹھ گئے شراب کی بوتل نکالتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا "کیا آپ شوق فرماتے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ انہوں نے پال جی سے مخاطب ہو کر کہا "بھئی، بہت تھوڑی سی ہے۔ میں تمہیں تھوڑی سی دوں گا" پال جی بھلا اس کا کیا جواب دیتے؟ انہوں نے تھوڑی پر ہی اکتفا کیا اور

فکر صاحب تھوڑے تھوڑے وقفے سے شراب انڈیلتے اور باتیں کرتے ہوئے سسکیاں لیتے رہے۔
پال جی نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ میں راجندر سنگھ بیدی پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں ان کی نجی زندگی کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔ فکر جی یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بیدی جی کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں۔ پھر پاکستان کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

فکر تونسوی نے بتایا

"میں 43-1942 میں "ادب لطیف" میں آیا تھا۔ مجھ سے پہلے احمد ندیم قاسمی اس کے ایڈیٹر تھے۔ دوسرے ادیبوں کے علاوہ بیدی صاحب بھی دفتر تشریف لاتے تھے۔ اسی زمانے میں بیدی صاحب نے اپنا ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔ سہگل صاحب تھے ان کے دوست۔ وہ انڈسٹرلسٹ تھے۔ آج کل بھی فیض آباد میں ان کی فیکٹری ہے۔ وہ دلی میں ان کے ہاں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ سہگل صاحب بڑے باذوق آدمی تھے۔ اردو ادب سے بڑی محبت تھی۔ بیدی صاحب اور ان میں نسبت ضرور تھی۔ انہوں نے ہی بیدی کے تعاون سے پبلشنگ ہاؤس قائم کیا تھا۔ بیدی صاحب کی ایک کتاب تھی "سات کھیل"۔ یہ کتاب 1942ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ اس کا دفتر نسبت روڈ پر تھا۔ یہ بہت اچھا اشاعتی ادارہ تھا اور وہاں سے اعلیٰ معیار کی کتابیں چھپتی تھیں۔ اس ادارے نے بڑی اچھی اچھی کتابیں چھاپی تھیں۔ اوپندر ناتھ اشک کے ناول "گرتی دیواریں" کی اشاعت کا اس سے معاہدہ ہوا تھا لیکن وہ تھوڑے دنوں تک چلا۔ اس کے بعد فسادات شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں بیدی پوسٹ آفس چھوڑ چکے تھے۔ یہ 1942 سے 1946ء تک کا عرصہ ہے تقسیم ملک کے بعد وہ کشمیر چلے گئے "ادب لطیف" سے ادیبوں کا بہت بڑا گروپ نکلا تھا۔ جس میں فیض صاحب تھے۔ کرشن چندر تھے۔ ن۔م۔ راشد تھے۔ میراجی اور دیویندر ناتھ ستیارتھی تھے۔ یہ سب ہی ادب لطیف کے دفتر میں آیا کرتے تھے۔ ہر روز ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ ان میں بیدی صاحب بھی شامل تھے۔ وہ شروع سے ہی فوراً بے تکلف ہو جایا کرتے تھے اور خوب لطیفے سناتے تھے۔ شروع سے ہی ان کے اندر حس مزاح تھا۔ آپ ان سے سریس سی باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں کرتے کرتے ان کے اندر سے اچانک لطیفہ اٹھا اور وہ لطیفہ سنانے لگے۔

"ان سے آپ کی پہلی ملاقات کس سنہ میں ہوئی؟"

"ہمارا ادارہ تھا" مکتبہ اردو"۔ ہم نے ان کی کتاب "گرہن" شائع کر دی تھی" "اس سے پہلے ان

کی ایک کتاب چھپی تھی۔ "دانہ ودام" یہ کتاب آپ لوگوں نے کس سنہ میں شائع کی ہوگی؟"

"آپ یوں سمجھیے کہ 1940ء اور 44ء کے درمیان چھپی تھی"

پال جی نے کہا ماہنامہ "آج کل" میں ان کے بارے میں جو کوائف شائع ہوئے ہیں۔ اس میں سن اشاعت 1936ء لکھا گیا ہے"

"یہ کتاب 36ء کی نہیں ہے۔ 36ء میں تو مکتبہ اردو میں خود جان نہیں تھی" میں نے کہا "مجھے پہلے ہی اس کے سنہ اشاعت پر شبہ تھا۔ اگر دانہ ودام 36ء میں چھپی ہے تو "

"36ء میں تو انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی" فکر جی نے کہا۔

"بیدی جی تو 1915ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر 36ء میں ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی پہلی کتاب 21 سال کی عمر میں شائع ہوئی لیکن کتاب میں چونکہ سنہ اشاعت نہیں ہے اس لئے اس بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے"۔

میں نے کہا ان کی پہلی کتاب کی اشاعت سے میں اس لئے دلچسپی لے رہا ہوں کہ اس کتاب نے انہیں ادب میں باقاعدہ اسٹے بلش کر دیا تھا۔

"36ء میں تو یہ کتاب شائع ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ اس کا سنہ اشاعت زیادہ سے زیادہ 1940ء کہہ سکتے ہیں ا فکر تونسوی نے بڑے تیقن کے ساتھ کہا۔

"بیدی جی کے ہم عصر ادباہی صحیح طور پر بتا سکتے ہیں کہ یہ کتاب کب شائع ہوئی"۔ میں نے کہا " 1933ء میں ان کے افسانے "مہارانی کا تحفہ" لکھنے پر انہیں ادبی دنیا" لاہور کی طرف سے پچاس روپیہ انعام ملا تھا۔ اس طرح تین سال کے اندر ان کی پہلی کتاب کا آجانا ناقابل یقین ہے"

جوگندر پال نے کہا ماہنامہ "آج کل" میں ان کا جو بایوڈیٹا شائع ہوا ہے۔ وہ ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا ہے اور ہر کتاب کا سن اشاعت دیا گیا ہے"

"اگر آپ ایک خط اوپندر ناتھ اشک کو لکھیں تو وہ زیادہ صحیح طور پر بتا سکتے ہیں۔ وہ دونوں لاہور میں سنت نگر میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ کرشن چندر بھی وہیں رہتے تھے۔ یہ میں بتا سکتا ہوں کہ یہ کتاب کسی حال میں 36 میں شائع نہیں ہوئی"

"فکر جی آپ سے بیدی جی کے تو بڑے بے تکلف تعلقات رہے ہوں گے"؟

"بے تکلفی سے آپ کی کیا مراد ہے"؟

"مطلب یہ کہ انہوں نے اپنی نجی زندگی کے بارے میں بھی بہت ساری باتیں بتائی ہوں گی"

"نجی زندگی کے بارے میں یہ ہے کہ وہ بیوی سے خوش نہیں تھا۔ ایک تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انٹیلکچوئیلی بہت آگے تھا اور جو شادی ہوئی۔ وہ عام رسوم کے مطابق ہوئی۔ شادی صحیح تھی لیکن جوں جوں بیدی کی ادبی وقعت بڑھتی گئی۔ دونوں میں گیپ واضح ہوتا گیا۔ وہ جو ایٹ چوٹ ہوتا ہے میاں بیوی کا۔ اس میں تھوڑا سا رخنہ پڑ جاتا ہے۔ پھر ایک دوسرے کا ساتھ دینا اور تال میل رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیدی بہت آگے نکل گیا تھا۔ صرف ادب میں نہیں بلکہ اس شخص نے ہر قسم کی سوشل پرابلمز اکونومک پرابلمز۔ عمرانیات۔ متھالوجی اور فلسفے کی گہری اسٹیڈی کی تھی اور پک اپ جلد کرتا تھا۔ اور اس کا اظہار بھی تیزی سے کرتا تھا۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ وہ بہت سی چیزوں کو ایک پلاٹ میں اس طرح سما دیتا تھا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی میکنیکل سوچ ہے بلکہ ان سے بے ساختہ پن ظاہر ہوتا تھا۔ یہ اس کے فن اور شخصیت کی خوبی تھی۔ علم تو مولویوں اور پنڈتوں کے پاس بھی بہت ہوتا ہے لیکن وہ اچھا شعر نہیں کہہ سکتے۔ بیدی صاحب میں اللہ کی بخشی ہوئی قوت تھی۔ خدا کی دین تھی۔ وہ سب چیزوں کو بڑی خوبی سے مکس اپ کرتے تھے۔ ان کا جو ناول "ایک چادر میلی سی" ہے۔ وہ تو ان کے فن کا کلائمکس تھا۔ وہ جذباتی بہت تھے۔ ان کے پاس کچھ ویلوز تھیں۔ ان ویلوز پر جب زد پڑتی تھی تو وہ رو پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کہانی سنا رہے تھے۔ ہم دس بارہ آدمی جمع تھے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں "صرف ایک سگریٹ" افسانہ قطعی پرسنل تھا وہ جب بھی اپنے بیٹے کا ذکر کرتے تو اتنے جذباتی ہو جاتے کہ گلا بھر آتا اور کہانی ان سے پڑھی نہ جاتی تھی اور وہ رونے لگتے تھے۔ یار دوستوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرنا۔ ان کے لئے رونا ان کے لئے ہنسنا ہر چیز قربان کرنا ان کا شیوہ تھا۔

"ان کے بچوں سے کیا اختلافات تھے"

"یہ جو جنیریشن گیپ ہوتا ہے نا۔ وہ کچھ زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ جب عمر بڑھتی ہے تو توقعات باپ سے بیٹے میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ نئی جنیریشن کا بیٹا باپ سے کہتا ہے۔ بیدی صاحب آپ کو تو فلم بنانا آتا ہی نہیں ہے۔ وہ صاف کہتا تھا۔ سردار جی چھوڑیے آپ کو فلم بنانا نہیں آتی۔ حالاں کہ بیدی دلی سے آل انڈیا ریڈیو چھوڑ کر فلمی دنیا میں گئے تھے۔ وہاں انہیں ناکامی اس لئے ہوئی کہ بیدی وہ کرنا چاہتے تھے جو ان کے باطن میں تھا۔ وہ اس کا اظہار چاہتے تھے۔ انہیں فلم پروڈیوسروں نے ڈائیلاگ لکھنے کا کام دے دیا۔ وہ ڈائیلاگ بہت اچھا لکھ لیتے تھے۔ ڈائیلاگ لکھنا بیدی کے لئے روزی کا ذریعہ تھا لیکن اس سے ان کے باطن کا اظہار تو نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنے باطن کا اظہار اپنی ایک دو فلموں میں کیا۔ مثلاً۔ دستک۔ میں کیا یہ ان کی اپنی فلم تھی۔ کچھ پیسہ گورنمنٹ سے لیا۔ کچھ ادھر ادھر سے لیا۔ وہ پیسہ ڈوب گیا۔

رشید حسن خاں

ادلی والے" سیمینار میں جن ادبا سے ملاقات ہوئی ۔ان میں رشید حسن خان بھی تھے ۔میں نے ان سے تفصیلی ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے مجھے دلی یونیورسٹی کے میک گوایر ہال میں بلالیا۔ جہاں ان کا قیام تھا ۔انہوں نے کراچی میں مجھے خط و کتابت کے لئے یہی پتہ دیا تھا چنانچہ مجھے وہاں پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی ۔میں جوگندر پال کے ہاں قیام کے دوران ایک دن دقت نکال کر ان سے ملنے کے لئے پہنچ گیا۔

میں رشید حسن خاں کے نام سے پہلے ہی واقف تھا ۔ادبی معرکہ آرائیوں خصوصاً کلاسیکی ادب کی تحقیق اور زبان و بیان کے معاملات میں ان کی سخت گیری کی شہرت میں پہلے ہی سن چکا تھا ۔یہ بھی سن چکا تھا کہ پٹھان ہونے کے ناتے وہ نہ صرف منہ پھٹ ہیں بلکہ بد تمیزی کی حد تک بے باک بھی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے کراچی میں ان سے ملاقات کے دوران ہو چکا تھا ۔وہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے اور نیپا کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔وہاں مشفق خواجہ نے ان سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے ۔انہوں نے کہا ا میں آپ کے مضامین پڑھتا رہا ہوں ۔آج پہلی بار آپ سے ملاقات ہوئی"

دوسرے روز علی حیدر ملک روزنامہ ا جسارت" کے ادبی صفحہ کے لئے انٹرویو لینے کی غرض سے ان کے پاس گئے ۔میں بھی ان کے ساتھ تھا ۔انٹرویو کے دوران میں نے بھی ان سے ایک سوال کر لیا ۔ہم دونوں یعنی علی حیدر ملک اور میں ادیبوں سے عموماً مشترکہ انٹرویو لیا کرتے تھے ۔اس کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ لیکن رشید حسن خاں کو برا لگا اور انہوں نے مجھے زبردست ڈانٹ پلا کر خاموش کر دیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ وہ دوسرے ہم عمر ادیب سے نہایت نازیبا سلوک کر رہے ہیں ۔میں ان کی بد تمیزی پر حیران تھا لیکن جب لوگوں نے بتایا کہ وہ نسلاً پٹھان ہیں تو میں ان کی مجبوری کو سمجھ گیا۔

رشید حسن خاں کا شہرہ 60 ء کی دہائی میں اس وقت ہوا جب انہوں نے دنیائے ادب میں قدم رکھا اور اپنے تنقیدی اور تحقیقی مقالات میں اپنی تنقیدی بصیرت اور درشت لب و لہجے کے باعث لوگوں کو چونکا دیا۔ وہ اس سے قبل ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ تھے اور اشتراکیت کے زیر اثر کمیونسٹ پارٹی سے بھی منسلک تھے لیکن انہیں جب معلوم ہوا کہ یہ نام نہاد مزدور رہنما عام کارکنوں کے شانے پر سوار ہو کر اپنی لیڈری کی دکان چمکا رہے ہیں اور نصب العین سے مخلص نہیں ہیں تو انہوں نے عملی سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی اور خود کو زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق کے لئے وقف کر دیا۔ اس طرح انہوں نے صحیح منزل پالی۔

ان کا شمار ہندوستان کے صف اول کے محققین میں ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے برصغیر میں اردو املا پر نمایاں اور منفرد کام کیا ہے۔ بے شمار تحقیقی اور تنقیدی مضامین اردو کے موقر جریدوں میں سپرد قلم کر چکے ہیں اور ادبی و علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا ایک اہم کارنامہ "افسانہ عجائب" کی تدوین ہے۔ جس میں انہوں نے کئی سال صرف کئے۔ انہیں لغت نویسی کے فن سے خاص دلچسپی ہے۔ وہ زبان و بیان کے سلسلے میں بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں اور وہ اس ضمن میں کسی کو بھی بخشنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

ایسے سخت گیر شخص سے ملنا اور ادبی موضوعات پر گفتگو کرنا جرات مندی کا کام تھا۔ میں ان سے اس لئے ملنا چاہتا تھا کہ میں اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعہ "ارد عمل" پر ان سے فلیپ لکھوانا چاہتا تھا چنانچہ میں ان سے ملنے کی غرض سے دہلی یونیورسٹی کے میک گوایر ہال پہنچ گیا۔ رشید خاں نے تپاک کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور اپنے سامنے رکھی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا اور ہر جانب کتابیں بکھری ہوئی نہیں بلکہ بچھی ہوئی تھیں۔ اندر اور باہر کے کمرے میں دیسی طرز کے دو کھاٹ بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چادریں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر کتابیں اس طرح بچھی ہوئی تھیں کہ ہر کتاب کا نام بآسانی پڑھا جا سکتا تھا۔ ان کے اہل علم ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اس لئے ان کے ہاں کتابوں کا انبار ہونا لازمی تھا لیکن کتابیں جس طرح بچھی ہوئی تھیں۔ اس پر حیرت ضرور تھی۔

میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ان سے اپنا اصل مدعا بیان کیا اور اپنا مسودہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے مسودے کی ورق گردانی کی اور اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ماشاءاللہ آپ دو کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ اب آپ کو کسی دیباچے مقدمے یا فلیپ کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ فلیپ میں عموماً

جھوٹ لکھتے ہیں۔ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ دوست نوازی اور مروت کی وجہ سے سچ بات لکھتے ہوئے احتراز کرتے ہیں جس کی وجہ سے قارئین کا فلیپ پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ اس لئے آپ دوسرے سے فلیپ اور مقدمہ لکھوانے کے بجائے خود مقدمہ لکھیے اور اس کا اقتباس فلیپ پر دے دیجیے۔ اس طرح قارئین فن کے بارے میں آپ کے نقطہ نظر سے واقف ہو جائیں گے۔

رشید حسن خاں نے نہ صرف فلیپ لکھنے سے انکار کر دیا بلکہ مشورہ دیا کہ میں کسی دوسرے سے بھی فلیپ نہ لکھواؤں بلکہ یہ کام خود انجام دوں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ کتاب کی اشاعت کے بعد وہ ا غالب نامہ" میں اس پر مفصل تبصرہ کر دیں گے مجھے ان کی بے باکی اور صاف گوئی پسند آئی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ میں ا ردعمل "کا مقدمہ خود لکھوں گا اور تنقید کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کروں گا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ا ردعمل" پر میرا مقدمہ سولہ صفحات پر مشتمل تھا اور میں نے اس کا اقتباس فلیپ پر دے دیا تھا کتاب جب رشید حسن خاں کو ملی تو انہوں نے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ایک طویل خط لکھا۔ جس میں انہوں نے میرے مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ا میں نہ کہتا تھا کہ آپ کو اپنی کتاب پر خود مقدمہ لکھنا چاہیے آپ نے بہت عمدہ مقدمہ لکھا ہے جو اپنی جگہ مکمل مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

دھلی سے روانگی سے قبل میں ایک بار پھر ان سے ملنے کے لئے گیا۔ اتفاق سے وہ راستہ میں ہی مل گئے۔ ہفتے کا دن تھا اور وہ اپنے بچوں سے ملنے کے لئے شاہجہاں پور جا رہے تھے جو دہلی سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ ہفتے کے روز شاہجہاں پور جاتے تھے اور پیر کی صبح دھلی واپس آجاتے تھے۔ سڑک پر کھڑے کھڑے تھوڑی دیر گفتگو ہوئی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے سلام دعا کر کے رخصت ہو گئے۔ ان سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے دل میں سوچا یہ شخص خواہ کتنا ہی منہ پھٹ اور بے باک کیوں نہ ہو۔ عام ادیبوں کی طرح منافق نہیں ہے۔ اسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ نہایت جرات کے ساتھ منہ کے سامنے کہہ دیتا ہے۔ ایسا شخص اگر زیادہ مقبول نہیں ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے مجھے جس دن دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس روز میں مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل ان کے ہاں پہنچ گیا۔ مقصد یہ تھا کہ میں ہندوستان کے سب سے مقبول طنز و مزاح نگار سے ان کی زندگی اور فن کے بارے میں باتیں کر سکوں۔ مجتبیٰ حسین سے یوں تو میں سیمینار میں مل چکا تھا لیکن وہاں تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں ان سے تنہائی میں ملوں اور دل کھول کر باتیں کروں چنانچہ میں رکشا پر جوگندر پال جی کے گھر سے مہرولی کے لئے روانہ ہو گیا۔ جہاں ان کا گھر بھی تھا اور دفتر بھی۔ اس روز مجتبیٰ حسین نے دفتر سے رخصت لے لی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ دلی بہت بڑا شہر ہے لیکن اس کی وسعت کا اندازہ اس وقت ہوا۔ گریٹر کیلاش سے مہرولی کتنے فاصلے پر واقع ہے اس کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن میں نے گھڑی میں دیکھا کہ مجھے ان کے گھر تک پہنچنے میں رکشا میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ جب کہ رکشا تیس سے پینتس میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسلسل چلتی رہی۔ بعض دفعہ مجھے احساس ہوا کہ رکشا والا مجھے جان بوجھ کر لمبے راستے سے لے جا رہا ہے تاکہ غیر ملکی مسافر سے زیادہ روپے اینٹھ سکے۔ جیسا کہ عموماً کراچی کے رکشا ڈرائیور کرتے ہیں لیکن وہ جن راہوں سے گزر رہا تھا میں ان سے گزر چکا تھا۔ اس لئے میں یہ دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر مجھے غلط راہ سے لے جا رہا ہے۔ ایک بار میں نے اس سے دریافت بھی کیا بھئی تم مجھے مہرولی ہی لے جا رہے ہو نا؟ اس نے جواب دیا ہاں صاحب مہرولی ہی جا رہا ہوں آپ اطمینان رکھیے چنانچہ خاموش ہوئے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ دہلی میں جگہ بہ جگہ فلائی اوور ہونے کے باعث گاڑیاں بہت کم رکتی ہیں اور اس کی وجہ سے گاڑیوں کی رفتار بھی بہت تیز ہوتی ہے چنانچہ رکشا زناٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی اور ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد خدا خدا کر کے مجتبیٰ حسین کا گھر آیا۔ میں نے جب رکشا کا میٹر دیکھا تو صرف بیس روپیہ کرایا اٹھا۔ جو مجھے مناسب معلوم ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ دہلی میں رکشاؤں اور ٹیکسیوں

کے میٹر میں دھوکے سے اضافہ نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ شہری انتظامیہ خصوصاً پولیس بہت چوکس اور سخت گیر ہے اور وقفے وقفے سے رکشاؤں اور ٹیکسیوں کے میٹر کی جانچ پڑتال کرتی رہتی ہے اور جو لوگ میٹر درست نہیں رکھتے ان سے سختی کے ساتھ نمٹتی ہے۔ اسی لئے رکشا اور ٹیکسی ڈرائیوروں میں دھوکہ دہی کی جرات نہیں ہوتی۔

مجتبیٰ حسین پہلے ہی گھر پر موجود تھے۔ انہوں نے میرا استقبال کیا اور میں نے فوراً گفتگو شروع کر دی تاکہ ہماری گفتگو کے دوران کوئی دوسرا شخص نہ آجائے۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت سے میری دلچسپی کا آغاز ماہنامہ "اکتاب نما" میں ان کے جاپان کے سفرنامے سے ہوا تھا۔ جو قسط وار اس میں شائع ہوتا رہا اور ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہوا۔ ان سے دلچسپی کی دوسری وجہ ان کے بھتیجے اور ابراہیم جلیس کے صاحبزادے شہریار جلیس کا مجتبیٰ حسین کے بارے میں ایک دلچسپ انکشاف ہے۔ جس نے ان کی شخصیت سے میری دلچسپی بڑھا دی۔ شہریار جلیس نے بتایا کہ مجتبیٰ حسین کی شہرت سن کر ایک بار ہندوستان کے مشہور اداکار اور فلم ساز دلیپ کمار نے انہیں اپنی مجوزہ فلم کی اسکرپٹ لکھنے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لی۔ مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر دلیپ کمار کے بڑے گہرے دوست تھے اور دلیپ کمار نے شاید اسی لئے مجتبیٰ حسین کو زیادہ اہمیت دی تھی لیکن دونوں کے مابین بات بنی نہیں اور مجتبیٰ حسین کام چھوڑ کر واپس آگئے اور پھر کبھی دلیپ کمار سے ملنے بمبئی نہیں گئے۔ دلیپ کمار بڑا اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ خود پرست بھی واقع ہوا تھا اور وہ اسکرپٹ میں تمام تر توجہ اپنی جانب رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے مجتبیٰ حسین کی اسکرپٹ میں اس قدر تبدیلیاں کروائیں کہ مجتبیٰ حسین تنگ آگئے اور کام چھوڑ کر گھر واپس آگئے۔ کچھ دنوں کے بعد دلیپ کمار کو حیدر آباد (دکن) جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں ان کی مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے شکایت کر دی۔ محبوب حسین جگر دلیپ کمار کا بڑا احترام کرتے تھے چنانچہ گھر پہنچتے ہی انہوں نے مجتبیٰ حسین کو طلب کیا اور ڈانٹ پلانی شروع کر دی۔ مجتبیٰ حسین اتنے سعادت مند واقع ہوئے تھے کہ وہ نظریں جھکائے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتے رہے اور جواباً ایک لفظ بھی نہ کہا جیسے کوئی چھوٹا بچہ ہو اور بزرگ سے صلواتیں سن رہا ہو۔ مجتبیٰ حسین کی جس ماحول میں پرورش ہوئی تھی۔ وہاں اپنے سے بڑوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنا یا ان کا جواب دینا بدتمیزی تصور کیا جاتا تھا۔ مجتبیٰ حسین نہ صرف شادی شدہ تھے بلکہ کئی بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ جب جگر صاحب بہت دیر تک انہیں باتیں سناتے رہے تو ان کی بھابی نے مجتبیٰ سے

کہا ! ان کی توند میں سر گھسا جلدی سے سر گھسا"

شہریار نے بتایا کہ حیدر آباد میں جب کوئی شخص گھر کے کسی بزرگ کی توند میں اپنا سر لگا دیتا ہے تو بزرگ اپنا غصہ بھول بھال کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اسے معاف کر دیتے ہیں چنانچہ جگر صاحب نے بھی مجتبیٰ حسین کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں معاف کر دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجتبیٰ حسین اور ان کا گھرانہ ایک ایسی تہذیب کا پروردہ ہے جو تہذیب تیزی کے ساتھ بدلتی جا رہی ہے۔ میں نے شہریار جلیس کی زبانی یہ سب کچھ پہلے ہی سن رکھا تھا اس لئے میں نے سب سے پہلے ان کا خاندانی پس منظر جاننا چاہا۔ انہوں نے بتایا:۔

! میرے والد احمد حسین حیدر آباد دکن میں تحصیل دار تھے۔ وہ اگرچہ ادیب یا شاعر نہیں تھے لیکن بڑے صاف ستھرے اور اچھے ادبی ذوق کے مالک تھے۔ ان کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ انہیں پورا دیوان غالب زبانی یاد تھا۔ انہیں ہر موقع اور ہر محل کے اشعار یاد تھے۔ 1973ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہ تقریباً ایک سو سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کی وجہ سے گھر میں ابتدا سے ہی ادبی ماحول رہا۔ ہم کل نو بھائی اور ایک بہن تھے۔ سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اس کے بعد عابد حسین پھر ابراہیم جلیس اس کے بعد بہن پھر یوسف حسین پھر اقبال حسین پھر میں یعنی مجتبیٰ حسین پھر خورشید حسین پھر سردار حسین اور سب سے چھوٹے اکرام حسین۔ والد صاحب بڑے یار باش تھے اور ان کا زیادہ وقت دوستوں میں گزرتا تھا۔ انہوں نے بچوں کی تربیت میں تو زیادہ حصہ نہیں لیا۔ لیکن بچوں نے انہیں دیکھ کر بہت کچھ سیکھا۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ گھر کا خاص ماحول تھا۔ وہ جب گھر میں قدم رکھتے تو بات چیت نہیں ہو سکتی تھی۔ جگر صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہم آج بھی ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے ہیں۔ نظر سے نظر ملا کر بات کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ہم آج بھی ان کا اسی طرح احترام کرتے ہیں۔ جگر صاحب کو جب بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ میں لطیفے بھی کہتا ہوں تو انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ جو آدمی اتنا سنجیدہ رہتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے"

! ان بھائیوں میں سے لکھنے پڑھنے کا شوق کن کن بھائیوں کو تھا؟

! لکھنے پڑھنے کا شوق صرف ہم تین بھائیوں کو تھا یعنی محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجھ میں بڑے بھائی محبوب حسین جگر ہمیشہ سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور 1945ء میں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی جو پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تھی اس کے منتظمین میں جگر صاحب بھی شامل تھے۔ کرشن چندر نے اپنے رپور تاژ "پودے" میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میں اپنے ادبی کیریر

میں کسی سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تو وہ محبوب حسین جگر ہیں۔ جلیس صاحب تو خیر لاپرواہ آدمی تھے۔ البتہ جگر صاحب کے پاس بہت کتابیں تھیں۔ کتابوں کا بہت اچھا کلیکشن تھا چنانچہ میں ان کی کتابیں باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ میری ذات کی تشکیل میں جگر صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ہی مجھے اخبار میں لگایا اور اخبار کا سارا کام میرے سپرد کیا بلکہ میری ذہنی تربیت جگر صاحب نے ہی کی۔ ان دنوں کرشن چندر بیدی اور منٹو وغیرہ کی کتابیں گھر پر رہتی تھیں۔ وہ میں پڑھتا تھا۔ اس کے بعد میں نے لکھنا شروع کیا لیکن کبھی کوئی چیز چھپوائی نہیں"

"اس کی وجہ؟"

"اس کی وجہ یہ کہ ہمت نہیں ہوئی کہیں بھیجنے کی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے طنز و مزاح لکھنے سے قبل افسانہ لکھا تھا اور وہ بھی موت کے موضوع پر"

"موت کے موضوع پر؟"

"جی ہاں، 1953 کی بات ہے۔ میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا کہ میں نے موت کے موضوع پر چھ سات افسانے لکھے جو بہت ہی سیریس قسم کے تھے جن کو میں نے کہیں نہیں چھپوایا۔ سلیمان اریب کی بڑی خواہش تھی کہ میں اسے "صبا" میں چھپواؤں۔ انہوں نے افسانہ اپنے ہاتھ سے فیر بھی کیا تھا۔ مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے کے بعد میں نے ان افسانوں کو شائع کرانے کا ارادہ ترک کر دیا"

. "آپ نے اپنی پہلی کتاب میں لکھا ہے کہ آپ کا مزاح نگار بننا محض اتفاق تھا۔ وہ کیسے؟ آپ جب "سیاست" میں کام کر رہے تھے۔ اس وقت کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ آپ مزاح لکھ سکتے ہیں؟"

"سیاست" میں تو میں مضامین لکھتا تھا۔ کتابوں پر تبصرے کرتا تھا یا خبروں کا ترجمہ کرتا تھا۔ جگر صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں البتہ انہیں اتنا معلوم تھا کہ میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں اور میرا لکھنے کا اپنا اسلوب ہے چنانچہ انہوں نے مجھے اخبار میں لگا دیا۔ میں نائٹ شفٹ میں سب اڈیٹر کی حیثیت سے صفحہ اول کے لئے خبروں کا ترجمہ کرتا تھا میرے بارے میں جگر صاحب کا خیال تھا کہ میں بہت اچھی زبان لکھتا ہوں۔ میں 1956ء سے 1962ء تک صحافی کی حیثیت سے اخبار سے وابستہ رہا۔ میرے اخبار میں ایک کالم تھا "شیشہ و تیشہ" جسے مشہور شاعر شاہد صدیقی مرحوم لکھتے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد کالم نگار کی تلاش شروع ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے

٭ کالم لکھا جن میں جیلانی بانو۔ شاذ تمکنت اور وحید اختر وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن بات بنی نہیں۔ ایک دن میں صبح کے وقت دفتر پہنچا تو بڑے بھائی نے بلا کر کہا آج تم مزاحیہ کالم لکھو" انہیں کسی نے بتا دیا تھا کہ میں ہوٹل باز ہوں اور ہوٹل میں بیٹھ کر دوستوں کی محفل میں لطیفے سناتا رہتا ہوں۔ یہ میرے لئے بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی طنز نہیں لکھا ہے۔ میں کیسے لکھ سکوں گا لیکن وہ مانے نہیں اور کہا جاؤ اور جا کر کالم لکھو" جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے حکم حاکم مرگ مفاجات۔ مجھے آج بھی وہ تاریخ اچھی طرح یاد ہے۔ 16 اگست 1962ء کو دن کے ساڑھے دس بجے میری مزاح نگاری شروع ہوئی۔ ویسے تو میں مختلف اخبارات کا کالم پڑھتا رہتا تھا جن میں پاکستانی اخبارات بھی شامل ہیں لیکن اس وقت تک کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے کالم بھی لکھنا پڑے گا۔ بس تفریح کی غرض سے کالم پڑھا کرتا تھا۔ میرا پہلا کالم آزادی کے بارے میں تھا۔ جیسا بھی تھا۔ اس کے بعد میں باقاعدگی سے کالم لکھنے لگا۔ ایک ہفتے کے بعد لوگوں نے پوچھنا شروع کیا۔ ایہ کون شخص ہے جو آج کل اسیاست" میں کالم لکھ رہا ہے؟ "شیشہ و تیشہ" میں جو کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دور ہو چکی تھی۔ اس وقت تک میں اکوہ پیما" کے فرضی نام سے لکھتا تھا۔ اس لئے کہ میں غیر معروف تھا اور صحافی کی حیثیت سے بھی اخبار میں میرا نام نہیں آتا تھا۔ لوگ بڑے تجسس سے پوچھنے لگے تھے ایہ کون شخص ہے بہت اچھا لکھ رہا ہے" مہینے بھر کے بعد پاکستان کے مختلف اخبارات میں اشیشہ و تیشہ" کے اقتباسات نقل ہونے لگے۔ مجھے یاد ہے ان دنوں احمد ندیم قاسمی امروز" لاہور میں احرف و حکایت" کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے کالم میں میرے کالم کا ذکر کیا کہ حیدر آباد میں ایک کالم نویس نے مندرجہ ذیل کالم لکھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے کالم کا اقتباس پیش کیا۔ اس طرح میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی"۔

ا آپ نے اپنے نام سے مضمون لکھنا کب شروع کیا؟

امیں نے اپنے اصل نام سے پہلا مضمون 1964ء میں یوم غالب کے موقع پر لکھا۔ حیدر آباد کی ادبی انجمن امجلس اردو" یوم غالب کے موقع پر ایک جلسہ کرنے والی تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں بھی غالب کے بارے میں کوئی مزاحیہ مضمون لکھوں مقالات تو عام طور پر لکھے جاتے ہیں۔ میں کوئی مزاحیہ مضمون ضرور لکھوں چنانچہ میں نے اہم طرف دار ہیں غالب کے سخن ور نہیں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جو بہت پسند کیا گیا۔ اس وقت تک مزاح لکھنے کی اچھی خاصی مشق ہو چکی تھی اور دنیا بھر کے موضوع پر لکھنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ میں نے اس ضمن میں پاکستان کے کالم نگاروں خصوصاً طنز نگاروں کو بہت ذوق و شوق سے پڑھا ہے۔ خاص طور پر نصر اللہ خاں ابراہیم جلیس اور منو بھائی وغیرہ کو

۔اس کے علاوہ ا جنگ " کے شفیع عقیل اور ا ملاپ " کے فکر تونسوی کا کالم بہت اشتیاق سے پڑھا ۔میں ابن انشار کا بڑا مداح رہا ہوں ۔میں ان کی تحریریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا تھا۔ان کے سفرنامے میں نے ا جنگ "میں پڑھے ا سیاست" کے دفتر میں ا جنگ " تبادلے میں آتا تھا تو میں ان کے کالم کا منتظر رہتا تھالیکن دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے باعث اخبارات کا تبادلہ بند ہو گیا۔جس کے باعث ابن انشا کا کالم کبھی ملتااور کبھی نہیں ملتا۔میں نے اس کے بعد طنز و مزاح کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کیااور پطرس وغیرہ کو از سر نو پڑھا۔مغرب کے مزاح نگاروں مثلاً مارک ٹوئن جارج لو کاش ۔ووڈ ہاؤس اور آرٹ بوکو الڈ وغیرہ کی خاصی کتابیں پڑھیں ۔اس دوران میں نے یہ کیا کہ طنز و مزاح نگاری کے فروغ کے لئے مزاح کو اسٹیج پر لے آیا۔ہندوستان میں کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ہیومر کو اسٹیج پر لایا جاسکتا ہے ۔میں نے اسے ایک تحریک کی شکل دینے کی کوشش کی اور 1966 ءمیں میں نے حیدر آباد میں مزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس منعقد کی ۔جس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے اور صدارت کرشن چندر نے کی ۔اس میں سوائے رشید احمد صدیقی کے ۔راجندر سنگھ بیدی وغیرہ تمام ادیبوں نے شرکت کی۔کنہیالال کپور علیل تھے۔اس لئے وہ اس میں شرکت نہ کر سکے"

اابراہیم جلیس آپ کے بھائی تھے اور وہ طنز نگار بھی بہت اچھے تھے آپ نے ان کا کوئی اثر قبول کیا؟"

"جہاں تک ان کی تحریروں کا تعلق ہے ۔میں نے اثر قبول کیا ہے لیکن ان کی صحبت میں رہنے کا بہت کم موقع ملا۔اس لئے کہ وہ حیدر آباد میں رہتے تھے اور میں گلبرگہ میں۔وہ چھٹیوں میں آتے تھے تو ملاقات ہوتی تھی۔وہ تعلیم کے سلسلے میں بہت دن علی گڑھ میں رہے۔جب وہ بہت نوعمر تھے یعنی بیس اکیس سال کی عمر میں ان کی ہندوستان گیر شہرت ہو چکی تھی ۔ان کی شادی بھی گلبرگہ کے ایک تاجر کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔میں ان کی تحریریں پڑھتا تھا۔تو ظاہر ہے متاثر بھی ہوتا تھاان کا پہلا مجموعہ اکیئس بائیس سال کی عمر میں شائع ہو چکا تھا۔شادی کے تین چار سال بعد وہ 49 ءمیں پاکستان چلے گئے۔ میرا خیال ہے وہ جب ہندوستان سے گئے ۔اس وقت ان کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی ۔وہ جب ہندوستان سے گئے۔اس وقت میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔جلیس صاحب سے میرا بہت کم رابطہ رہا۔اس لئے کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں عموماً گلبرگہ سے باہر رہے۔وہ علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد بھی حیدر آباد میں ہی رہے۔پولیس ایکشن کے بعد ایک دن معلوم ہوا کہ وہ چپکے سے پاکستان چلے گئے ہیں ۔میں نے جب پہلا مضمون لکھا تو میں نے انہیں اس کا تراشہ بھیجا۔وہ لوگوں سے اس کا بڑے

پیار سے ذکر کرتے تھے۔ کرشن چندر نے انتقال سے قبل انہیں جو خط لکھا تھا۔ اس میں میرا بھی ذکر کیا تھا اور لکھا تھا ا پاکستان میں تم نے دھوم مچا رکھی ہے اور ہندوستان میں مجتبیٰ حسین نے۔ جلیس صاحب نے میرے نام اپنے خط میں کرشن چندر کا یہ فقرہ نقل کر کے بھیج دیا تھا۔ جس سے مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔ انہوں نے ہی نصراللہ خاں کو میری پہلی کتاب تکلف برطرف دی تھی۔ جس پر نصراللہ خاں صاحب نے کالم بھی لکھا تھا اور اس میں میری کتاب کے بعض اقتباسات بھی دیئے تھے۔ اس وقت مجھے مزاح لکھتے ہوئے صرف پانچ چھ سال ہوئے تھے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سجاد ظہیر کی صاحبزادی نجمہ ظہیر اور ان کے شوہر علی باقر اپنی دس سالہ بچی کے ساتھ پہنچ گئے۔ علی باقر کے نام سے پہلے ہی واقف تھا وہ جب لندن میں تھے تو ان کے افسانے "شمع" دہلی میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ پھر وہ ہندوستان واپس آ گئے تو شمع، عصری ادب اور عصری آگہی وغیرہ میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا تھا۔ نجمہ ظہیر پنڈت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے وابستہ تھیں اور شہر سے بہت دور رہتی تھیں۔ اس ملاقات میں نہ نجمہ سے سجاد ظہیر کے بارے میں کھل کر باتیں ہوئیں اور نہ رضیہ سجاد ظہیر کے بارے میں۔ صرف علی باقر شروع سے آخر تک چہکتے رہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس موقع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بھی مدعو کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد سے انہیں خاص طور پر فون بھی کیا تھا۔ لیکن انہوں نے علالت کے باعث آنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔

میری آمد سے چند روز قبل اردو اکیڈیمی میں افسانے پر ایک ورک شاپ منعقد ہو چکا تھا۔ جس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر گوپی چندر نارنگ تھے اور جس میں 60ء کی دہائی کے لکھنے والے افسانہ نگاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس ورکس شاپ میں پہلے ہر افسانہ نگار اپنا پسندیدہ افسانہ پڑھتا تھا۔ اس کے بعد کوئی ناقد اس افسانے کا تجزیہ پیش کرتا تھا اور تجزیے میں افسانہ اور افسانہ نگار کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ علی باقر سے بھی اس ورک شاپ میں افسانہ پڑھوایا گیا۔ لیکن ان کے افسانے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔ جس کے باعث وہ گوپی چند نارنگ سے سخت ناراض تھے۔

دہلی کے دورے سے معلوم ہوا کہ گوپی چند نارنگ کے جہاں بہت سے حامی ہیں وہاں بہت سے مخالف بھی ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن بھی۔ ان کا شمار ہندوستان کی انتہائی متنازعہ فیہ شخصیتوں میں ہوتا ہے اور یہی ان کی اہمیت کا راز بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص جتنا اہم ہوتا ہے وہ اتنا ہی متنازعہ فیہ بھی

ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے دعوت کا بڑے پُر تکلف انداز میں اہتمام کیا تھا اور انواع واقسام کے کھانے بنوائے تھے۔ ان میں حیدر آباد کی خاص ڈش یعنی بگھارا بیگن بھی شامل تھا جس کے بغیر حیدر آبادیوں کی کوئی دعوت مکمل تصور نہیں کی جاتی ہے۔ میں اگرچہ کھٹے سالن سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا لیکن میں نے اُسے بہت لطف لے لے کر کھایا۔ کھانے کے دوران نجمہ ظہیر اور علی باقر سے دلچسپ گفتگو رہی۔ میں نجمہ ظہیر سے مل کر سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کے بارے میں معلومات خصوصاً ان کے آخری ایام کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور بات طے پائی تھی کہ میں کلکتے سے واپسی کے بعد ان دونوں سے ضرور ملوں گا لیکن مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ ان دنوں نجمہ کی چھوٹی بہن نادرہ اور راج ببر کی علیحدگی اور راج ببر اور سمیتا پاٹل کے رومانس کی بڑی افواہیں گرم تھیں لیکن میں نے اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سجاد ظہیر کی چار لڑکیوں میں سے تین نے ہندوؤں سے شادی کی اور تینوں سماجی اور ازدواجی مسائل سے دوچار ہوئیں۔ ان دنوں ہندوستانی مسلمانوں کے روشن خیال متوسط طبقے میں ہندو مسلم شادی کا رواج تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ رجحان ان لوگوں میں عام ہے جو زیادہ ترقی پسند اور وسیع النظر ہیں۔

ضیافت کے بعد جب مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے تو میں نے بھی مجتبیٰ حسین سے اجازت چاہی۔ اس پر مجتبیٰ حسین نے کہا "آیئے میں آپ کو مسز اندرا گاندھی کی رہائش گاہ دکھاؤں۔"

انہوں نے مجھے اپنے ویسپا میں بیٹھایا ہیلمیٹ پہنا اور روانہ ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ دھلی میں ہیلمیٹ کے بغیر اسکوٹر چلانے کا بالکل رواج نہیں ہے اور جو لوگ ہیلمیٹ کے بغیر اسکوٹر چلاتے ہیں فوراً چالان کر دیئے جاتے ہیں۔ کراچی میں بھی چند سال قبل اسکوٹر چلانے والوں کے لئے ہیلیمیٹ پہننا قانونی طور پر ضروری قرار دیا گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ پابندی اٹھادی گئی۔

مجتبیٰ حسین اپنی اسکوٹر چلاتے ہوئے سیدھے مسز اندرا گاندھی کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچ گئے اور رکنے کے بجائے اسکوٹر کی رفتار سست کر دی تاکہ میں اطمینان سے ان کی رہائش گاہ کو دیکھ سکوں۔ اس وقت تک اندرا گاندھی کی رہائش گاہ عوام الناس کو دیکھنے کے لئے کھلی نہیں تھی۔ سنا ہے میرے آنے کے بعد اسے قومی یادگار کے طور پر عام لوگوں کے درشن کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ میں "ٹائم" اور "نیوز ویک" میں اندرا گاندھی کی رہائش گاہ کا نقشہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اسے پہچاننے میں دیر نہیں ہوئی۔ میں نے ان کی سکریٹریٹ اور ان کی رہائش گاہ کے درمیان کا وہ ٹیرس بھی دیکھا جہاں

ان کے سکھ بوڈی گارڈ نے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے ان کے جسم کو چھلنی کر دی تھی۔ یکلخت مجھے خیال آیا۔ ہندوستان کی یہ خاتون آہن، موت کے سامنے کتنی کمزور ثابت ہوئیں اور سکھ پہرے داروں کے بارے میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کس طرح موت کا سبب بنی۔

دربار صاحب پر حملے کے نتیجے میں جو خونی ڈراما شروع ہوا ہے۔ معلوم نہیں اس کا کیا انجام ہو گا لیکن یہ خونی ڈراما ابھی جاری ہے اور بے شمار لوگ اس کے شکار ہو چکے ہیں اور شکار ہو رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے مجھے دور سے وزیراعظم راجیو گاندھی کی رہائش گاہ بھی دکھائی۔ جس کے سامنے سڑک بند تھی اور عام لوگوں کے آنے جانے پر پابندی عائد تھی۔ وہ پھر مجھے لے کر پارلیمینٹ ہاؤس کے سامنے پہنچے جہاں ساٹھ کروڑ عوام کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے اور جو آزادی سے قبل سینٹرل لیجلسیٹو اسمبلی کہلاتی تھی اور کانگرس اور مسلم لیگ کے منتخب نمائندے قانون سازی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ یہی وہ عمارت تھی جہاں سے عرصے تک متحدہ ہندوستان پر کانگرس نے حکومت کی اور وہ آج بھی حکومت کر رہی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے پارلیمینٹ ہاؤس کا ایک چکر لگانے کے بعد مجھے انڈیا گیٹ پہنچا دیا۔ جہاں میں نے اس عظیم الشان عمارت کا ایک بار پھر نظارہ کیا اور برطانوی طرز تعمیر کا قائل ہو گیا۔

صغریٰ مہدی

ذاکر نگر میں شمس الزماں کے ہاں قیام کے دوران ایک روز میں نے سوچا کہ میں جب ذاکر نگر میں ہوں تو مجھے محترمہ صالحہ عابد حسین اور صغریٰ مہدی سے ضرور ملنا چاہیئے۔ صغریٰ مہدی مجھے پہلے ہی اپنے ہاں مدعو کر چکی تھیں اور میں ان سے ملنا اور ان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ دراصل مجھے صغریٰ مہدی کی تحریریں بہت پسند تھیں اور میں ان کی ذات اور ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں جاننے کا مشتاق تھا، چنانچہ ایک روز میں ان کے گھر عابد ولا پہنچ گیا جو جامعہ ملیہ کے قریب جامعہ نگر میں واقع تھا۔

عابد ولا پرانے طرز کا ایک منزلہ بنگلہ تھا۔ باغبانی کے لیے کافی جگہ موجود تھی، لیکن باغبانی کا نام و نشان نہ تھا۔ کال بیل سنتے ہی ڈاکٹر صغریٰ مہدی نظر آئیں۔ علیک سلیک کے بعد مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا جو دراصل ہندوستان کے متوسط طبقہ کے مسلم گھرانے کی بیٹھک تھی۔ پاکستان کے متوسط طبقہ کے ڈرائنگ رومز جیسی ٹھاٹ باٹ یا آرائش نہیں تھی۔ چند قدیم وضع کے فرنیچر اور میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جس سے پاکستان اور ہندوستان کے متوسط طبقے کے معیار زندگی کا فرق واضح ہو رہا تھا۔ میں صغریٰ مہدی سے ملنے سے قبل ماہنامہ "کتاب نما" میں ان کی تحریریں پڑھ چکا تھا، خصوصاً ان کے افسانے اور امریکہ کا سفرنامہ جس سے میں بہت متاثر ہوا تھا، لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ نصف درجن ناولوں اور افسانوں کے ایک مجموعے کی مصنفہ بھی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں کتنا بعد قائم ہو چکا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں کی ترسیل کی سہولت نہ ہونے کے باعث ہندوستان کے بہت سے اچھے مصنفین کی تصانیف ہماری نظروں سے اوجھل تھیں اور پھر صغریٰ مہدی جیسی مصنفہ، جو پبلک ریلیشنز کے فن سے قطعی ناآشنا تھیں اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں شائع بھی نہ ہوتی تھیں۔ ان سے اگر میں واقف نہ تھا تو کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے۔ صغریٰ مہدی مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر تھوڑی دیر کے لیے اندر چلی گئیں۔ میں تنہا بیٹھا ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتا رہا۔ صغریٰ

مہدی کے واپس آتے ہی میں نے سب سے پہلے ان کے امریکہ کے سفرنامے، خصوصاً ان کے طرز تحریر کی تعریف کی اور ان کے بارے میں سوالات کی بوچھار کر دی۔

صغریٰ مہدی نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ 1938 ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد علی مہدی، بیگم صالحہ عابد حسین کے قریبی رشتہ دار تھے۔ ان کے والدین کے انتقال کے بعد محترمہ صالحہ عابد حسین نے ان کی اپنی بچی کی طرح پرورش کی۔ اس لیے محترمہ صالحہ عابد حسین ہی صغریٰ مہدی کی والدہ تھیں۔ انہوں نے 1955 ء میں میٹرک، 1960 ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے، 1961 ء میں بی ایڈ اور اسی سال ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد 1967 ء میں ایم ایڈ بھی کر لیا۔ انہوں نے 1977 ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ان کے مقالے کا موضوع "اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ" تھا۔

انہوں نے اپنی پہلی کہانی 1960 ء میں بی۔ ایڈ کرنے کے دوران "آتش خاموش" کے عنوان سے لکھی، لیکن ان کی شائع ہونے والی پہلی کہانی کا عنوان "ایک سوال" ہے۔ جو 1960 ء میں ماہنامہ "بانو" دہلی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے وہ آل انڈیا ریڈیو اور ماہنامہ "کتاب نما" (دہلی "آج کل" (دہلی) اور دیگر رسالوں میں مسلسل لکھ رہی ہیں۔ انہوں نے 67 ء تک سکول میں سات سال پڑھایا۔ اس کے بعد وہ 1969 ء میں کالج سے وابستہ ہو گئیں۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ پھر وہ 1977 ء میں جامعہ ملیہ سے وابستہ ہو گئیں۔

یہ جان کر میں حیران رہ گیا کہ ان کے اب تک چھ ناول اور افسانوں کا ایک مجموعہ "پتھر کا شہزادہ" شائع ہو چکا ہے۔ ان کا پہلا ناول "کوئی درد آشنا بھی نہیں" 1970 ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "پابہ جولاں" 1973 ء میں، "دھند" 76 ء میں "پروائی" 79 ء میں، راگ بھوپالی" 84 ء میں اور افسانوں کا مجموعہ 74 ء میں شائع ہوا۔ اتنی ساری کتابوں کی مصنفہ سے عدم واقفیت پر میں دل ہی دل میں خفت محسوس کرتا رہا اور صاف طور پر اعتراف کیا کہ میں نے ان کے سفرنامے کے سوا کچھ بھی نہیں پڑھا وہ بھی اس طرح کہ ان کا امریکہ کا سفرنامہ ماہنامہ "کتاب نما" میں قسط وار شائع ہوا۔ صغریٰ مہدی نے مجھے اپنا پہلا ناول "کوئی درد آشنا بھی نہیں" کا ایک نسخہ عنایت کیا۔ صغریٰ مہدی کے پاکستان میں مشہور نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ جدیدیت پسند یا علامت نگار نہیں ہیں۔ وہ سیدھے سادے حقیقت پسند افسانے لکھتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکستان میں کوئی لابی نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جدیدیت پسند اور علامت نگار نہ ہونے کے باعث ہندوستان کے آواں گارڈ رسائل میں ان کے افسانے

شائع نہیں ہوتے ہیں اور نہ جدیدیت پسند ناقدین ان کے افسانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر صغریٰ مہدی پاکستان میں زیادہ نہیں پہچانی جاتی ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

صالحہ عابد حسین

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ محترمہ صالحہ عابد حسین کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ان کے افسانے، مضامین اور ناول تو پڑھتا رہا تھا، لیکن ان سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ صالحہ عابد حسین بہت ضعیف ہو چکی تھیں، لیکن لکھنے کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ میری دلی آمد سے چند روز قبل دہلی اردو اکیڈیمی کی جانب سے منعقدہ عالمی افسانہ سیمینار میں انہوں نے ایک سیشن کی نہ صرف صدارت کی تھی، بلکہ اس میں افسانہ بھی سنایا تھا اور بحث و مباحثے میں سرگرمی سے حصہ بھی لیا تھا۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ادبی سرگرمیوں میں دل و جان سے شریک تھیں۔

صالحہ عابد حسین سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ وہ بہت ہی محبت اور شفقت سے پیش آئیں اور پاکستان کے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کے بارے میں دریافت کرتی رہیں۔ وہ برصغیر ہندوستان اور پاکستان کی خواتین افسانہ نگاروں میں ممتاز اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ وہ مشہور زمانہ ماہر تعلیم ڈاکٹر عابد حسین کی رفیقہ حیات ہیں۔ وہ خوب صورت اور رواں دواں نثر لکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی حلقوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور دلی اردو اکیڈیمی کی بزرگ اور اہم ممبر ہیں۔ وہ بڑی شفقت کے ساتھ میری بیوی بچوں کے بارے میں دریافت کرتی رہیں اور وعدہ کیا کہ وہ پاکستان آئیں گی تو مجھے ضرور مطلع کریں گی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ چند ماہ کے بعد پاکستان آئیں۔ صغریٰ مہدی نے مجھے خط لکھ کر ان کی کراچی آمد کی تاریخ اور ان کے پتے سے مطلع بھی کیا، لیکن میں بوجوہ ان سے فوری طور پر نہ مل سکا اور ملا تو اس وقت ملا جب وہ چند دنوں کے بعد ہندوستان واپس جا رہی تھیں۔ انہیں مجھ سے شکایت پیدا ہو گئی انہوں نے بڑی محبت سے گلہ کیا کہ "میں تو آپ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن آپ ہی نہ ملے اور ملے تو اس وقت، جب میں واپس جا رہی ہوں۔"

پاکستان میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہونے کا مجھے شدید افسوس تھا۔ یہ قلق اس وقت مزید بڑھ

گیا جب ان کے ہندوستان واپس جانے کے چند ماہ بعد ان کی وفات کی اطلاع موصول ہوئی۔ کاش میں نے ان کی معیت میں چند گھنٹے گزارے ہوتے۔

مظفر حنفی

ڈاکٹر مظفر حنفی جامعہ نگر میں بٹلہ ہاؤس میں رہتے تھے۔ ان سے میری کبھی خط و کتابت ہی نہیں رہی اور نہ میں ان سے دوستی اور یاری کا دعویٰ کر سکتا ہوں، البتہ میں ان کی تحریروں سے اور وہ میری تحریروں سے واقف تھے، لہذا جامعہ ملیہ میں ان سے اچانک ملاقات ہو گئی اور کرشنا بھابی نے ان سے تعارف کرایا تو ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ جامعہ ملیہ میں شعبہ اردو سے وابستہ تھے اور کسی کام سے دفتر آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان کا پتہ معلوم کیا تو انہوں نے میری ڈائری میں اپنا پتہ درج کر دیا۔

صغریٰ مہدی سے ملنے کے بعد میرے پاس کافی فاضل وقت تھا اور ان کا مکان عابد ولا کے بالکل قریب واقع تھا، چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ان سے مل لوں۔ معلوم نہیں پھر ملنے کا موقع ملے، نہ ملے، چنانچہ میں ان کے مکان کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ بٹلہ ہاؤس شاید کسی عمارت کا نام ہے، لیکن معلوم ہوا کہ بٹلہ ہاؤس مکان کا نہیں، بلکہ محلے کا نام ہے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ بہر حال تلاش کر کے گھر مل ہی گیا۔

مظفر حنفی اتفاق سے گھر پر موجود تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور ڈرائنگ روم کھلوا کر ناچیز کو بٹھایا اور بڑی دیر تک مختلف ادبی موضوعات، خصوصاً جدیدیت کے رجحان پر گفتگو ہوتی رہی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرا کلکتے سے تعلق ہے تو وہ بڑی دیر تک کلکتے کے ادیبوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کو بنگال، خصوصاً کلکتہ کے ادیبوں سے نہ صرف دلچسپی ہے، بلکہ وہ ان کے بارے میں گہری معلومات بھی رکھتا ہے۔ مظفر حنفی نے کلکتہ کے بھی ادیبوں اور شاعروں کا نہایت محبت سے ذکر کیا ان میں سے بیشتر میرے دوست نکلے۔

میں نے دلی کے سولہ روزہ قیام کے دوران بہت سارے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کی، لیکن کسی ادیب نے بھی کلکتہ کے ادبا و شعراء سے اس دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جیسا کہ مظفر حنفی نے کیا۔

مظفر حنفی کی کلکتہ کے ادیبوں سے دلچسپی اس لیے بھی تعجب خیز تھی کہ ماضی قریب میں دلی اور لکھنؤ کے ادبار مشرقی ہندوستان کے ادیبوں، خصوصاً بہار اور بنگال کے ادیبوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے، جس طرح آج لاہور کے ادیب و شاعر کراچی کے ادیبوں و شاعروں کو اہمیت نہیں دیتے ہیں، لیکن یہ مظفر حنفی تھے، جنہوں نے بنگال کے ادیبوں کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ اسی لیے وہ کلکتہ میں دلی کے ادبار میں سب سے زیادہ مقبول تھے۔

انہوں نے بتایا کہ اس وقت ہندوستان کے مخصوص حالات کے باعث ادبی مراکز دوسری جگہ منتقل ہو چکے ہیں۔ پہلے دلی اور لکھنؤ اردو کے اہم مراکز تھے، لیکن حصول آزادی کے بعد اب غیر ہندی علاقے اردو ادب کے اہم مراکز بن چکے ہیں مثلاً بمبئی، حیدر آباد، پٹنہ اور کلکتہ۔ اس کی وجہ حکومت ہند کی لسانی پالیسی، خصوصاً یو۔ پی اور مدھیہ پردیش میں اردو دشمن فضا رہے، لہٰذا اب غیر ہندی علاقوں میں اردو شعر و ادب کا زیادہ چرچا ہے۔ بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ جس کی وجہ سے اردو رسائل و کتب کی سب سے زیادہ نکاسی بہار میں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا شمار ہندوستان کے اہم ناقدوں میں ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کی طرح پاک و ہند میں زیادہ مشہور نہیں تھے (ان کی شہرت کی وجہ کچھ اور ہے) لیکن آزادی کے بعد جو معدودے چند اہم ناقدین منظر عام پر آئے، ان میں مظفر حنفی بھی شامل تھے۔ وہ اگرچہ پیشے کے اعتبار سے معلم تھے اور تنقید بھی لکھتے تھے، لیکن وہ عام تدریسی ناقدین سے مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے تنقیدی مضامین بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ وہ ابھی تک پچاس سے زیادہ کتابیں لکھ چکے تھے اور اتفاق سے ان کی عمر بھی پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ شاعر ہیں، خاص طور پر غزل گو شاعر، لیکن وہ شاعری کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ وہ تنقید کے علاوہ تحقیق و تدوین کے کام سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اردو کی کئی قدیم تصانیف کی بڑی باریک بینی کے ساتھ تدوین کی ہے۔ میرے لیے خوشی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ افسانہ نگار بھی تھے اور بچوں کا ادب بھی تصنیف کرتے ہیں اور گاہے گاہے تراجم کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

ان کا اصل نام محمد ابو المظفر ہے۔ آبائی وطن قصبہ ہسوہ (ضلع فتح پور، یو۔ پی) ہے۔ وہ یکم اپریل 1936ء کو کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ہائی سکول تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ نو عمری سے شعر گوئی شروع کی اور اپنے ادبی سفر کا 1949ء سے آغاز کیا۔ جب وہ مڈل سکول کے طالب علم تھے۔

1959 ء میں انہوں نے کھنڈوا سے ماہنامہ " نئے چراغ " جاری کیا، جسے اس دور کے اچھے ادیبوں کا تعاون حاصل ہوا۔ 1960 ء میں وہ مدھیہ پردیش کے محکمہ جنگلات میں ملازم ہو گئے پھر مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) سے بی۔ اے کیا، نیز بھوپال یونیورسٹی سے ایم۔اے، ایل۔ ایل۔ بی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع "شاد عارفی کی شخصیت اور فن" تھا۔ وہ 1976 ء سے جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ انہیں نیشنل کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن (دہلی) کا قومی اعزاز، کل ہند میر اکادمی (لکھنؤ) کا میر ایوارڈ اور کلچرل اکادمی (گیا) کا ملک حیدر ایوارڈ مل چکا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں اتر پردیش، دہلی، بہار، مغربی بنگال اور آندھرا پردیش کی اردو اکادمیوں سے ان کی اٹھارہ کتابوں کو انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی سے بہت دیر تک گفتگو جاری رہی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ بیسویں صدی، روبی اور دیگر کمرشل رسالوں کے مضامین کی بھی تدوین کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں فاضل آمدنی ہو جاتی ہے۔

چند لمحے ہوم منسٹری میں

میں نے جوگندر پال جی سے کہا کہ "میں ہندوستان کے مزید چار شہر لکھنو، الہ آباد، رانچی اور دھنباد جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے بہت سے دوست واحباب اور رشتے دار ہیں۔ کیا مجھے ویزا مل جائے گا؟

"کیوں نہیں؟ بالکل مل جائے گا، لیکن اس کے لیے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے پاس جانا پڑے گا۔ وزارت داخلہ میں ان کا بہت اثر ہے۔ وہ عموماً پاکستانیوں کو ویزا دلواتے رہتے ہیں، لیکن اس کے لیے درخواست دینی پڑے گی"۔

میں نے شمس الزماں سے کہا، "یار، محکمہ داخلہ کے نام فوراً ایک درخواست ٹائپ کر دو، تاکہ مجھے چار مزید شہروں کا ویزا مل جائے۔ اتنے دنوں کے بعد ہندوستان آیا ہوں، کیوں نہ لکھنو، الہ آباد، رانچی اور دھنباد بھی ہو آؤں"۔

شمس الزماں نے فوراً درخواست ٹائپ کر کے میرے حوالے کر دی اور میں جوگندر پال جی کے ساتھ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی رہائش گاہ روانہ ہو گیا۔ بیدی جی، پال جی کے گھر کے قریب گریٹر کیلاش میں ہی رہتے تھے، چنانچہ پندرہ بیس منٹ میں ہم لوگ ان کے ہاں پہنچ گئے۔

کال بیل بجاتے ہی ان کے ملازم نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پال جی کو پہچانتا تھا، چنانچہ وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ ملازم نے بتایا کہ مہندر جی اس وقت غسل کر رہے ہیں۔ ہم دونوں ان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ان کا ایک اور مہمان وارد ہوا۔ پال جی نے ان سے تعارف کر دایا۔

"ان سے ملیے آپ جاوید دشمنت ہیں۔ چنڈی گڑھ سے آئے ہیں"۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ ہم بڑے تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر میں مہندر جی بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ان کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اس

لیے انہیں پہلی نظر میں پہچاننا مشکل ہوا۔ میں نے انہیں کبھی اس حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ میں ان سے کراچی میں پہلے بھی مل چکا تھا، خصوصاً مشاعروں اور شعری نشستوں میں۔ وہاں وہ بہت ہی مختلف نظر آتے تھے، لیکن یہ ان کا گھر تھا اور لمبی لمبی زلفیں ہونے کی وجہ سے وہ قطعی مختلف روپ میں وارد ہوئے۔

پال جی نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ انہوں نے رئیس امروہوی اور کراچی کے دوسرے شعراء کے بارے میں دریافت کیا۔ پال جی نے انہیں اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ اور ماہنامہ "توازن" مالیگاؤں کا وہ شمارہ پیش کیا جس میں ان کا گوشہ شائع ہوا تھا۔ پھر انہوں نے میری آمد کی غرض بتائی۔ بیدی جی نے کہا، "میں کل صبح ہی چندی گڑھ جا رہا ہوں، ورنہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر خود ہوم منسٹری جاتا، لیکن آپ کا کام ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔ میں ایچ۔ ایس۔ گابا صاحب کو خط لکھ دیتا ہوں۔ وہ آپ کا کام کر دیں گے اور میں اپنے دوست نار نگ ساقی کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو کل صبح آپ کی رہائش گاہ سے پک اپ کر لیں گے"۔

انہوں نے دریافت کیا "آپ کا اس وقت کہاں قیام ہے؟"

پال جی نے کہا، "میرے ہاں، نار نگ ساقی میرے گھر سے واقف ہیں"۔

اس کے بعد انہوں نے فوراً نار نگ ساقی کو فون کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ مجھے صبح نو بجے پال جی کے گھر سے اپنے ساتھ لے کر ہوم منسٹری جائیں اور گابا صاحب سے مل کر میرا کام کروا دیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر ایک طویل سفارشی خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔

پال جی نے نار نگ ساقی کے بارے میں بتایا کہ وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ وہ دہلی کے بڑے بزنس مین ہیں اور بیدی جی کے بڑے معتقد بھی۔ وہ بیدی جی کا کہا کبھی نہیں ٹالتے ہیں۔ اس کا ثبوت مجھے دوسرے دن مل گیا۔ ابھی میں ناشتہ سے فارغ ہی ہوا تھا کہ پال جی کے گھر کے نیچے ان کی کار کا ہارن بجنا شروع ہو گیا۔ پال جی مجھے لے کر نیچے اترے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں ان کی کار پر روانہ ہو گیا۔

ساقی جی نے بتایا کہ وہ بھی لاہور کے رہنے والے ہیں۔ تقسیم کے بعد دہلی آ گئے تھے اور یہاں انہوں نے اپنا "چھوٹا موٹا" کاروبار شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے ساتھ کئی بار لاہور جا چکے ہیں"۔

میں نے کہا "لیکن آپ کراچی کبھی نہیں آئے، ورنہ مجھے ضرور معلوم ہو جاتا۔ بیدی جی جب بھی کراچی آئے۔ میں ہمیشہ ان سے ملنے حاضر ہوا"۔

انہوں نے کہا کہ "اہل کراچی نے کبھی مدعو ہی نہیں کیا۔ میں کیسے آتا!"

میں بھلا اس کا کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر میں ان کی کار ان کے گھر کے سامنے رک گئی اور وہ مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی ڈائننگ روم تھا اور کھانے کی میز پر مختلف انواع کی مٹھائیاں اور ناشتے سجے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ناشتہ کیے بغیر مجھے لانے کی غرض سے پال جی کے گھر پہنچ گئے تھے کہ کہیں میں ان کا انتظار کرتے کرتے اکتا نہ جاؤں۔

میں نے اس کرم پر ان کا خاص طور پر شکر ادا کیا۔ انہوں نے ناشتہ کرنے کی درخواست کی۔ جس پر میں نے معذرت کر لی۔ اس لیے کہ میں پال جی کے ہاں سے ناشتہ کر کے چلا تھا اس لیے مزید ناشتے کی گنجائش نہ تھی، تاہم ان کے اصرار پر تھوڑی سی مٹھائی اور ایک کپ چائے قبول کر لی۔

ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی وہ مجھے لے کر سیدھے ہوم منسٹری کے دفتر پہنچے۔ استقبالیہ سے میرے نام کی پرچی بنوائی اور ہم دونوں لفٹ پر گاباصاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ساقی جی نے گاباصاحب کو بیدی جی کا خط پیش کیا۔ وہ چند لمحے خاموشی کے ساتھ خط کا مطالعہ کرتے رہے پھر نہایت انکساری کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آج کل ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اچھے نہیں جا رہے ہیں، خصوصاً پنجاب میں دہشت گردی کے واقعات اور اس میں پاکستان کے ملوث ہونے کے باعث پاکستانیوں کو مزید شہروں کے لیے ویزا جاری کرنے پر قطعی پابندی لگا دی گئی ہے، البتہ یہ کام مجھ سے اعلیٰ اتھارٹی انجام دے سکتی ہے۔ مجھے نئے شہروں کا ویزا جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اگر کوشش کروں تو بھی آپ کو اس کے لیے آٹھ دس دن انتظار کرنا پڑے گا۔ آپ جہاں جہاں جانا چاہتے ہیں اور جن جن لوگوں کے ہاں قیام کرنا چاہتے ہیں، وہاں پہلے پولیس انکوائری ہو گی۔ اس کے بعد آپ کو ویزا ملے گا۔ اگر آپ اتنے دن انتظار کر سکتے ہیں تو پاسپورٹ کے ساتھ اپنی درخواست داخل کر دیجیے"۔

میں نے کہا "دہلی میں میرا مزید دو روز قیام ہے۔ میں آٹھ دس دن انتظار نہیں کر سکتا"۔

گاباجی نے اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں شکایت کرنے لگے کہ ہندوستان میں اب بھی ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں ہے جو پاکستان کے سلسلے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ڈھاکہ کے سقوط کا ہندوستانی مسلمانوں کو جس قدر دکھ ہوا۔ اتنا شاید پاکستان کے مسلمانوں کو بھی نہ ہوا ہو گا۔ جب بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان ہاکی یا کرکٹ ٹیسٹ میچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی مسلمان پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں اور ہندوستان کے ہارنے پر سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

گابا صاحب اس کے بعد بھی بہت کچھ کہنے کے موڈ میں تھے، لیکن مین ان سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ ساقی جی نے بتایا کہ اگر کنور مہندر سنگھ بیدی جی ہوتے تو مجھے ضرور ویزا مل جاتا۔ ان کے سامنے گابا صاحب انکار نہ کر پاتے اور اگر انکار کرتے تو وہ ان سے بھی اعلیٰ حکام تک پہنچ جاتے۔ بیدی جی کا حکومت میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ افسوس! مجھے ان کے رسوخ کو آزمانے کا موقع نہیں ملا۔

ہوم منسٹری سے باہر نکلا تو سلیم کوثر ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے میری جانب بڑھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ انبالہ کے مشاعرے سے ہو کر آئے ہیں اور اب سہارن پور اور دوسرے کئی شہروں میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کے لیے ویزا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر محمد حسن سے یوں تو میرے بہت پرانے مراسم تھے، یعنی 1959 ء سے۔ جب میں ہفت روزہ "آثار" (کلکتہ) سے وابستہ تھا، لیکن ان سے بالمشافہ ملاقات کراچی میں اس وقت ہوئی جب وہ پہلی بار پاکستان تشریف لائے۔ ان سے پہلی بار مل کر بڑی خوشی ہوئی اور وہ جب بھی پاکستان آئے۔ میں ان سے ملنے ضرور گیا، چنانچہ دہلی پہنچ کر ان سے نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن میں شارب ردولوی کے گھر پر مقیم تھا اور ان کا مکان ان کے گھر سے ایک گلی چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن میں ہی واقع تھا، چنانچہ میں ایک روز ان کے ہاں پہنچ گیا۔ میں نے فون پر انہیں اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔ اس طرح ان سے ملاقات ہو گئی۔

میرا مقصد ان سے ملنا اور تبادلہ خیالات کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کتاب "ردعمل" کے لیے ان سے فلیپ لکھوانا بھی تھا۔ محمد حسن بڑے تپاک سے ملے اور مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ بچے شاید اسکول گئے ہوئے تھے اور بھابی روشن آرا ریا تو باہر گئی ہوئی تھیں یا پھر گھریلو کاموں میں مصروف تھیں۔ اس لیے وہ نظر نہیں آئیں۔ میں نے ڈاکٹر محمد حسن سے گفتگو شروع کی اور ٹیپ آن کر دیا۔ میں دراصل ان سے ہندوستان کی ادبی صورتحال، ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں اور راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں ان کے خیالات جاننے کا مشتاق تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن افسانے کے بھی اچھے قاری اور ناقد ہیں اور وہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے بہت سرگرم رکن اور سرپرست بھی ہیں اور اپنے جریدہ "عصری ادب" کے ذریعے تحریک کو فروغ دے رہے ہیں۔

میں نے ترقی پسند مصنفوں کی غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "ترقی پسند مصنفوں کو اپنی غلطیوں کا کس حد تک احساس ہے؟ خصوصاً فن کو نظر انداز کر کے صرف احتجاجی ادب تخلیق کرنے کے ضمن میں؟"

ڈاکٹر محمد حسن نے کہا، "میں ذاتی طور پر غلطی کا قائل نہیں ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے،

ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس وقت جو صورتحال تھی اس میں اس قسم کا ادب پیدا ہونا کسی حد تک لازمی تھا، لیکن وہ صورتحال چونکہ قائم نہیں رہی اور بجائے اس کے کہ انقلابی لے آگے بڑھتی، انقلاب دشمن لے آگے بڑھی، اس لیے اس زمانے کی چیز غلط معلوم ہوئی اور سچوئشن نے اسے غلط قرار دیا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ آپ کس طرح کا ادبی معاملہ رکھتے ہیں۔ اگر انقلابی سچوئشن ہوگی تو لوگ انقلابی نظمیں لکھیں گے، لیکن اگر انقلابی سچوئشن نہ ہو تو آپ انقلابی نظمیں کاہے کو لکھیں گے، جو نہایت مہمل ہوگی۔ اس کے لیے سردار جعفری یا کسی اور پر الزام عائد کرنا مناسب نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پورا معاشرہ اور پوری صورتحال انقلابی سمت کی جانب جا رہی ہے یا نہیں؟ اگر جا رہی ہے تو ادب بھی اسی کے ساتھ جائے گا۔ خواہ اس کا ذریعہ اظہار جیسا بھی ہو۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ترقی پسندوں نے انقلابی نظریے کو قطعی میکانکی انداز میں برتنے کی کوشش کی۔ نظریے کو قبول کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ براہ راست اظہار کا ہے یعنی میکانکی طریقہ۔ جیسے سردار جعفری اور دوسری جانب فیض نے اختیار کیا، یعنی ایک جانب سردار جعفری اور دوسری جانب فیض ہیں۔ ایک جانب کرشن چندر اور دوسری جانب بیدی ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا، تو یہ غلط، میکانکی اور غیر مارکسی طریقہ ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ سردار جعفری یا کیفی اعظمی اس دور میں کھلی شاعری کر رہے تھے تو مجھے ان کی اس شاعری پر اعتراض نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ شاعری بھی ہو۔ جو لوگ کھلی شاعری نہیں کرتے۔ انہیں حق حاصل ہے کہ وہ نظریے کو اپنی شخصیت میں جذب کر کے بالواسطہ شاعری کریں۔ اگر وہ کھلے انداز میں بے چینی ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو دوسروں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ علامتی سطح پر شاعری کریں۔ ترقی پسندوں نے Exclusiveness کی غلطی ضرور کی ہے۔ اگر کوئی کسی مخصوص ذریعہ اظہار پر اصرار کرے تو یہ غلطی ہے۔ اظہار کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔ اصل بات یہ دیکھنا ہے کہ آپ کا ادب کے بارے میں مجموعی رویہ کیا ہے؟ آپ کی نظر کس طرف ہے؟ آپ کا طبقاتی شعور کس طرف ہے؟"

میں نے دریافت کیا، میں بیدی صاحب کے سلسلے میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔ بیدی کے دو ہم عصر افسانہ نگار منٹو اور کرشن چندر تھے۔ ان تینوں کے مجموعی کام کو سامنے رکھ کر کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ فنی نقطہ نظر سے ان میں سب سے اہم افسانہ نگار کون تھے، یہ تینوں افسانہ نگار گزر چکے ہیں اور ان کے درمیان زمانی فاصلہ بھی قائم ہو چکا ہے۔ آپ اس بارے میں بہ آسانی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ان تینوں کا سارا

کام ہمارے سامنے ہے۔

میرے اس سوال پر محمد حسن قدرے پریشان ہو گئے اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا، "ذرا ان کے اہم افسانوں پر غور کیجئے۔ بیدی کے جو بہترین افسانے ہیں۔ وہ "اپنا دکھ مجھے دے دو"۔ "لاجونتی" اور تھوڑے سے فاصلے پر ان کا "گرہن" ہے۔ ان کے یہ تین بہترین افسانے نکلیں گے۔ جہاں تک کرشن چندر کا سوال ہے تو ان کے افسانوں میں "بالکونی"، "جنت و جہنم" اور "زندگی کے موڑ پر" اور ان کا مشہور افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" ہے۔ ان کے یہ چار افسانے نکلیں گے۔ جہاں تک منٹو کا سوال ہے۔ ان کے افسانوں میں "موزل"، "ممد و بھائی" اور دو چار اور افسانے نکلیں گے۔ اگر افسانے کی عظمت کو لیا جائے تو میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ شاید منٹو کو ہی پہلے رکھنا پڑے گا"!

میں نے مزید جرح کی، "پرفیکشن کے اعتبار سے ان تینوں میں سب سے پرفیکٹ افسانہ نگار کون ہے؟ واضح رہے کہ منٹو کے بہت سے افسانے بہت کمزور ہیں۔ "

محمد حسن نے دریافت کیا "کمزور کن معنوں میں"؟

میں نے جواب دیا "فنی اعتبار سے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی معیار ہے اور وہ ہے فن"۔

محمد حسن نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، "میں نے ابھی جو بات عرض کی۔ وہ یہ تھی کہ اگر بہترین افسانوں کا موازنہ کیا جائے، یعنی چار چار افسانے تینوں کے لے لیے جائیں تو ٹوٹلٹی آف ورک سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ کرشن چندر نے بھی بہت لکھا ہے اور ان کے کمزور افسانے بھی بہت ہیں۔ بیدی نے ان دونوں کے مقابلے میں کم لکھا ہے۔ اس لیے ان کے کمزور افسانے بھی کم ہیں۔ منٹو نے بہت لکھا ہے اس لیے اس کے کمزور افسانے بھی بہت ہیں۔ یہ ایک پہلو ہے۔ جہاں تک افسانے کی نیٹنگ اور پرفیکشن کا سوال ہے وہ آپ کو بیدی کے ہاں ملے گا۔ ان کے پاس افسانہ بننے کا کرافٹ ہے۔ اس کے برعکس منٹو افسانے پر نظر ثانی کے لیے وقت نہیں نکالتے تھے۔ منٹو کی ساری خوبی یہی ہے کہ وہ ایک نشست میں افسانے لکھتے تھے۔ ان کے پاس بس ایک ہیمر (ہتھوڑا) تھا جس سے وہ کام لیتے تھے۔ کرشن چندر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ زبان اور فضا کی خوبصورتی کے ماہر تھے۔ وہ اس پر توجہ دیتے تھے۔ ان تینوں کے احاطہ کمال مختلف ہیں۔ میرا خیال ہے تھوڑا سا وقت اور گزرنے دیجیے تو شاید کچھ اندازہ ہو سکے"۔

میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا، "آپ نے پاکستان کے احتجاجی ادب کے بارے میں تھوڑا بہت لکھا ہے۔ آپ نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ پاکستان کے سارے ادیب احتجاجی ادب تخلیق کر رہے

ہیں۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے جواب دیا۔ "یہ تو میں نے نہیں کہا کہ پاکستان کے سارے ادیب احتجاجی ادب لکھ رہے ہیں"۔

میں نے مزید کریدا، "آپ کے خیال میں وہ کون کون سے ادیب ہیں جو احتجاجی ادب لکھ رہے ہیں"؟

محمد حسن نے کہا۔ "میں نے "عصری ادب" کا پاکستان ادب نمبر شائع کیا تھا۔ اس میں میں نے اس بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، پاکستانی ادب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ ادب جو ایک چھوٹا سا حلقہ تخلیق کر رہا ہے۔ یہ حلقہ ادبار کو ان تمام مسائل سے گریز کرنا سکھا رہا ہے، جو انہیں درپیش ہیں۔ وہ خود بھی اس سے گریز کر رہے ہیں ان کو مسائل کا احساس ہے، لیکن ان کے پاس ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ حلقہ لوگوں کی توجہ تین باتوں کی جانب مرکوز کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ پاکستانی تشخص کیا ہے؟ دوسرے وہ انہیں الجھاتے ہیں، تاکہ وہ اصل مسائل کی جانب توجہ نہ دیں اور یہ مسائل معرض بحث میں نہ آسکیں، یعنی اسلامیات اور مابعد الطبیعیات وغیرہ اور تیسرا، معاشرے میں ایک صحت مند تہذیبی ضمیر کا وجود۔ یہ تین چیزیں ہیں۔ پاکستان ادب میں تین رویے ملتے ہیں۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو ارباب اقتدار کے ساتھ ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے جو سوالات ان کو پریشان کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ارباب اقتدار کے ساتھ تو نہیں ہیں، لیکن چونکہ وہ ان چیزوں کو سامنے نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ دوسرا حل ڈھونڈتے ہیں، یعنی مابعد الطبیعیاتی اور وجدانی قسم کی چیزیں۔ اس پردے کے پیچھے آدمی غور کرے تو وہ چیزیں نظر آجاتی ہیں۔ اس کو وہ کبھی قومیت کے نام پر، کبھی اسلام کے نام پر اور کبھی بین الاقوامیت کے نام پر پیش کرتے ہیں۔ تیسرا وہ طبقہ ہے، جس کو واضح طور پر گھٹن کا احساس ہے۔ یہ بہت بڑا طبقہ ہے۔ یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ یہ آپ کا سوال ہے کہ میں نے کیسے سمجھ لیا کہ پاکستانی ادیب احتجاجی ادب لکھ رہے ہیں۔ میں چونکہ ان ادیبوں سے ذاتی طور پر مل چکا ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان علامتوں کا وہی مفہوم ہے جو میں سمجھ رہا ہوں۔ افسانہ نگاروں کا وہ طبقہ بہت بڑا ہے جو علامت استعمال کر رہا ہے۔ ان علامتوں کے پیچھے واضح طور پر بے چینی اور کرب نمایاں ہے۔ اس کو میں احتجاجی ادب کہتا ہوں"۔

میں نے نیا موضوع چھیڑا، "یہ بتائیے کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں جو افسانے لکھے

جارہے ہیں ان میں آپ کیا نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں؟ احتجاجی ادب کیا ہندوستان میں نہیں لکھا جارہا ہے؟

ڈاکٹر محمد حسن نے کہا، " لکھا جارہا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں احتجاجی ادب کم لکھا جا رہا ہے۔ آپ کی نظر سے میرے رسالے "عصری ادب" کا وہ شمارہ نہیں گزرا جو میں نے "تیسری آواز" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں میں نے ہندوستان میں لکھے جانے والے احتجاجی ادب کی نشان دہی کی تھی۔ اردو ادب کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم 1947ء کے بعد سے بہت حد تک الجھ گئے ہیں اور ایک طرح کا نوسٹلجیا اور کمپلیکس ہے کہ ہم بار بار اس کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات بھی ہے۔ ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ زبان کا بھی ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں معاشرے کے دوسرے پہلوؤں کی جانب جانے نہیں دیتیں۔ اس سے آپ کو دوسری زبانوں کے ادب سے اردو ادب کا فرق واضح ہو جائے گا۔ اردو ادب پورے ہندوستان سے اپنے آپ کو آئیڈینٹی فائی نہیں کر سکا۔ وہ ان لڑائیوں میں اس طرح شریک نہیں۔ جیسا کہ دوسری زبانوں مثلاً مراٹھی۔ تلیگو اور بنگلہ زبان کے ادیب شریک ہیں۔ ہندوستان میں جاری طبقاتی جنگ میں ہم اپنے آپ کو شریک نہیں کرتے ہیں"۔

میں نے سوال کیا، "کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو قومی دھارے سے الگ رکھ رہے ہیں؟"

ڈاکٹر محمد حسن نے جواب دیا، "کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ بہت ان چیریٹیبل بات ہوگی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں یہ احساس شدت کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ ہم اقلیتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ احساس روزانہ رونما ہونے والے فسادات کی وجہ سے اور بھی بڑھ رہا ہے۔ انہیں اس کا احساس ہے کہ ہماری زبان سے ترجیحی سلوک کیا جارہا ہے۔

میں نے دوبارہ دریافت کیا کہ "پاکستان اور ہندوستانی افسانے کا موازنہ کیا جائے تو آپ کے خیال میں ان میں نمایاں فرق کیا ہے؟

ڈاکٹر محمد حسن نے کہا، " پاکستان میں جو لنگڑے لولے افسانے لکھے جارہے ہیں۔ ان میں سالمیت نہیں ہے۔ ہندوستان کے افسانے میں بھی یہی صورتحال ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ پاکستان کے افسانے میں جینوین کرب ہے، جبکہ ہندوستان کے افسانے میں دوسری نوعیت کا کرب ہے۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ذکر کیا، مثلاً فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں۔ جہاں تک فکری عظمتوں کا سوال ہے وہ ہمارے ہاں بہت کم ہے۔ ہماری سیکنڈ لائن اتنی بھرپور نہیں ہے جتنی پاکستان میں ہے"۔

بلراج کومل

ایک روز جوگندر پال جی شام کے وقت مجھے بلراج کومل سے ملانے ان کے گھر لے گئے، جو ان کے گھر کے قریب ہی گریٹر کیلاش میں رہتے تھے۔ جب سے معلوم ہوا تھا کہ بلراج کومل، پال جی کے سمدھی ہیں۔ ان سے ملنے کی خواہش بڑھ گئی تھی۔ یوں تو میں بلراج کومل جی کو بہت عرصے سے پڑھ رہا تھا، لیکن ان سے ملنے یا ان سے خط و کتابت کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ محض شاعر نہیں، نثر نگار بھی تھے اور انہوں نے تنقید کے ساتھ افسانے بھی لکھے تھے اور ان کے تنقیدی مضامین اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ان ادیبوں میں سے تھے جو ادب کے نئے دھارے کو بالکل نظرانداز نہیں کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ صرف نئے دھارے کے ہو کر بھی نہیں رہ جاتے ہیں۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت بھائی تھی۔ وہ ایک دفعہ وزیر آغا کے صاحبزادے سلیم آغا قزلباش کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان بھی آئے تھے، لیکن صرف لاہور سے ہو کر واپس چلے گئے تھے اور کراچی والے ان سے ملنے سے محروم رہ گئے تھے۔ میں جب پال جی کے ساتھ ان کے گھر پر پہنچا تو وہ آفس سے آ چکے تھے۔ ان کی بیٹی نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر میں بلراج کومل آ گئے اور ہم "مشترکہ دلچسپی کے امور" پر باتیں کرنے لگے۔ یہ مشترکہ دلچسپی سوائے ادب کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بلراج کی پتنی ہاتھ میں ٹرے لے کر داخل ہوئیں۔ جس میں چند گلاسوں میں وہسکی اور چند میں شربت روح افزا تھا۔

میں نے محسوس کیا، شراب ہندوستان کے متوسط طبقے کی زندگی میں پوری طرح حاوی ہو چکی ہے اور مہمانوں کو بلا تکلف وہسکی یا رم پیش کرنا معاشرتی زندگی کا جز بن چکا ہے، جسے قطعی عیب تصور نہیں کیا جاتا۔ بلراج جی کی پتنی مہمانوں کو جس طرح شراب پیش کر رہی تھیں، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ سماجی رسم و رواج کا حصہ بن چکا ہے۔ معلوم نہیں انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں شراب نوشی سے قطعی شغف نہیں رکھتا، چنانچہ انہوں نے میرے لیے پہلے سے ہی شربت کا انتظام کر رکھا تھا۔ بلراج کومل اور جوگندر پال وہسکی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور میں شربت روح افزا سے۔ مجھ پر یہ

خوشگوار انکشاف ہوا کہ پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی روح افزار بہت مقبول ہے اور اس کا شمار مقبول عام مشروبات میں ہوتا ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ہندوستان میں جا کر بھی روح افزار سے نجات نہیں ملی۔

بلراج کومل اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ میں عجیب آدمی ہوں کہ نہ شراب پیتا ہوں اور نہ سگریٹ اور نہ پان کھاتا ہوں جبکہ پاکستان سے جو بھی شاعر و ادیب آتا ہے۔ وہ شراب میں اس طرح غرق ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ شراب نوشی کی غرض سے ہی ہندوستان آیا ہو۔ مجتبیٰ حسین نے مجھے بتایا کہ پاکستان سے آئی ہوئی ایک شاعرہ نے ایک استقبالیہ میں بھری محفل میں اس طرح جام اٹھا لیا کہ لوگ دنگ رہ گئے، خصوصاً اس لیے کہ ہندوستان میں عام تصور یہ ہے کہ پاکستان میں عورتیں بہت پسماندہ ہیں اور سات پردوں کے اندر رہتی ہیں۔ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی آزادی نہیں اور عورتیں اگر نکلتی ہیں تو برقعہ پہن کر۔ پاکستانی عورتیں صوم و صلوۃ کی بڑی پابند ہیں اور دو جدید کی تمام مکروہ باتوں سے بہت دور رہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مذکورہ شاعرہ نے جب بھری محفل میں مئے نوشی کا مظاہرہ کیا تو انہیں یقین آگیا کہ جنرل ضیاء الحق خواہ کتنا ہی دعویٰ کیوں نہ کریں پاکستان میں اسلامی نظام ہرگز نہیں آ سکتا۔

بلراج کومل سے بہت دیر تک ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی اور میں ان سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ بلراج کومل اس پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے آزادی سے قبل اردو پڑھی لکھی اور شاعری افسانے اور تنقیدیں لکھ کر بڑا نام پیدا کیا، لیکن ہندو ادیبوں میں شاید یہ آخری پیڑھی ہے۔ اس کے بعد ان میں کوئی اردو ادیب و شاعر پیدا نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ ان میں اردو پڑھنے کا سلسلہ قطعی بند ہو چکا ہے۔

راج نرائن راز

جوگندر پال نے اس پیڑھی کے ایک اور ادیب و شاعر سے ماہنامہ "آج کل" کے دفتر میں ملوایا۔ یہ تھے راج نرائن راز جو اس وقت اردو "آج کل" کے ایڈیٹر تھے۔ میں راج نرائن راز کے نام سے اچھی طرح واقف تھا اور ان کی ادارت میں نکلنے والے اس جریدے کو بڑے اشتیاق کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک روز پال جی صبح کے وقت مجھے لے کر سیدھے راج نرائن راز کے دفتر پہنچ گئے اور ان سے میرا تعارف کرایا۔ راج نرائن جی بڑے تپاک سے ملے اور مجھ سے بے ساختہ بغل گیر ہوتے ہوئے کہا، "شہزاد صاحب میں تو آپ سے "آثار" کے زمانے سے واقف ہوں۔ آپ نے میری بہت سی نظمیں اور غزلیں اپنے ہفت روزہ میں شائع کی ہیں"۔

میں ان کے اس انکشاف سے حیران رہ گیا۔ مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ میں نے راز صاحب کی کوئی چیز "آثار" میں شائع کی ہے۔ دراصل یہ 1959ء کی بات تھی اور اسے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اس وقت راج نرائن راز آج کی طرح مشہور و معروف نہیں تھے۔ اس دور میں ہفت روزہ "آثار" میں یقیناً ان کی تخلیقات شائع ہوئی ہوں گی۔ وہ بہت ہی پیار اور محبت سے ملے اور مجھے "آج کل" کے ایک سال کا مکمل فائل عنایت کیا جس میں مجھے کئی قابل ذکر چیزیں ملیں۔ ان میں راجندر سنگھ بیدی کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا سوانحی خاکہ بھی شامل تھا۔

راج نرائن راز کا اصل نام راج نرائن اور ان کے والد کا نام شیو رام ہے۔ راز ان کا تخلص ہے۔ وہ 27 اکتوبر 1930ء کو لورالائی (بلوچستان) میں پیدا ہوئے۔ دسویں جماعت تک تعلیم خالصہ ہائی اسکول کوئٹہ میں حاصل کی اور جھانسی اور دہلی سے بی۔ اے کیا۔ 1956ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ، "چاندنی آساڑھ کی" 1967ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے 70ء میں منور لکھنوی کی شخصیت اور شاعری پر کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ ان کی متعدد کتابیں شائع

ہوئیں۔ 1955ء میں انہوں نے روزنامہ "تیج" میں صحافی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ پھر وہ مختلف اخبارات و جرائد سے ہوتے ہوئے "آج کل" کی ادارت تک پہنچے۔ اس وقت ان کا شمار ہندوستان کے اچھے اور قابل ذکر شاعروں میں ہوتا ہے۔

سکریتا پال

جوگندر پال جی کے ہاں قیام کے دوران ایک روز انہوں نے کہا، "آئیے، آج میں اپنی بیٹی سکریتا پال سے آپ کو ملاؤں، جو انگریزی کی ادیبہ اور مصور بھی ہے اور وہ ملکی اور غیر ملکی رسائل میں مضامین لکھتی رہتی ہے"۔

میں پال جی کی زبانی سکریتا پال کا کئی بار ذکر سن چکا تھا۔ اس لیے اسے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ سکریتا، پال جی کی قیام گاہ سے بہت دور نئی دہلی کے کسی محلے میں رہتی تھی، لیکن چونکہ میرے ساتھ شمس الزماں اور اس کی کار تھی۔ اس لیے سفر کوئی مسئلہ نہ بنا۔ دہلی کے قیام کے دوران شمس الزماں کی موٹر کار کی وجہ سے آنے جانے میں بڑی سہولت رہی۔ ورنہ دہلی اتنا بڑا اور وسیع شہر ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں اور پیسے الگ خرچ ہوتے ہیں۔

پال جی نے سکریتا کے بارے میں بتایا کہ وہ ہندی اور اردو بہ آسانی پڑھ لیتی ہے، لیکن وہ لکھتی انگریزی میں ہے۔ اس لیے کہ اس کی بنیادی تعلیم کینیا کے انگریزی اسکول میں ہوئی ہے۔ اس لیے اسے انگریزی میں جس قدر دسترس ہے، اردو یا ہندی میں نہیں ہے۔ پال جی نے یہ بھی بتایا کہ سکریتا امریکی دفتر اطلاعات (دہلی) سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ "دی اسپان" سے بھی وابستہ ہے اور وہ اس میں ادب اور ثقافت کے موضوع پر مضامین لکھتی رہتی ہے۔

کار نئی دہلی کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک گنجان آباد علاقے میں داخل ہوئی۔ پال جی نے کار کو ایک مکان کے سامنے رکوایا اور کہا، "یہ دیویندر ناتھ ستیارتھی جی کا گھر ہے۔ آئیے، پہلے ان سے ملتا چلوں۔

دیویندر ناتھ ستیارتھی کا نام سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میں ان کے نام سے آزادی سے بہت پہلے سے واقف تھا اور "ادب لطیف" (لاہور) میں ان کی کہانیاں اور برصغیر کے مختلف علاقوں کے لوک گیتوں کے بارے میں مضامین پڑھتا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ منٹو اور ان کے درمیان ہونے والی چھیڑ چھاڑ

سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ایسی تاریخی شخصیت سے ملنا یقیناً خوشی کی بات تھی، لیکن پال جی نے واپس آکر بتایا کہ ہمارے آنے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی ہے۔ وہ ہوا خوری کے لیے باہر نکل چکے ہیں۔ پال جی نے ان کی اہلیہ کو بتایا کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئیں گے۔ اگر ستیار تھی جی واپس آ جائیں تو انہیں ہمارا انتظار کرنے کے لیے کہیے"۔

ہم پھر سکریتا کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ پال جی نے سکریتا کو فون کر کے ہم لوگوں کی آمد کی پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کال بیل سنتے ہی دروازہ کھول کر ہم لوگوں کا استقبال کیا اور ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں ہم سب کو بٹھایا۔ اتنا بڑا اور سجا ہوا ڈرائنگ روم مجھے ہندوستان کے سفر میں کسی ادیب کے ہاں کم ہی نظر آیا۔ کراچی میں ایک مڈل کلاس کا ڈرائنگ روم بھی کافی سجا ہوا ہوتا ہے، لیکن ہندوستان، خصوصاً دہلی کے متوسط طبقہ میں بہت کم ایسی بات نظر آئی۔ ہو سکتا ہے یہ ہندوستانی عوام کی عام سادگی پسندی ہو۔ ڈرائنگ روم میں ہر جگہ بڑی بڑی آئل پینٹنگز آویزاں تھیں۔ پال جی نے یہ تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ سکریتا مصنفہ کے علاوہ مصور بھی ہے، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ساری تصاویر ان کی ہی بنائی ہوئی ہیں۔ سکریتا نے خود بتایا کہ یہ تصویریں اس نے بنائی ہیں۔

میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ تصاویر دیکھیں۔ تصاویر عام سی تھیں۔ جن میں ریلسٹک انداز میں ہندوستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی گئی تھی، البتہ سکریتا نے زیادہ تر بلو اور سیاہ رنگ استعمال کیا تھا۔ جس سے اس کی سادہ مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سکریتا پال کے دو بچے تھے اور اس کے شوہر پیشہ کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ اتفاق سے وہ اس وقت باہر گئے ہوئے تھے اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سکریتا سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اس بارے میں بہت ساری باتیں دریافت کیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی پیدائش نیروبی (مشرقی افریقہ) کی ہے۔ بچپن نیروبی میں گزرا۔ وہ انگریزی میں نثر لکھنے کے علاوہ نظمیں بھی کہتی ہے، اور اس کی انگریزی نظموں کے دو مجموعے "اپورنا" اور "Sscillations" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے جدید امریکی فکشن پر تحقیق بھی کی ہے جو "مین، ویمن اینڈ اینڈروگینی"---- "Man, woman and Androguny" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ وہ اس وقت دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین کالج میں انگریزی اور امریکی ادبیات کی استاد ہے۔ علاوہ ازیں وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی (واقع شملہ) کی فیلو بھی ہے۔ وہ انگریزی، ہندی اور اردو مختصر افسانے میں

ہدیت کے تصور کے موضوع پر تحقیق کر رہی ہے۔ اس کی دو کتابیں "Conversation on Modernism" اور "دی نیو اسٹوری" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ سکریتا نے یہ بھی بتایا کہ اس کی تصاویر کی "گیلری آف دی آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی" دہلی میں 1984ء میں نمائش ہو چکی ہے۔

سکریتا جیسی ذہین، باصلاحیت اور صاحب ذوق مصنفہ اور مصور سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔ پال جی کے بچوں میں صرف سکریتا ایسی تھی جسے شعر و ادب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔

پال جی نے بتایا کہ سکریتا نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس لے بیدی جی پر کام بھی کیا ہے۔ چنانچہ میں سکریتا سے بہت دیر تک بیدی جی کی زندگی اور فن کے ارے میں تبادلہ خیال کرتا رہا۔

واپسی میں ہم پھر دیویندر ناتھ ستیارتھی جی سے ملنے ان کے گھر گئے، لیکن وہ اس وقت تک نہیں اوٹے تھے۔ اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

قمر رئیس

ایک روز شمس الزماں صبح سویرے اپنی کار پر جوگندر پال جی کے ہاں پہنچ گیا اور مجھے دہلی کی سیر کرانے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے اس سے کہا، "میں نے نئی اور پرانی دلی بہت حد تک دیکھ لی ہے۔ اب میں جمنا کے اس پار جانا چاہتا ہوں، تاکہ دہلی کے زیر آباد علاقوں کو بھی دیکھ سکوں، خصوص قمر رئیس کے گھر کو"۔

چنانچہ ہم جمنا کے اس پار روانہ ہو گئے، دریائے جمنا پر تعمیر ہونے والے اس پل نے دہلی کو مزید وسعت بخشی ہے اور اب جمنا کے اس پار بھی نت نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں اور تعمیراتی کام نہایت برق رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ قمر رئیس جس علاقے میں رہتے ہیں اس کا نام "دیو یک دہار ہے، جو مرکزی دہلی سے بہت فاصلے پر واقع ہے اور درمیان میں زمین کے بڑے بڑے قطعے غیر آباد ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی اپنے بازو جمنا کے اس پار بھی پھیلا رہی ہے اور آئندہ چند برسوں میں علاقہ بھی ترقی کر کے دارالحکومت دہلی کا حصہ بن جائے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ دہلی ہندوستان کا دارالحکومت ہونے کے باوجود صنعتی شہروں کی طر لوگ، خاص طور پر کاشت کار اپنی زمینوں سے بے دخل ہو کر روزگار کی تلاش میں یہاں نہیں آ ہیں۔ اس کے باوجود دہلی کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور دہلی ڈیولپ منٹ اتھارٹی رہائش مسئلہ حل کرنے کے لیے نت نئے علاقوں کو آباد کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمنا کے اس پار بہ سے نئے محلے آباد ہو رہے ہیں، جن میں سے زیادہ تر کے نام سنسکرت آمیز اور قدیم ہندوستان کسی دیو مالائی کردار پر رکھے جا رہے ہیں۔ جس سے ہندو احیا پرستی کا رجحان واضح ہے۔

قمر رئیس کا مکان تلاش کرنے میں بڑی پریشانی ہوئی، لیکن شمس الزمان کے سکھ ڈرائیور نے ان مکان بالآخر ڈھونڈ نکالا۔ میں جب ان کے ہاں پہنچا تو اتفاق سے وہ موجود تھے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ہم دونوں کا خیر مقدم کیا اور ہمیں اپنے مطالعے کے کمرے میں بٹھایا۔ قمر رئیس دہلی کے ان

خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جن کا دہلی میں اپنا مکان ہے اور جس پر ان کے مخالفین نہ صرف رشک کرتے ہیں، بلکہ ان پر مختلف قسم کے بہتان بھی تراشتے رہتے ہیں۔

قمر رئیس کے بارے میں میں اس سے قبل اپنے تاثرات بیان کر چکا ہوں۔ میں نے دہلی کے قیام کے دوران محسوس کیا کہ وہ ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو گوشہ نشین رہ کر خود کو صرف لکھنے پڑھنے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جو مختلف قسم کی ادبی، ثقافتی، تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ قمر رئیس کی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ وہ اس وقت ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نہ صرف سیکرٹری جنرل ہیں، بلکہ نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز آف انڈیا کے سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے بھی جنرل سیکرٹری اور انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی دہلی کے نائب صدر بھی ہیں۔

انہوں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے مطابق ان کا نام مصاحب علی خاں ہے۔ وہ 12 جولائی 1932ء کو شاہجہاں پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ 54ء میں لکھنؤ سے بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی اور 56-55ء میں ناگ پور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے فرسٹ کلاس کیا اور 1959ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ 1959ء سے وہ یونیورسٹی کی سطح پر درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور 76ء سے 79ء تک دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تاشقند کی اسٹیٹ یونیورسٹی میں شعبہ انڈین اسٹڈیز میں اردو پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں ان کی کتابوں پر کئی انعامات مل چکے ہیں اور انہوں نے پریم چند پر سب سے زیادہ کام کیا ہے اور ان کا شمار پریم چند کے ماہروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پریم چند پر جس قدر کتابیں اور مضامین تحریر کئے ہیں، تعداد کے اعتبار سے اردو کے کسی دوسرے ناقد نے نہیں کئے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی کئی تصانیف کا روسی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ ایک کمیٹڈ ترقی پسند ہیں اور کسی طور اپنے نظریے اور مؤقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ان سے گفتگو کے دوران ہوا۔ کیونکہ گفتگو کے دوران سپر پاورز کا ذکر نکل آیا تو میں نے کہا کہ دونوں بڑی طاقتیں یکساں طور پر دنیا پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ جس سے وہ متفق نہیں ہوئے۔ اس سے ان کا روس کی جانب جھکاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں بھی بیدی جی پر کام کر رہا ہوں تو انہوں نے بیدی جی کے بارے میں بہت سا مواد دینے کا وعدہ کیا اور اپنا وعدہ نبھایا۔

انہوں نے مجھے بیدی جی کے کئی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط اور تصاویر دیں اور کہا کہ میں جب کلکتے سے لوٹوں تو دو چار روز ان کے ہاں بھی قیام کروں، تاکہ تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ افسوس کلکتے سے واپسی کے بعد ان سے فون پر رابطہ نہ ہو سکا، البتہ ان سے کراچی میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس کے موقع پر اور اس کے بعد بھی کئی ملاقاتیں رہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ساتھ چند لمحے

دلی پہنچنے کے بعد میں جس ادبی شخصیت سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ تھیں قرۃ العین حیدر۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ پاکستانی ادیبوں سے ملنا پسند نہیں کرتی ہیں، کیونکہ پاکستانی ادیب ان سے مل کر واپس آتے ہیں تو ان کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں پھیلاتے ہیں۔ جس سے انہیں دکھ پہنچتا ہے۔ وہ پاکستانی ادیبوں کے چھچھورے پن سے بھی بہت نالاں تھیں، مثلاً یہ کہ ایک مشہور پاکستانی شاعرہ جب ان سے ملنے کے لیے بمبئی گئیں تو انہوں نے ان کے دو کمرے کے فلیٹ کو دیکھ کر بڑی حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے فلیٹ میں تو پاکستان کے معمولی کلرک رہتے ہیں۔ عینی کو اس شاعرہ کی بات بہت ناگوار گزری۔

میں ساری باتیں پہلے ہی سن چکا تھا۔ اس لیے ان سے ملتے ہوئے ڈر بھی رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ ملیں گی بھی یا نہیں اور اگر ملیں گی تو سیدھے منہ بات بھی کریں گی یا نہیں! میں نے دلی پہنچتے ہی سب سے پہلے بھابی کرشنا پال اور صغریٰ مہدی کے ذریعے قرۃ العین حیدر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں جامعہ ملیہ میں پڑھاتی تھیں۔ قرۃ العین کی رہائش گاہ جامعہ ملیہ کے قریب سوریہ ہوٹل کے سامنے واقع تھی۔ ان دونوں خواتین سے ان کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ صغریٰ مہدی نے اطلاع دی کہ عینی ان دنوں بمبئی گئی ہوئی ہیں۔ ایک ہفتے کے بعد آئیں گی۔ میں نے کلکتے سے واپس آنے کے بعد جب کرشنا بھابی سے معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بمبئی سے آچکی ہیں اور ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ انہوں نے عینی کو میری دلی آمد سے مطلع کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں ان سے ملنے کا مشتاق ہوں۔

ایک روز میں ہمت کر کے ان کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ دستک دیتے ہی ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ ایک صحافی اور ادیب ہوں اور قرۃ العین حیدر صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔

لڑکی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی ڈائننگ روم متصل تھا اور

دونوں کے درمیان ایک باریک سا پردہ آویزاں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد قرۃ العین آئیں اور میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔انھوں نے آتے ہی پاکستانی ادیبوں کی شکایتیں شروع کر دیں۔ میں نے فوراً اپنی مدافعت میں کہا، "میں تو مشرقی پاکستان کا ادیب ہوں اور دوسری بار ہجرت کر کے پاکستان آیا ہوں۔ میرا کلکتے سے تعلق ہے"۔

تیر نشانے پر لگی اور کلکتے کا نام سن کر وہ نرم پڑ گئیں۔انھوں نے دریافت کیا۔ "آپ کلکتے کے اصل باشندے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں، میری فیملی وہاں دو سو سال سے آباد ہے۔ میں۔۔۔۔۔۔"

انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، "میں اس وقت جو ناول لکھ رہی ہوں۔اس کا پس منظر بھی کلکتہ ہے۔اس میں کلکتے کا تفصیلی ذکر ہے"۔

میں نے کہا "جی ہاں، آپ کے ناول کا نام "گردش رنگ چمن" ہے، لیکن اس کا تعلق تو لکھنؤ کی تہذیب سے ہے"۔

"جی ہاں، لکھنؤ کی تہذیب سے بھی ہے۔اس کا ایک حصہ کلکتہ سے متعلق ہے"۔

وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں اور اپنے ناول کے کتابت شدہ صفحات لے کر آئیں۔ کتابت بڑے سائز میں آرٹ پیپر پر کی گئی تھی۔ اور کتابت بہت ہی خوبصورت اور معیاری تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ کتابت بڑے سائز میں کی گئی ہے۔ جس کی فلم بننے کے بعد کتاب 23x36#16 سائز میں آجائے گی۔ صفحات پر جابجا تصویری خاکے بنے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ خاکے خود انھوں نے ہی بنائے تھے۔ تاہم میں نے دریافت کیا "یہ خاکے آپ نے بنائے ہیں؟"

"جی ہاں، میں نے ہی بنائے ہیں۔ میں اپنی کتاب کا السٹریشن خود کرتی ہوں"۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ مصور بھی ہیں اور "آخر شب کے ہم سفر" کے سرورق کی تصویر آپ کی ہی بنائی ہوئی ہے"۔

انھوں نے دریافت کیا "اگر آپ کلکتہ کے رہنے والے ہیں تو بتائیے کہ کلکتے میں انگریزوں کے زمانے کا اوپیرا ہاؤس کہاں پر ہے"۔

میں نے کہا "یہ اوپیرا ہاؤس نیو مارکیٹ کے قریب واقع تھا۔ جہاں اس وقت گلوب سینما کی نئی عمارت قائم ہے۔ مذکورہ اوپیرا ہاؤس میں پہلے پرانا گلوب سینما واقع تھا، لیکن اب اسے منہدم کر کے اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی گئی ہے"۔

"اچھا یہ بتائیے۔ سندر یا پٹی کہاں پر واقع ہے؟"۔

"سندریا پٹی چیت پور روڈ پر ناخدا مسجد کے قریب ایک محلے کا نام ہے جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے"۔

میں صاف سمجھ گیا کہ وہ یہ ساری معلومات اپنے مجوزہ ناول "گردش رنگ چمن" کے لیے جمع کر رہی ہیں۔ میں نے کہا "آپ کلکتہ کیوں نہیں چلی جاتیں۔ آپ کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی"۔

"میں کلکتہ گئی تھی، لیکن کلکتہ اس قدر بدل چکا ہے کہ قدیم کلکتے کے بہت کم آثار باقی رہ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے مجھے قدیم کلکتے کے بارے میں بہت ریسرچ کرنا پڑا"۔

انہوں نے اپنے ناول کے بارے میں بتایا کہ انہیں ناول لکھنے کے لیے رام پور کی رضا لائبریری سے بہت سا مواد ملا ہے اور وہ اس کے لیے رام پور اور کلکتہ بھی جا چکی ہیں۔ اس ناول میں فرضی کرداروں کے ساتھ ساتھ بہت سے سچے کردار بھی ہیں۔ انہوں نے کہا "میں نے ناول لکھنے کے بعد اس کا مسودہ ان لوگوں کو دکھا دیا ہے کہ اگر انہیں کوئی اعتراض ہے تو بتا دیں"۔

میں نے ان سے کہا، "آپ اگر اپنا ناول پہلے پاکستان میں اور بعد میں ہندوستان میں چھپوائیں تو مناسب رہے گا ورنہ پاکستان میں جعلی ایڈیشن شائع ہو جائے گا"۔

انہوں نے کہا "جی ہاں، میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میرا ناول پہلے پاکستان میں ہی شائع ہو گا"۔

میں نے موقع غنیمت جان کر اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا جو میرے شانے سے جھول رہا تھا۔ عینی صاحبہ نے دیکھا اور دریافت کیا "آپ ٹیپ کیوں کر رہے ہیں؟"۔

"اس لیے کہ میں جب ہندوستان کا سفر نامہ لکھوں تو ساری باتیں یاد رہیں"۔

انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے دریافت کیا "جدیدیت کے رجحان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں تو ہمیشہ سے اس کے خلاف رہی ہوں۔ جدیدیت کے نام پر یہاں جو کچھ ہوا۔ بہت غلط ہوا۔ بہت برا ہوا۔ اب خود ان لوگوں نے مان لیا ہے کہ ہم انتہا پر پہنچ گئے تھے"۔

"ہندوستان میں لکھے جانے والے۔ علامتی افسانے کے بارے میں کچھ بتائیے؟"۔

"کچھ اچھے لکھے گئے ہیں اور کچھ بہت خراب لکھے گئے ہیں"۔

"کیا آپ نے ان علامتی افسانوں کی اسٹڈی کی ہے؟"

"میں اسٹڈی کروں گی؟ اتنے خراب افسانوں کی؟۔" عینی نے الٹا مجھ سے دریافت کیا۔

"یہاں جو اچھے علامتی افسانے لکھے گئے ہیں۔ کیا آپ ان کے نام بتا سکتی ہیں؟"

"جی نہیں، میں نام وام نہیں بتا سکتی"۔

"علامتی اور تجریدی افسانوں کے علاوہ بھی یہاں کلاسیکی طرز کے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کچھ کہیں گی؟"

"بعض روایتی افسانے بھی اچھے لکھے گئے ہیں، لیکن یہاں معاملہ کچھ کمزور ہے۔ یہاں اچھے رسالے نہیں ہیں اور جو لوگ رسالے نکال سکتے ہیں۔ اس جانب توجہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ اردو رسالے، جو بہت بکتے ہیں، وہ فلمی قسم کے رسالے ہیں۔"

"آپ کی ایک دوست ہیں۔ نثار عزیز بٹ۔ وہ آپ کا بہت تذکرہ کرتی ہیں"۔

"بہت اچھی رائٹر ہے وہ"۔

"ان کی نئی کتاب آئی ہے "کاروانِ وجود" آپ نے پڑھی ہے؟"۔

"اس نے بھجوائی تھی، لیکن مجھے نہیں ملی۔ جو لوگ وہاں سے کتابیں بھجواتے ہیں۔ مجھے پہنچتی نہیں ہیں۔ یا تو لوگ رکھ لیتے ہیں یا کسی کو دے دیتے ہیں کہ پہنچا دینا، لیکن مجھے کوئی نہیں دیتا"۔

"کاروانِ وجود سے پہلے ان کا ایک اور ناول آیا تھا"۔

"بہت عمدہ ناول تھا "نگری نگری پھرا مسافر" بہت اچھا لکھتی ہے۔ مجھے ایک اور ناولسٹ بہت پسند ہے بانو قدسیہ۔ بہت اچھا لکھتی ہے"۔

"آپ نے ان کے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے؟"

"جی ہاں، بغیر پڑھے کیسے کہہ سکتی ہوں"

"ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"اپنی رائے تو دے چکی ہوں کہ وہ بہت اچھا لکھتی ہے۔ شی از گڈ اسٹوری رائٹر۔ اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب انسان کوئی چیز پڑھتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اچھا ہے۔ انڈیفرنٹ ہے"۔

"کیا آپ نے انتظار حسین کا ناول "بستی" پڑھا ہے؟ کیسا لگا؟"

"ٹھیک ہے"۔

"صرف ٹھیک ہے کہنا کیا کافی ہے؟ آپ اسکیپ کر رہی ہیں۔ صرف ایک فقرہ کہہ کر"۔

"اچھا نہیں تھا"

"کیا کمزور تھا؟"

"ان کا کینوس بہت محدود ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو ڈبائی کو یاد کرتے ہیں۔ ڈبائی سے چلتے ہیں۔

پاکستان میں پہنچتے ہیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوہرا رہے ہیں"۔

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ بھی اپنے آپ کو دوہرا رہی ہیں۔ آپ کے آئندہ ناول کے بارے میں تو نہیں معلوم لیکن آپ کی کئی کہانیاں ایسی ہیں اور ناول میں کئی واقعات ایسے ہیں جو آپ کے سابقہ افسانے سے ملتے جلتے ہیں"۔

"ایسا ہو گا۔ مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ انسان اپنی کمزوری کو تو نہیں جانتا ہے نا۔ کوئی دوسرا بتائے گا تو معلوم ہو گا۔ جہاں تک ریپیٹ کرنے کا سوال ہے۔ تو ہم ضرور کر رہے ہوں گے۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ عقل کل ہیں۔ میں نے ہمہ دانی کا تو دعویٰ نہیں کیا۔ انسان اچھا بھی لکھتا ہے۔ برا بھی لکھتا ہے۔ ہر طرح کی چیز لکھتا ہے"۔

میں نے ان کی تائید کی۔ "جہاں تک ریپیٹ کرنے کا سوال ہے۔ بعض ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کا بار بار ذکر آتا ہے۔ مثلاً تقسیم کا واقعہ ہے یا ہجرت کا واقعہ۔ مصنف جب بھی کوئی کہانی یا ناول لکھے گا۔ اس کا بار بار ذکر کرے گا۔ اس کو اپنے آپ کو دوہرانا کہنا درست نہیں ہے"۔

عینی نے کہا "اس جینریشن والے تو برابر لکھیں گے، مثلاً دیکھئے کہ خدیجہ مستور بھی یہی لکھ رہی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں "آنگن" میں بھی ہجرت ہے اور "زمین" میں بھی وہی معاملہ ہے۔ ایک جینریشن تھی یوروپ کے رائٹرز کی۔ وہ وار کو نہیں بھول سکتی۔ رائٹ برابر ہو رہے ہیں۔ لوگ لکھتے نہیں ہیں۔ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ لکھتے ہی نہیں ہیں، لیکن میں لکھ رہی ہوں اس کے بارے میں برابر۔ ابھی میں نے لکھا تھا اس بارے میں۔ "عالم آشوب" لکھا تھا جسے آپ نے پڑھا ہو گا۔ اس کا عنوان تھا "قید خانے میں تلاطم ہے کہ ھند آتی ہے"۔

"اس افسانے کے بارے میں تھوڑی سی بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ افسانہ آپ کے عام افسانوں سے مختلف تھا"۔

"وہ افسانہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو عالم آشوب ہے"۔

"عالم آشوب تو ہے، لیکن آپ اسے کس صنف میں رکھیں گی؟"

"بس میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ عالم آشوب ہے"۔

"بعض اوقات مصنف جو کچھ لکھتا ہے۔ اس کا کوئی فارم نہیں ہوتا۔ وہ فارم لیس ہوتا ہے۔ مصنف کو کچھ کہنا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ مخصوص صنف میں ہی لکھے"۔

"مگر اس کے اندر انٹرنل یونیٹی تو ہے"۔

"ہم چند افسانہ نگار دوستوں نے آپ کا یہ افسانہ پڑھا ہے۔ ہماری ایک چھوٹی سی تنظیم ہے "فکشن گروپ" جس میں چند افسانہ نگار اور شاعر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ہندوستان و پاکستان میں شائع ہونے والے افسانوں اور ناولوں پر بحث کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کے افسانے پر طویل گفتگو کی ہے۔ اکثریت کا کہنا ہے کہ اولاً تو یہ افسانہ ہے ہی نہیں اور اگر اسے افسانہ مان لیا جائے تو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں مصنفہ نے بالکل نئی تکنیک استعمال کی ہے۔ افسانے کے الگ الگ حصے ہیں جسے مصنفہ نے آپس میں جوڑ دیا ہے"۔

"بھئی، اس کی جو انٹرنل چیز ہے۔ اس سے مرثیہ نکلتا ہے۔ وہ مرثیے سے پورے طور پر بندھا رہتا ہے"۔

"آپ نے جدیدیوں کے لیے بڑی اچھی چیز پیش کر دی ہے۔ وہ یہ کہیں گے، دیکھو یہ ہوتا ہے افسانہ۔ دیکھو، اس میں افسانویت نہیں ہے۔ آپ نے فسادات پر لکھے ہوئے اپنے افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کون سے افسانے ہیں؟"

"اسی میں حالیہ فسادات کا ذکر ہے"۔

"اس کے علاوہ آپ کا اور کوئی افسانہ؟ جس میں فسادات کا ذکر آیا ہو؟"

"میرے بہت سے افسانے ہیں، جن میں فسادات کا ذکر ہے۔ میرے جو چار ناولٹ ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ناولٹ "روشنی کی رفتار" ہے۔ اس میں حالیہ فسادات کا ذکر ہے"۔

"آپ کا ایک افسانہ کلکتہ کے مہاجاتی سدن سے شروع ہوتا ہے"۔

"ہاں، ہاں، وہ تو بہت پرانا افسانہ ہے۔ وہ افسانہ تھا "چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا"۔

"میں اس افسانے سے بڑا متاثر ہوا۔ میں جب کلکتے میں تھا تو میں نے اس کا پورا لوکیشن دیکھا تھا۔ میں ساری چیزیں دیکھ چکا ہوں۔ اس لیے میں نے اس افسانے کو زیادہ انجوائے کیا۔ میں جب مشرقی پاکستان میں تھا تو میں نے آپ کا ناولٹ "ہاؤسنگ سوسائٹی" پڑھا تھا۔ اس کے بارے میں طویل نوٹس بھی لیا تھا۔ میں نے اس کا تفصیلی مطالعہ بھی لکھا تھا۔ میں جب تک مشرقی پاکستان میں تھا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مغربی پاکستان کا معاشرہ کیسا ہے۔ مجھے مغربی پاکستان آ کر محسوس ہوا کہ آپ نے اپنے اس افسانے میں پاکستان کے جس نو دولتیہ طبقے کی تصویر کشی کی ہے وہ ہو بہو ویسا ہی ہے جیسا کہ آپ نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں دکھایا ہے"۔

"اب تو یہ نو دولتیہ طبقہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے"۔

"اس افسانے میں آپ نے پاکستان کے نو دولتیہ طبقے کو جس طرح اکسپوز کیا ہے۔ وہ کمال کا ہے"۔

"اب تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ طبقہ اور بھی پھیل گیا ہے۔ پہلے اگر ایسے لوگ دس فی صد تھے تو اب بڑھ کر سو گنا ہو گئے ہیں۔ کاریں، بنگلے اور پیسہ اور پیسہ اور فارن گڈس۔ فارن۔ فارن۔ فارن۔ ہر چیز فارن"۔

"پاکستان کے پڑھے لکھے متمول گھرانے میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ڈرائنگ روم ہر قسم کی ملکی اور غیر ملکی اشیاء سے بھرا رہتا ہے۔ سوائے بک شیلف کے۔ آپ نے پاکستانی معاشرے کو بڑا اکسپوز کیا ہے۔ اسی لیے آپ کو اینٹی پاکستانی کہا جاتا ہے"۔

"یہاں بھی اس قسم کے لوگ اور ایسا طبقہ موجود ہے۔ میں نے اس بارے میں لکھا بھی ہے"۔

"پاکستان کے ایک مشہور نقاد، شاعر اور فوجی افسر ہیں جو آپ کے بڑے معترض ہیں۔ ایک دفعہ ان سے آپ کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے آپ کے اینٹی پاکستانی ہونے کے ثبوت میں کہا کہ دیکھو، قرۃ العین حیدر نے ناولٹ "ہاؤسنگ سوسائٹی" ہندوستان میں جا کر لکھا اور پاکستان کے خلاف لکھا۔ مجھے تو اس ناولٹ میں اینٹی پاکستانی کوئی بات نظر نہیں آئی"۔

"آخر لوگ کیوں پاگل ہو رہے ہیں؟ پاکستان میں جو سمجھ دار لوگ اور کٹر پاکستانی ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ معاشرے میں صرف زر کی پرستش کی جا رہی ہے۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے"۔

"وہاں اسلام کا نام لیا جا رہا ہے اور سوائے حصول زر کے۔ زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں رہ گیا ہے"۔

"مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے نتیجے میں جو انسانی المیہ رونما ہوا ہے۔ اس کے بارے میں پاکستان میں کیا کچھ لکھا گیا ہے؟" عینی نے دریافت کیا۔

"مشرقی پاکستان کے زیادہ تر افسانہ نگاروں نے اس بارے میں لکھا ہے۔ مغربی پاکستان کے چند ادیبوں نے بھی لکھا ہے"۔

"آپ کو معلوم ہے۔ ہندوستان سے جو بہاری مسلمان مشرقی پاکستان گئے۔ وہ وہاں فسادات میں مارے گئے۔ وہاں وہ اس لیے مارے گئے کہ وہ بہاری تھے۔ وہاں سے وہ پھر ہندوستان واپس آ گئے اور کچھ پاکستان چلے گئے۔ اس وقت آپ کو اکثر گھروں میں جو غریب نوکر ملیں گے، آیائیں یا کھانا پکانے والیاں یا لیبر۔ وہ سب بہاری مسلمان ہیں۔ بہاری مسلمان اس طرح برباد ہوئے ہیں کہ کوئی پوچھنے والا

نہیں ہے"۔

"کراچی کے حالیہ فسادات میں سب سے زیادہ بہاری متاثر ہوئے ہیں"۔

"میں بہاریوں کے بارے میں ہی بات کر رہی ہوں۔ بہار میں آزادی سے پہلے فسادات ہوئے۔ بعد میں ہوئے۔ پھر ہوئے۔ اس طرح فسادات کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سنا ہے پاکستان میں بہاریوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا ہے؟"

"جی ہاں، یہ درست ہے"۔

"آپ پاکستان آنے کے بعد کبھی بنگلہ دیش گئے؟"

"جی نہیں" میری بہن آج بھی بنگلہ دیش میں رکی ہوئی ہے"۔

"اب بھی ہیں وہاں یہ! اچھا!"

عینی صاحبہ نے بڑی حیرت سے دریافت کیا۔ وہ میرے اور میری بہن کے گھرانے کے بارے میں اس طرح ہمدردانہ انداز میں باتیں کر رہی تھیں کہ میں حیران تھا۔ جیسے ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات امنڈ آئے ہوں۔

"وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟"

"سید پور میں"۔

"اتنی بڑی ٹریجیڈی ہو گئی۔ مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا پاکستان میں"

"وہاں کون بات کرے گا؟ کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان کے ادیبوں نے اس بارے میں کھل کر لکھا ہے۔ انتظار حسین اور مسعود اشعر وغیرہ نے لکھا ہے اور رضیہ فصیح احمد نے اس سانحے پر پورا ناول لکھ ڈالا ہے۔ وہ اس ناول کے سلسلے میں سابق مشرقی پاکستان اسٹڈی ٹور پر بھی گئی تھیں"۔

"ہاں! وہ بنگلہ دیش گئی تھیں؟" عینی نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں، میں نے وہاں ان کے قیام کا انتظام کر دیا تھا"۔

"رضیہ اگر لکھیں گی تو کیا ان کا لکھا وہاں پسند کیا جائے گا؟"

"یہ تو نہیں معلوم، لیکن انہوں نے وہاں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کی ہیں اور بہت سارا مواد جمع کیا ہے"۔

کیاان کے اندر یہ کان شش نیں ہے؟"

"جی ہاں۔ ہے تو۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر آپ پاکستانی اور وہ بھی مغربی پاکستانی اور ایک فوجی کرنل کی بیوی کی حیثیت سے ناول لکھیں گی تو اس میں تعصب کا اظہار ہو گا اور وہ حقائق سے انصاف نہیں کر پائیں گی"۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعصب کا جو مسلہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان۔ اس نے کس قدر بھیانک طریقے سے اس کا مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان مظاہرہ کیا ہے۔ کوئی اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، بلکہ سارا الزام ہندوستان پر ڈال دیا گیا ہے۔" انہوں نے ایک ہندوستانی کے انداز میں کہا۔

"آپ نے مشرقی پاکستان میں کافی عرصہ گزارا ہے"

"عرصہ نہیں گزارا۔ بس جاتی رہتی تھی"

"آپ کی مشرقی پاکستان کے بارے میں اسٹڈی بہت گہری معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً "چائے کے باغ" کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ناولٹ نے بھی مجھے بہت متاثر کیا"۔

"یہ ناولٹ بھی اسی مسئلے پر ہے جو آج کل آسام میں لینڈلیس لیبر کا مسئلہ ہے"۔

"اچھا، یہ بتائیے کہ آپ کے ناولٹ "سیتاہرن" کی ہیروئن کا کردار کیا سچا ہے؟"

"سیتاہرن" کا کردار ایک حد تک اصلی ہے۔ وہ ہیں خاتون، یورپ میں۔ میں نے اسے سندھی بنایا ہے، لیکن وہ پنجابی تھیں۔ میریڈ ٹو اے مسلم۔ میں نے پس منظر بدل دیا ہے"۔

"کیا آپ خود اسسمینٹ کر کے بتا سکتی ہیں کہ آپ کے سارے افسانوں میں آپ کے تین پسندیدہ افسانے کون سے ہیں؟"۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کو بتادوں کہ میں اپنے افسانوں کے بارے میں (اور جو کچھ لکھتی ہوں) اس کے بارے میں نہ سوچتی ہوں۔ نہ اس کا تذکرہ کرتی ہوں اور نہ اس کو اپنے اوپر لادے رہتی ہوں۔ بعض رائٹر ہمہ وقت اپنے بارے میں کہتے رہتے ہیں "ہم ادیب ہیں۔ ہم ادیب ہیں"۔ میرے لیے یہ قطعی ثانوی چیز ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے تین کون سے بہترین یا پسندیدہ افسانے ہیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں نے کیا کیا لکھا ہے"۔

"آپ اپنے ناولوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتائیں گی؟ چار ناولوں میں سے آپ کے کون کون سے پسندیدہ ناول ہیں؟"

"آخر شب کے ہم سفر" اور یہ جو میں نے اب لکھا ہے۔ "گردش رنگ چمن"۔

قرۃ العین حیدر سے گفتگو کے دوران تحریک آزادی، خصوصاً 12-1911ء کی دہشت پسند تحریک میں مسلمانوں کے کردار کے بارے میں ذکر چھڑ گیا۔ میں نے کہا "بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس تحریک میں ہندوستانی مسلمانوں نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا ہے۔" عینی یہ سنتے ہی بگڑ گئیں اور بے ساختہ کہا، "جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ وہ الو کے پٹھے ہیں"۔

یہ کر وہ اندر کے کمرے میں گئیں اور اپنا ایک پرانا مضمون اٹھا لائیں اور کہا "جنگ آزادی میں شہید ہونے والوں کے بارے میں میں نے ایک طویل مضمون لکھا تھا اور اس کے لیے بڑا ریسرچ کیا تھا۔ ان میں ایک سورما کا نام محمد برکت علی اور ایک کا نام شیر علی ہے۔ کتنے نام میں نے نکالے ہیں بھئی! اور ایک ہیں علی احمد صدیقی۔ اسے بھی پھانسی لگی تھی اور سید رحمت علی شاہ تین تو یہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ اشفاق اللہ۔ اس کے بعد میں نے جو نام مضمون میں دیئے ہیں۔ ان کی تعداد پچیس ہے، جن کو پھانسی ہوئی ہے۔ میرا یہ مضمون پڑھنے کے بعد اشفاق اللہ کے بڑے بھائی کا میرے پاس خط آیا تھا۔ بزرگ آدمی ہیں اور شہداد پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ فریڈم فائٹرز کی لسٹ میں ان کا نام ہی نہیں ملتا۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ ہماری سب پراپرٹی انگریزوں نے ضبط کر لی تھی۔ 47ء کے بعد سے ہم پاکستان میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے انہیں ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی اور ان سے خط وکتابت کی۔ ان کے بہت سے خطوط میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد (جن چار مسلمانوں کو تھانے میں پھانسی دی گئی تھی) ان کی اولادیں مجھ سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔ مسلمانوں کو بہت پھانسیاں دی گئی ہیں"۔

میں قرۃ العین حیدر کی زبانی یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ کون سے ایسے حالات تھے، جن کی وجہ سے انہیں پاکستان ترک کرنا پڑا۔ میں "آگ کا دریا" کے قضیہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ قرۃ العین کے ہم عصر اور رفیق اور مشہور افسانہ نگار اور صحافی ابن سعید (جو ایم۔ ایچ۔ عسکری کے نام سے اخبارات میں لکھتے ہیں) مجھے اس کا پس منظر بتا چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ 1958ء میں جب "آگ کا دریا" شائع ہوا تو اس کی توصیف میں سب سے پہلا تبصرہ انہوں نے ہی "مارننگ نیوز" (کراچی) میں لکھا تھا۔ ایوب خان کا مارشل لاء آچکا تھا۔ اس وقت مارننگ نیوز کے سلطان احمد ایڈیٹر تھے۔ اس تبصرے کے شائع ہوتے ہی مارشل لاء حکام میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اس لیے کہ اس دور کے مارشل لاء حکام کے ایک طبقے کے خیال میں یہ ناول بنیادی طور پر پاکستان کے خلاف تھا، چنانچہ آرمی

ٹیلی جینس کی جانب سے ان کے تبصرے کے جواب میں سراج رضوی نامی ایک شخص کا تبصرہ
ارننگ نیوز میں اشاعت کے لیے بھیجا گیا۔ ایڈیٹر سلطان احمد نے کہا کہ صحافت کے اصول کے مطابق
ایک کتاب پر صرف ایک تبصرہ شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔
ں پر مارشل لاء حکام کی جانب سے سلطان احمد پر اسے شائع کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ بعد میں معلوم
ا کہ سراج رضوی نامی شخص حکومت کی انٹیلی جینس ایجنسی سے وابستہ تھا اور جوابی تبصرہ مارشل لاء
ام کی جانب سے ہی لکھوایا گیا تھا چنانچہ ایڈیٹر سلطان احمد نے اسے "مارننگ نیوز" میں مضمون کی
ورت میں شائع کیا۔ اس کے بعد "آگ کا دریا" کو لے کر تنازعہ شروع ہو گیا اور "جنگ" اور نوائے
لت" میں اس کی حمایت اور مخالفت میں مراسلات اور مضامین کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے
ۃ العین سے جو سب سے اہم سوال کیا وہ یہ تھا کہ وہ کون سے حالات تھے۔ جن کی وجہ سے آپ کو
ستان چھوڑنا پڑا۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ "آگ کا دریا" نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ اس
ے میں ان کی کیا رائے ہے"۔

عینی نے بے ساختہ کہا "اعتراض کرنے والے الو کے پٹھے ہیں۔ اس ناول میں پاکستان کے حق میں
ے بڑا پوائنٹ یہ بنتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو نوکریاں نہیں ملتی ہیں تو وہ پاکستان چلے
لے ہیں۔ ان کی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟

"میں تو اس حصے کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک مسلمان نوجوان کو اعلیٰ
ڈگریاں رکھنے کے باوجود نوکری نہیں ملتی ہے اور وہ نہایت مایوسی کے عالم میں پاکستان میں اپنے
رشتے دار کو خط لکھتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ میری اپنی کہانی ہو"۔

"اس زمانے میں ہر نوجوان، جسے نوکری نہیں ملتی تھی، پاکستان چلا جاتا تھا۔ اب تو کوئی پاکستان
ں جاتا ہے۔ اب لوگ مڈل ایسٹ جاتے ہیں یا یورپ و امریکہ۔ اس زمانے میں نوکری نہیں ملی۔
تان جا رہے ہیں۔ یہ ہر ایک کا مسئلہ تھا"۔

"آپ کے خیال میں "آگ کا دریا" کے خلاف مہم کی اصل وجہ کیا تھی؟"۔

"میرے خیال میں وجہ تھوڑی سی اور بہت معمولی سی ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایک
ب تھے سراج رضوی۔ اس وقت بریگیڈیر گلزار احمد مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہو گئے تھے۔ کتاب
پ گئی تھی۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ لوگ پڑھ رہے تھے۔ چھپے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے
لہ رضوی صاحب کو یہ خیال آیا۔۔۔۔ احمد صاحب لینڈ کا الاٹ مینٹ چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ

بریگیڈیر گلزار کی گڈ بکس میں آ جائیں۔ میں نے بڑی اینٹی پاکستانی چیز پکڑلی ہے۔ میں اسے پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے راتوں رات مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون دو جگہ چھپا۔ اس کے بعد انہوں نے گلزار احمد کو پیش کیا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ دراصل بریگیڈیر گلزار رضوی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ بات مجھے پانچ چھ سال ہوئے ان کے بہت ہی قریبی آدمی نے بتائی ہے۔ ان کا مقصد اس طرح بریگیڈیر گلزار کے قریب پہنچنا تھا"۔

"اس کے بعد اخبارات میں اعتراضات شائع ہوئے۔ خصوصاً جنگ اور نوائے وقت میں۔۔۔"

"یہ انہوں نے ہی کئے۔ مضمون تو صرف ایک ہی آیا۔ گندا مضمون ڈاکٹر رشید جہاں کی خالہ زاد بہن ہے۔ اس نے میرے خلاف لکھا اور بکواس لکھا"۔

"اس کے بعد تو صاحب! "جنگ" اور "نوائے وقت" میں آپ کے خلاف مہم شروع ہو گئی"۔

"اتنی زبردست مہم تھی تو وہ کتاب اتنی مقبول کیسے ہوئی؟ آج تک یہ ناول ٹاپ بیسٹ سیلر کیوں ہے؟

"بلکہ کئی جگہ تو یہ ناول پڑھایا بھی جاتا ہے"۔

"کیوں؟ جب وہ اتنی بری کتاب ہے۔ اینٹی پاکستان ناول ہے تو اسے پڑھایا کیوں جاتا ہے؟ لوگ پڑھ کیوں رہے ہیں۔ ان حماقتوں کو کوئی کیا کہے؟"

"آپ کے ایک جان پہچان کے صاحب ہیں۔ جو نقاد بھی ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں"۔

"میں انہیں جانتی ہوں۔ وہ کٹر پاکستانی ہیں"۔

"وہ جب مشرقی پاکستان آئے تھے تو میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ انہوں نے آپ کے خلاف کیوں لکھا تھا۔ حقیقت کیا تھی؟ انہوں نے آپ کے اینٹی پاکستانی ہونے کے ثبوت میں کئی پوائنٹس بتائے۔ انہوں نے کہا کہ "آگ کا دریا" میں انڈر کرنٹ ایسی باتیں ہیں جو پاکستان کے قیام کے خلاف ہیں۔ "کار جہاں دراز ہے" کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس میں تو آپ نے صرف اپنے خاندان کی تعریف لکھی ہے"۔

"میں نے اگر اپنے خاندان کی تعریف کی ہے تو آپ بھی اپنے خاندان کی تعریف کیجیے۔ دراصل یہ کمپلیکس ہے۔ آپ کو تاریخ کا احساس نہیں ہے۔ آپ کو سوشیالوجی کا احساس نہیں ہے۔ پاگل پن کی انتہا ہے۔ اس میں پوری علی گڑھ تحریک ہے۔ اس میں تمام معاملات ہیں"۔

"بلکہ اس میں برصغیر کی تہذیبی تاریخ ہے"۔

"بعض کمپلیکس زدہ لوگ ہوتے ہیں۔ میں ان کے لیے کیا کروں؟ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دیکھئے، جو جینوین رائٹر ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے نقاد کی پرواہ نہیں کرتا۔ ان کو بھی تو کچھ لکھنا ہے نا! انہیں اپنی دکان چمکانے کے لیے برابر کچھ نہ کچھ لکھنا ہے۔ لکھیں گے نہیں تو کیا کریں گے۔ نقاد ہیں اگر نقاد متعصب ہے یا پاکستان اور اسلام کے بارے میں اس کا مخصوص نقطہ نظر ہے تو "پاکستان زندہ باد"۔ اسلام زندہ باد" کرے گا اور اسی کے مطابق لکھے گا۔ میرے خیال میں نقاد بہت کم غیر جانب دار ہوتے ہیں یا تو ان کی جانب داری ہوتی ہے اپنے نظریات سے۔ یا پھر وہ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس سے۔ یا پھر تعریف کرنے آئیں گے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گے۔ اردو میں متوازن تنقید بہت کم لکھی گئی ہے۔ ہندوستان میں اردو کے جو بڑے بڑے ترقی پسند نقاد ہیں وہ میرے ناول "آخر شب کے ہم سفر" سے بہت خفا ہیں۔ میں نے اس میں جن لوگوں کو اکسپوز کیا ہے وہ بالکل صحیح کیا ہے۔ میں نے اس میں صرف ایک دو آدمیوں کو اکسپوز کیا ہے۔ سب کو تھوڑے ہی کیا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ ایسے تھے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہاں کمیونسٹ تحریک ختم ہو چکی ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈر تھے وہ سب کے سب اسٹیبلشمینٹ میں شامل ہیں۔ اگر میں نے اصلیت ظاہر کر دی ہے تو وہ کیوں چڑتے ہیں؟ اسی کتاب کو روس نے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے؟ کیوں شائع کیا ہے؟"۔

"آپ تو بنگلہ زبان سے واقف نہیں ہیں۔ آپ نے وہاں کی تہذیب، وہاں کی تاریخ اور وہاں کے عوام کے بارے میں جو کچھ لکھا۔ وہ کیسے لکھا؟ کیا اس بارے میں آپ نے ریسرچ کیا تھا؟"۔

"ظاہر ہے۔ ریسرچ کے بغیر میں کس طرح لکھ سکتی تھی۔ میں ایسٹ پاکستان جاتی رہتی تھی۔ وہاں کی تہذیب اور معاشرت سے واقف تھی۔ مجھے ایسٹ پاکستان۔ بنگلہ دیش بے انتہا پسند ہے۔ وہاں کی ہر چیز مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں جب کوئی ناول لکھتی ہوں تو پہلے اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں ریسرچ کرتی ہوں"۔

"میں اس بات پر حیران ہوں کہ وہ ساری باتیں جو میں جانتا تھا اور جس کے بارے میں پڑھ چکا تھا۔ وہ ساری باتیں اور تاریخی پس منظر اس ناول میں موجود ہے"۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں ساتھ ساتھ جرنلسٹ بھی ہوں۔ میں جس چیز کو دیکھتی ہوں تو اس میں میرا جرنلسٹک پوائنٹ آف ویو بھی ہوتا ہے۔ اس کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ پھر

لکھنے میں بھی کام آجاتا ہے"۔

اب میں راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔ آپ ان سے مل چکی ہوں گی۔ ان کے افسانے بھی پڑھ چکی ہوں گی۔ اگر آپ ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالیں تو بڑا کرم ہو گا"۔

"میں تفصیل سے آپ کو کیا بتاؤں۔ ان سے بہت دفعہ ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ آپ ان سے کبھی ملے؟"۔

"جی ہاں، صرف ایک بار، کلکتے میں"۔

"وہ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ سب سے بڑی جو ان میں بات تھی۔ وہ یہ کہ ان میں دردمندی بہت تھی۔ وہ جذباتی آدمی تھے اور بے انتہا خوش مزاج۔ دو باتیں ان کی آؤٹ اسٹینڈنگ تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بہت جذباتی تھے اور ذرا سی بات پر رونے لگتے تھے۔ بہت دلچسپ آدمی تھے۔ لطیفے خوب سنایا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ سنجیدہ بھی تھے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے کہ کہنے کے لیے میرے پاس کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں ایک قسم کی ڈرائی نیس ملتی تھی۔ ہیومن ریلیشن شپ ان کی خاص بات تھی۔ وہ اس کے بارے میں مختلف زاویے سے لکھتے تھے۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ افسانے میں دیہات کو پیش کرنے کا رجحان شروع ہوا۔ اس سے پہلے پریم چند نے اسے شروع کیا۔ ہمارے ہاں جو رومینٹک رائٹرز تھے۔ انہوں نے خیالی قسم کی کچھ چیزیں لکھیں۔ وہ اپر مڈل کلاس کے بارے میں لکھتے تھے۔ میں بات کر رہی ہوں پریم چند کے معاصرین کی۔ ان کی ہیروئنیں بڑی پارسا ہوتی تھیں۔ زیادہ تر ہیرو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ افسانے بہت ہی کمزور تھے۔ اس وقت ہمارا ادب بہت ہی ضعیف تھا۔ سب سے پہلے پریم چند نے ریلزم شروع کی۔ اس ریلزم میں انہوں نے یو۔ پی کو پیش کیا۔ وہ بھی یو۔ پی کے دیہات کو، یو۔ پی کی جو اربن کلاس تھی۔ وہ اس سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ ان کے افسانوں میں ٹھیٹ ٹائپ کے کریکٹر آتے ہیں۔ دیہات ان کا خاص میدان تھا یا پھر یو۔ پی کی لوئر مڈل کلاس۔ بیدی اور کرشن چندر نے پہلی بار اور ان سے کچھ پہلے سدرشن نے پنجاب کی لوئر مڈل کلاس کی ہندو لائف پیش کی۔ اس کے بعد دو طرح کے افسانے لکھے گئے۔ کرشن کے ہاں ایک قسم کا لیریکل رومانٹی سزم تھی اور بیدی کے ہاں ایک خاص قسم کی حقیقت نگاری۔ جس کے آخر میں مسائل کا عنصر بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے سکھوں کی دیہی زندگی کو پیش کیا۔ بلونت سنگھ نے بھی سکھوں کی زندگی

بڑی خوب صورتی سے پیش کیا تھا۔ بلونت سنگھ ہمارا اتنا اچھا افسانہ نگار تھا۔ اسے وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ عجیب بات ہے۔ وہ بہت اچھا افسانہ نگار تھا۔ بیدی صاحب نے اپنے ناول "ایک چادر میلی سی" میں جو زندگی دکھائی ہے (جس کا بڑا تذکرہ کیا گیا ہے) ڈیپر ڈاؤن یو کین سی اے سرٹن کائنڈ آف سیڈ نیس۔ ان کے ہاں ایک خاص قسم کی اداسی اور ایک خاص قسم کی گہرائی ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بیدی نے مجھ کو گریپ میں نہیں لیا۔ جیسا کہ ان کی رائٹنگز نے دوسرے لوگوں کو لیا۔ میں نے ہمیشہ ان کو اس لحاظ سے پڑھا ہے کہ وہ ایک اہم رائٹر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی کہانیاں طویل بہت ہوتی تھیں اور دوسری یہ کہ اس کے اندر ڈرائی نیس آجاتا تھا۔ آخری زمانے میں وہ جنس کے بارے میں بہت لکھنے لگے تھے اور ایسا لگتا تھا۔ جیسے وہ بہت زیادہ پری اکو پائیڈ ہیں اور ان کی جو ذاتی زندگی تھی۔ ان کے افسانوں میں اس کی جھلکیاں بہت ملتی تھیں۔ وہ بہت ڈسٹرب تھے۔ اپنے چند معاملات کی وجہ سے۔ وہ چیز ان کے افسانوں میں آجاتی تھی۔ آخری دنوں میں وہ بہت ٹرانسپیرنٹ ہو گئے تھے۔ ان کی جو جذباتی زندگی تھی یا جو مسائل تھے۔ وہ ان کے افسانوں میں آ گئے تھے۔ جیسا کہ ان کا باپ کے بارے میں افسانہ ہے۔ "ایک باپ بکاؤ"۔ اسی قسم کا ایک افسانہ تھا "صرف ایک سگریٹ"۔ یہ سب ان کے گھریلو معاملات اور گھریلو زندگی کی پیچیدگیاں تھیں۔ ٹینشنز تھے۔ وہ اس کو لبریٹ کرتے تھے۔ وہ لبریشن حاصل کرنے کے لیے افسانے لکھتے تھے اور لبریشن حاصل کرنے کے لیے انسان جس طریقے سے کسی سائیکوانالسٹ کے پاس جاتا ہے۔ اسی طرح وہ بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ وہ بہت عمدہ انسان تھے۔ بہت اچھے رائٹر تھے۔ ان کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں نقاد بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ ان کے اندر ہیومن سچوئشن کے بارے میں گہرا احساس تھا۔ جسے کہتے ہیں انسانی صورتحال۔ ہیومن کنڈیشن۔ وہ ان کی خاص چیز تھی۔ اس کا انہیں بہت دکھ تھا۔ وہ دکھی تھے۔ وہ اتنے دکھی تھے کہ وہ واقعی رو پڑتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خوش بھی رہتے تھے"۔

"اردو کے اور دو افسانہ نگار ہیں۔ منٹو اور کرشن چندر۔ ان دونوں سے اگر آپ بیدی جی کا موازنہ کریں تو"

"آپ لوگ یہ موازنہ انیس و دبیر کیوں کرتے ہیں؟ اردو میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ دنیا کے کسی بھی ملک اور زبان کے ادب میں دیکھیے۔ کہیں پہ یہ نہیں ہوتا ہے کہ ہیمنگ وے کا مقابلہ اسٹین بیک سے کر رہے ہیں۔ ایلیٹ کا مقابلہ پاؤنڈ سے کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر رائٹر کی اپنی جگہ ہے۔ اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ اس کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کا آپ مقابلہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ کوئی

کھیل کا میدان ہے؟ یہ کرکٹ کے کھلاڑی ہیں یا یہ کوئی فلم اسٹار ہیں یا دلیپ کمار کا مقابلہ کر رہے ہیں امیتابھ بچن سے؟ منٹو کا مقابلہ کیجیے فلانے سے۔ یہ غلط چیز ہے۔ منٹو اپنی جگہ ہے۔ اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ کرشن کی اپنی ہیں۔ بیدی کی اپنی ہیں۔ عصمت چغتائی کی اپنی ہیں۔ مقابلے کا اس میں کیا سوال ہے؟"۔ عینی مشتعل ہو گئیں۔

"میرے خیال میں افسانے کی جو کرافٹ مین شپ ہے۔ وہ منٹو کی ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہی ہوں۔ سب ہی کہتے ہیں۔ جانتے ہیں۔ کرشن چندر کے بارے میں کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے جو میں آپ کو بتاؤں۔ جو آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میری بھی رائے وہی ہے کہ کرشن چندر نے بعض افسانے بہت اچھے لکھے ہیں۔ شروع کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ بعض افسانے بہت کمزور ہیں۔ یہ دیکھئے، لتا منگیشکر کو لے لیجئے۔ لتا منگیشکر نے کئی ہزار گانے گائے ہیں۔ اس کی آواز یا فن میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے جو پہلے کے گانے تھے۔ وہ بہت اچھے تھے۔ اب اس نے اتنا گایا۔ اتنا گایا کہ اب ان میں وہ بات نہیں رہی۔ کرشن چندر کے فن میں ان کی جو خصوصیات تھیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہے، لیکن انہوں نے اتنا ریپیٹ کیا کہ ان کی بعض کہانیاں بالکل جرنلزم بن گئیں۔ وہ افسانہ نہیں ہے بلکہ ایک جرنلسٹک پیس ہے۔ میرے خیال میں وہ طنز زیادہ اچھی لکھنے لگے تھے۔ مطلب یہ کہ ان کی جو طنزیہ تحریریں تھیں۔ وہ بہت اچھی تھیں۔ مگر وہ بسیار نویسی کے شکار ہو گئے۔ اگر کم لکھتے تو بہت اچھے افسانہ نگار ہوتے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ لکھ کر بھی اچھا لکھتے ہیں۔ ان کا ٹاپک بالکل روزمرہ کا ہوتا تھا۔ ان کا اسٹائل اتنا اچھا تھا کہ وہ معمولی سی بات سے بھی بات بنا لیتے تھے اور لطف آجاتا تھا۔ کرشن چندر تو تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ بیدی کم لکھتے تھے اور ان کا اپروچ بالکل الگ تھا"۔

"اب میں کچھ آپ کے فن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ محض تفہیم کی غرض سے۔ آپ تو بہت عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ میں آپ کو "ساقی" سے پڑھ رہا ہوں۔ جب آپ کی پہلی کتاب "ستاروں سے آگے" شائع نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی افسانہ نگاری اور زندگی کے کئی ادوار ہیں۔۔۔۔"

"مجھے اپنے ادوار، ادوار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے"۔

"یہ تو ہم لوگ جانتے ہیں نا۔ جو آپ کے قاری ہیں۔ پڑھتے ہوئے معلوم ہو جاتا ہے"۔

"اچھا، تو ادوار ہیں؟"

"آپ کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ آپ ورجینیا وولف سے متاثر ہیں۔ یہ خیال کہاں تک

درست ہے؟"

عینی یہ سنتے ہی ایک بار پھر بپھر سی گئیں۔ "اوہ! گوڈ۔ ورجینیا وولف سے میرا پیچھا نہیں چھٹتا ہے۔۔۔۔"

"اسی لیے تو میں چاہ رہا تھا کہ اس بارے میں آپ سے براہ راست پوچھوں"۔ میں نے انہیں رام کرنے کے لیے کہا۔ "ناقدین کیا کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت نہیں ہے۔ تخلیق کار کیا کہتا ہے۔ اس کی اہمیت ہے"۔

"صاحب! کہاں تک ورجینیا وولف کے بارے میں باتیں کروں؟"

"صاحب، ناقدین کو کسی نہ کسی سے تو تقابل کرنا ہی پڑتا ہے نا!"۔

"بھئی، آپ جب لکھنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو دماغ میں جو آیا لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کام بچہ بھی کرتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا تھا۔ بھئی، خدا کے لیے پیچھا چھوڑیئے"۔ عینی تقریباً ناراض ہو گئیں۔ "جو افسانے میں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں لکھے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ صاحب، آپ نے ورجینیا وولف کو پڑھا؟ کہاں میں، کہاں ورجینیا وولف"۔

"آگ کا دریا" میں بعض جگہ ایسا اسٹائل ہے اور ایسی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔ جس سے لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ۔۔۔۔

"کیا افسانے لکھتے وقت انسان سامنے نسخہ رکھ کر بیٹھتا ہے؟ یا سامنے پانچ چھ کتابیں رکھ لیتا ہے؟ آپ بھی تو لکھتے ہوں گے۔ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ ایک یہ موازنہ انیس و دبیر اور دوسرا فلاں تکنیک آپ نے وہاں سے لی ہے۔ یہاں سے لی ہے"۔

"دراصل کالج میں جو پروفیسر حضرات پڑھاتے ہیں۔ یہ سب کہنا ان کے لیے ضروری ہوتا ہے"۔

"وہ سب جاہل ہوتے ہیں"۔ عینی نے جل کر کہا۔

میں نے دریافت کیا "مغربی ادیبوں میں کون کون سے ایسے ادیب ہیں۔ جنہیں آپ پسند کرتی ہیں؟۔

"بے شمار ہیں۔ میں کن کن کا نام لوں؟"

"بس یہی، ایک، دو یا تین ادیب۔ زیادہ نہیں، جنہیں آپ سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں"۔

"پہلے جو پسند تھے۔ اب پسند نہیں ہیں۔ بہت دنوں سے تو میں نے کچھ پڑھا ہی نہیں"۔ عینی نے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے ان سے اگلوا ہی لیا، "آپ نے پہلے جن ادیبوں کو پڑھا

تھا۔ان کے بارے میں ہی بتادیجیے"۔

"اوہ، ہو! ہو"۔انہوں نے عاجز آکر کہا۔"گراہم گرین پسند ہے۔ فوسٹر پسند ہے۔ ہیمنگوے پسند ہے۔ اسٹین بیک پسند ہے۔ ورجینیا وولف پسند ہے۔ بے شمار پسند ہیں۔ یہاں میرے پاس کتابیں نہیں ہیں۔کیا بتاؤں؟"

میں نے گھوم پھر کر ایک بار پھر ان سے بہت ہی اہم بات کہلوانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں انہیں ناراض کر دیا۔"یہ بتائیے کہ پاکستان میں تو آپ کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا تھا لیکن آپ کے پاکستان سے آنے کی اصل وجہ کیا ہے؟"

ان کی تیوڑیاں چڑھ گئیں اور پھر اپنے مخصوص انداز میں "اوہ، ہو" کہا۔میں نے فوراً پینترا بدل کر ان سے چار پانچ بار "سوری! سوری" کہہ معاف کیجیے گا۔میں پھر فرسودہ باتیں کر رہا ہوں۔ دراصل آپ جب پاکستان چھوڑ کر ہندوستان آئیں۔اس وقت میں ہندوستان میں تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔اس لیے میں محض اپنے شوق جستجو کے تحت دریافت کر رہا ہوں"۔

"اگر میں پاکستان سے آگئی تو کون سا ایسا جرم کیا یا عالمی سانحہ رونما ہو گیا؟"۔

"آپ نے بالکل جرم نہیں کیا" میں ڈر گیا کہ عینی کہیں زیادہ ناراض نہ ہو جائیں۔

"جو شخص بھی وہاں سے آتا ہے۔ مجھ سے یہی سوال کرتا ہے۔ آپ یہاں سے چلے گئے تو کیا کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں آگئے"۔

"میں تو ان کو بتاؤں گا کہ میں نے ہندوستان کیوں ترک کیا"۔

"ارے بھئی۔ میرا دل چاہا اور میں چلی آئی"۔

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔میں نے سنا ہے کہ آپ کو وہاں بہت ذہنی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ جس کی وجہ سے آپ چلی آئیں؟"

"کس نے مجھے ٹارچر کیا؟ کوئی ٹارچر نہیں تھا"۔

"مجھ سے تو لوگوں نے یہی کہا ہے کہ آپ کے خلاف ایک مہم تھی"۔

"جی ہاں مہم تو تھی۔ میں تو وہاں سے ہندوستان نہیں آئی۔ میں تو انگلستان گئی تھی۔ چاہتی تو انگلستان میں رہ جاتی"۔

"کیا کوئی وجہ نہیں تھی؟ جس کے باعث آپ ہندوستان چلی آئیں"۔

"لوگ بھاگ بھاگ کر انگلستان جا رہے ہیں۔ پاکستان سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ انگلستان میں جا

کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے کوئی کیوں نہیں پوچھتا کہ کیوں چلے گئے ہو؟ اس سے حب الوطنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا؟" عینی نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"آپ نے اچھا سوال کیا ہے"۔

"نہیں۔ آپ مجھے بتائیے۔ آپ پاکستان سے چلے گئے اور وہاں ڈش واشنگ کر رہے ہیں۔ وہاں جھاڑو دے رہے ہیں۔ پٹ رہے ہیں اور انگریز انہیں کالا کہہ کر بھگا رہے ہیں۔ پھر بھی وہاں گھسے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی نہیں کہتا کہ پاکستان کے لیے برا ہوا۔۔۔۔ بھئی، میں تو اپنے ملک میں واپس آئی ہوں"۔

میں ان سے ملنے کے لیے ٹھیک بارہ بجے پہنچا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ایک بج گیا۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ چنانچہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چن دیا گیا تھا اور وہ لڑکی (جس نے میرا استقبال کیا تھا) ہماری گفتگو ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ لنچ شروع کیا جائے۔ میں کنکھیوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، چنانچہ میں نے ان سے اجازت طلب کی۔ عینی صاحبہ نے کہا "کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ کھانا کھا کر جائیے"۔

میں نے معذرت کی۔ انہوں نے کہا، "بھئی، اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں ہے۔ جو کچھ حاضر ہے، کھا لیجیے آپ کو گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو جائے گی"۔

میں نے ان سے زیادہ تکلف کرنا مناسب نہ سمجھا اور کھانے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ لڑکی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے عینی صاحبہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے اس سے تعارف کرایا۔ "یہ علی گڑھ کی ثریا حسین کی بیٹی ہیں۔ میرے ساتھ رہتی ہے اور یہیں پڑھتی بھی ہے۔ بھئی ہمارے ہاں کوئی نوکر دوکر نہیں ہے۔ ہم دونوں مل کر کام کر لیتے ہیں"۔

قرۃ العین کے گھر کے کھانے کی خاص بات یہ تھی کہ کسی بھی چیز میں قطعی نمک نہ تھا۔ نہ چاول میں، نہ دال میں اور نہ سالن میں۔ بغیر نمک کا کھانا کھانے میں کیا لطف آیا ہو گا۔ اسے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ کھانے میں بھونا ہوا گوشت تھا، جو بالکل خشک تھا۔ روغن اور گریبی نام کے لیے نہ تھی۔ یہ سالن کیسے پکا؟ اس پر میں حیران تھا۔ عینی صاحبہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ مجھے کھانے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ انہوں نے وضاحت کی، "بھئی۔ ہم شدید ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہیں۔ اس لیے نمک کا استعمال قطعاً بند ہے۔ آپ کو کھانا کھانے میں یقیناً دشواری ہو گی"۔

میں نے جھوٹ کہا، "میں بھی نمک بہت کم استعمال کرتا ہوں"۔

کسی طرح جلدی جلدی زہر مار کرنے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے کہا، "چائے پیتے جائیے، میں دوپہر کے کھانے کے بعد چائے پیتی ہوں"۔

چنانچہ میں تھوڑی دیر کے لیے مزید بیٹھ گیا اور چائے نوشی کے دوران ہندوستان و پاکستان کی سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی۔ قرۃ العین حیدر گاندھی جی کے خلاف مسلسل بولی جا رہی تھیں "ملک کی تقسیم گاندھی جی کی وجہ سے ہوئی ہے"۔

میں نے دریافت کیا، وہ کیسے؟"

انہوں نے کہا، "ذرا سوچیے، آج کے دور میں رام راجیہ کا کیا معنی ہے؟ رام راجیہ کی باتیں کرنے کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان بدظن ہو گئے اور انہوں نے خطرے کے پیش نظر ملک کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ سارا قصور گاندھی جی کا ہے"۔

میں بھلا اس پر کیا رائے زنی کرتا۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور چائے ختم کر کے جلدی سے ان سے رخصت ہوا۔ انہوں نے مجھے اپنی بہن نورالعین حیدر کے نام خط دیا اور تاکید کی کہ میں پاکستان پہنچ کر اسے سپرد ڈاک کر دوں۔ ان کی بہن نورالعین حیدر کراچی میں ڈاکٹر ہیں۔

راج دھانی ایکسپریس میں

راج دھانی ایکسپریس، ہندوستان کی چند بہت ہی اچھی، تیز رفتار، پابند وقت، مکمل ائرکنڈیشنڈ اور انتہائی آرام دہ ٹرینوں میں سے ہے، جو دہلی اور کلکتہ اور دہلی اور بمبئی کے درمیان ہفتے میں چار روز چلتی ہے۔ یوں تو راج دھانی ایکسپریس کے علاوہ بھی ہندوستان میں کئی ائرکنڈیشنڈ لگژری ٹرینیں ہیں، لیکن راج دھانی ایکسپریس کی خوبی یہ ہے کہ وہ دہلی سے کلکتے کے درمیان صرف چار مقامات پر رکتی ہے اور دہلی سے کلکتہ تک کا سفر صرف چودہ گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ اس سے قبل یہ فاصلہ سولہ گھنٹے میں طے ہوتا تھا، لیکن اب اس کی رفتار مزید بڑھا کر سفر کا دورانیہ چودہ گھنٹے کر دیا گیا ہے۔ جس کے باعث مسافر طویل مسافت کی صعوبت سے بچ جاتے ہیں اور بہت کم وقت میں دلی سے کلکتہ پہنچ جاتے ہیں۔ دوسری ٹرینوں میں دہلی سے کلکتے تک کا سفر بیس سے بائیس گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ جس کے باعث مسافر تھک کر چور چور ہو جاتے ہیں۔

راج دھانی ایکسپریس میں دہلی سے کلکتے تک کے چیئر کار کا کرایہ ایک سو ساٹھ روپے ہے۔ اگر آپ سلیپنگ برتھ لیں گے تو اس کا مزید سو روپیہ کرایہ ادا کرنا ہو گا۔ اس رقم میں تین وقت کی چائے اور ناشتہ اور دو وقت کا کھانا شامل ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو راج دھانی ایکسپریس کا کرایہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس کے عوض جو آرام نصیب ہوتا ہے وہ الگ۔ راج دھانی ایکسپریس کا موازنہ ہماری شالیمار ایکسپریس سے کیا جا سکتا ہے، لیکن شالیمار ایکسپریس کا کرایہ اس سے کہیں زیادہ ہے اور آرام اس سے کہیں کم۔ اس ٹرین میں چوں کہ زیادہ تر اعلیٰ طبقہ، بزنس ایگزیکٹو، ممبران پارلیمینٹ یا متمول گھرانے کے افراد سفر کرتے ہیں، اس لئے اس میں دیگر ٹرینوں کی بہ نسبت فضا بالکل مختلف

ہوتی ہے۔ چیئر کار یا برتھ کے مسافروں کو صرف ایک بریف کیس یا اٹیچی کیس کے ساتھ سوار ہونے کی اجازت ہے۔ لگیج کے لئے الگ بوگی موجود ہے، لیکن لوگ چیئر کار میں بڑے بڑے سوٹ کیس لے کر داخل ہو جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اخبار فروش ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے رسائل و اخبارات لے کر ٹرین میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ ہاکروں کے پاس اردو اخبارات کے سوا زیادہ تر انگریزی، ہندی اور بنگلہ زبان کے اخبارات و رسائل ہوتے ہیں۔ مجھے راج دھانی ایکسپریس میں دہلی سے کلکتہ جاتے اور دہلی واپس آتے ہوئے ہاکروں کے پاس کوئی اردو اخبار یا رسالہ نظر نہیں آیا، حتیٰ کہ شمع بھی نہیں، جو ہندوستان کا انتہائی مقبول اردو فلمی ماہنامہ ہے اور جس کی اشاعت لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو کو وہ مقام حاصل نہیں جو ہندی اور انگریزی کو حاصل ہے۔ چنانچہ مجھے انگریزی اور بنگلہ رسائل پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ میں نے ہاکر کے پاس بنگلہ ہفت روزہ "دیش" دیکھتے ہی خرید لیا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ اس لئے کہ "دیش" میرا پسندیدہ بنگلہ ہفت روزہ تھا اور میں اکیس سال کے بعد پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ "دیش" کا شمار کلکتہ سے شائع ہونے والے بہت ہی بلند معیار اور کثیر الاشاعت ہفت روزہ جریدوں میں ہوتا ہے، جس کی تعداد اشاعت ڈیڑھ دو لاکھ سے زیادہ ہے، کسی ہفت روزہ جریدے کا ایک چھوٹے سے صوبے مغربی بنگال سے دو ڈھائی لاکھ کی تعداد میں شائع ہونا معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تعداد اشاعت کے اعتبار سے ہفت روزہ "اخبار جہاں" اس کا مقابلہ ضرور کر سکتا ہے، لیکن معیار کے اعتبار سے نہیں، اس لئے کہ "دیش" میں ادب، سیاسیات، معاشیات، سائنس، سپورٹس، فلم، مصوری، موسیقی، رقص، تھیٹر، ٹیلی وژن اور ریڈیو پروگراموں اور کتابوں پر تبصرے اور ادبی خبریں وغیرہ۔ اس قدر متنوع موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں کہ اردو کا کوئی جریدہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں جب تک ہندوستان میں رہا "دیش" کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا رہا، چنانچہ جب ہاکر کے پاس "دیش" کا پرچہ دیکھا تو نئے اور پرانے تمام شمارے خرید لئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کئی دنوں کے فاقہ کش شخص کے سامنے کھانے کی بہت ساری نعمتیں رکھ دی گئی ہوں۔

راج دھانی ایکسپریس دہلی سے شام ساڑھے چار بجے روانہ ہوئی، روانہ ہوتے ہی ہوائی جہاز کی طرح ٹرین کے لاؤڈ سپیکر پر پہلے ہندی میں اور پھر انگریزی میں وقت روانگی اور کلکتہ پہنچنے کے دن اور وقت کا اعلان کیا گیا اور ساتھ ہی سفر کے خوشگوار طریقے سے جاری رہنے کی توقع ظاہر کی گئی۔ اسی کے ساتھ ہندی فلموں کے مقبول عام نغمے شروع ہو گئے۔ راج دھانی ایکسپریس میں بیٹھ کر ایسا

محسوس ہوا جیسے ہم ٹرین میں نہیں، ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اندر نہ عام ٹرینوں جیسا شور تھا اور نہ کپکپاہٹ۔ بس ٹرین ایک خاص انداز میں ڈول رہی تھی جیسے سمندری جہاز ڈولتا ہے۔ ٹرین کے اندر رفتار کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس لئے کہ ٹرین ہر جانب سے بند تھی، البتہ سگریٹ نوشی کے لئے مختص جگہ پر جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹرین کس قدر تیز رفتاری سے گزر رہی ہے۔ ٹرین کے اندر سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ اس لئے سگریٹ نوشی کے عادی مسافر کپارٹمنٹ کے باہر یعنی دو بوگیوں کے درمیان خالی مقام پر جا کر سگریٹ پیتے تھے۔ ٹرین چونکہ انٹی گرل تھی یعنی ڈبے آپس میں جڑے ہوئے تھے اس لئے مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ چل پھر سکتے تھے۔ راج دھانی ایکسپریس میں چونکہ ڈائننگ کار نہیں تھی اور کھانا اور ناشتہ اپنی اپنی نشست پر مل جاتا تھا اس لئے لوگ ادھر ادھر چلنے پھرنے کے بجائے اپنی نشست پر بیٹھے رہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام، رات میں ڈھل گئی۔ رات آٹھ بجے ہی ڈنر کا اہتمام شروع ہو گیا۔ بیرے نے سب سے پہلے مسافروں سے یہ معلوم کیا کہ کس نشست کے مسافر ویجی ٹیرین ڈش (یعنی ساگ سبزی) پسند کریں گے اور کس نشست کے مسافر نان ویجی ٹیرین کھانا۔ چنانچہ مسافروں سے یہ معلوم کرنے کے بعد بیرے نے ہوائی جہاز کی طرح ہر نشست کے عقب میں لگی ہوئی چھوٹی سی میز کھول دی اور دوسرے بیرے نے کھانے کی سینی (ٹرے) لا کر رکھ دی۔ میں نے نان ویجی ٹیرین کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ اس لئے مجھے جو کھانا دیا گیا۔ اس میں مرغی کی ایک ران، تھوڑا سا چاول، دو چھوٹی چھوٹی روٹیاں، تھوڑی سی دال، سبزی کی ترکاری اور ایک کیلا شامل تھا۔ اس کے علاوہ کولڈ ڈرنک کا بھی انتظام تھا، لیکن اس کے لئے علیحدہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔

ڈنر سے فارغ ہوتے ہی ٹرین کے لاؤڈ سپیکر سے آل انڈیا ریڈیو کی خبریں نشر ہونی شروع ہو گئیں۔ جو پہلے ہندی اور بعد میں انگریزی میں جاری رہیں۔ رات دس بجے لاؤڈ سپیکر سے فلمی نغمے بند ہو گئے اور لوگ سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ رات گہری ہوتے ہی ٹرین کے اندر ٹھنڈک بڑھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹرین کی ائرکنڈیشنڈ نگ کا درجہ حرارت اپنی جگہ قائم تھا۔ لیکن باہر کی حرارت کم ہو جانے کے باعث ٹرین کے اندر زیادہ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔ جن مسافروں نے برتھ مخصوص کروایا تھا۔ انہیں ٹرین کے عملے نے ایک ایک کمبل فراہم کیا، تاکہ سردی محسوس ہونے کی صورت میں وہ اسے اوڑھ سکیں، لیکن جن مسافروں نے چیئر کار کا ٹکٹ لیا تھا۔ وہ اس سہولت سے محروم رہے اور انہیں اس کے لئے اپنا بندوبست کرنا پڑا۔ تجربہ کار مسافروں نے اپنے

اپنے اٹیچی کیس یا بریف کیس میں پہلے ہی چادر یا کمبل کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے اطمینان سے اوڑھ لیا۔ میں چونکہ پہلی بار راج دھانی ایکسپریس میں سفر کر رہا تھا اور اس قسم کے تجربے سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس لئے میں اپنی نشست پر تھوڑی دیر سکڑ کر لیٹا رہا، لیکن جب ٹھنڈک برداشت سے باہر ہو گئی تو مجھے مجبور اٹھنا پڑا اور اپنے سوٹ کیس سے کوٹ نکال کر پہنتا پڑا اور ایک ہلکی سی چادر سے سر ڈھانپ لیا، خدا خدا کر کے رات کٹی اور سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو میں نے غسل خانے میں جا کر ایک دن کا شیو بنایا اور اپنی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ زیادہ تر مسافر رات کے وقت ہی شیو بنا کر فارغ ہو چکے ہیں۔

صبح کاذب کے وقت لاؤڈ سپیکر سے بسم اللہ خاں کی شہنائی شروع ہوئی، جو کافی دیر تک بجتی رہی۔ صبح کاذب کے وقت شہنائی بہت بھلی محسوس ہوئی اور بسم اللہ خاں کی شہنائی نے وجد کا عالم طاری کر دیا اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ہم پاکستانی کتنے بدنصیب ہیں کہ شہنائی جیسی نعمت سے محروم ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہے۔ پاکستان میں وہ تاریک دور تو ابھی شروع نہیں ہوا کہ موسیقی کو غیر اسلامی اور غیر شرعی کہہ کر ممنوع قرار دیا گیا ہو، لیکن اگر وہ دور آجائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ پاکستان میں اسلام کے نام پر سب کچھ ممکن ہے۔ موسیقی، خصوصاً کلاسیکی موسیقی سے حکمران اور اہل ثروت طبقے اور اس کی وجہ سے ریڈیو اور ٹی وی اور نام نہاد کلچرڈ طبقے کی بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک سے کلاسیکی موسیقی کا رواج رفتہ رفتہ اٹھتا جا رہا ہے اور بڑے بڑے اور مشہور کلاسیکی موسیقار اور استاد رفتہ رفتہ یا تو اللہ کو پیارے ہو رہے ہیں یا ملک چھوڑ کر ہندوستان میں آباد ہو رہے ہیں، بڑے غلام علی خاں کا پاکستان ترک کر کے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنا اپنی جگہ خود بہت بڑا قومی المیہ تھا۔ لیکن اس المیے کو کسی نے محسوس ہی نہیں کیا۔ اس لئے اگر پاکستان شہنائی جیسے ساز سے محروم ہے اور اس کا کسی کو احساس تک نہیں ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

بسم اللہ خاں کو میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، لیکن میں نے کلکتے میں آل انڈیا میوزک کانفرنسوں میں انہیں بارہا سنا ہے۔ ہر سال موسم سرما میں کلکتے میں آل انڈیا تان سین کانفرنس یا سدا رنگ سنگیت سمیلن راکسی سینما میں منعقد ہوتی تھی۔ جس میں بسم اللہ خاں کو ضرور مدعو کیا جاتا تھا۔ ان سنگیت سمیلنوں میں شرح داخلہ اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ عام لوگوں کا اس میں شریک ہونا ممکن نہیں ہوتا تھا لیکن سنگیت سمیلنوں کے منتظمین عام سامعین کی سہولت اور ان کے ذوق کی تسکین کی خاطر

سینما ہال کے باہر لاؤڈ سپیکر ضرور لگا دیتے تھے، تاکہ وہ باذوق اور موسیقی کے رسیا، جو ٹکٹ خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں، سینما ہال کے باہر موسیقی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ موسیقی کے ان متوالوں میں ایک زمانے میں میں بھی شامل تھا اور دوستوں کے گروہ کے ساتھ بسم اللہ خاں کی شہنائی ضرور سنتا تھا اور یہ شہنائی عموماً صبح کاذب کے وقت شروع ہوتی تھی۔ شہنائی کے لئے سب سے مناسب وقت صبح صادق کا وقت ہی ہوتا ہے، چنانچہ میں جب بسم اللہ خاں کی شہنائی سن رہا تھا تو میرا ذہن ماضی کی جانب محو پرواز تھا اور میں چند لمحوں کے لئے آج سے اکیس سال پہلے کے کلکتے میں پہنچ گیا تھا۔

شہنائی ختم ہوتے ہی آل انڈیا ریڈیو سے پہلے ہندی اور اس کے بعد انگریزی میں خبریں شروع ہو گئیں۔ جس میں امرت سر میں سکھ انتہاپسندوں کی جانب سے ہندوؤں پر حملے کی خبر بھی شامل تھی۔ میری نشست کی دونوں جانب دو بنگالی مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں بنگلہ جریدہ دیکھ کر پہلے تو مجھے بنگالی سمجھا، لیکن جب بنگلہ میں گفتگو شروع ہوئی تو انہیں میرے بنگلہ تلفظ سے فوراً معلوم ہو گیا کہ میں بنگالی نہیں ہوں۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور صحافی اور ادیب ہوں، پاکستان کی سیاست پر گفتگو شروع ہو گئی۔ خصوصاً جنرل ضیاالحق کی حکومت اور ان کی اسلامائزیشن کی پالیسی اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بارے میں گفتگو۔ میں نے حتی المقدور احتیاط سے کام لے کر اختصار سے جواب دیا اور الٹا ہندوستانی عوام کی معاشی زبوں حالی کے بارے میں سوال کر دیا۔ ان میں سے ایک ایڈووکیٹ اور دوسرا میری طرح پیشہ ور اخبار نویس تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ "دی ٹیلی گراف" کلکتہ کا دہلی میں مقیم نمائندہ ہے اور تعطیل گزارنے کیلئے کلکتے جا رہا ہے۔

ان دونوں ہم سفروں کو جب معلوم ہوا کہ میں بھی کلکتے کا رہنے والا ہوں اور بنگلہ زبان و ادب سے اچھی طرح واقف ہوں اور اکیس سال کے بعد کلکتہ جا رہا ہوں تو دونوں بہت خوش ہوئے اور بہت ہی گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ان سے میری بہت پرانی جان پہچان ہو۔ ہم تینوں گفتگو میں اس طرح مصروف ہو گئے کہ مجھے دوسرے مسافروں کے وجود کا احساس تک نہ رہا۔ میں نے دل میں سوچا کسی نے درست کہا ہے کہ زبان آج کے دور کی سب سے بڑی قوت ہے اور زبان کا رشتہ ہی سب سے مضبوط رشتہ ہے، حتیٰ کہ مذہب سے بھی زیادہ گہرا رشتہ، ورنہ زبان کے لئے لوگ بڑی آسانی سے اپنی جان عزیز کیوں قربان کر دیتے ہیں اور اسے شہادت تصور کرتے ہیں؟ زبان ہی یکجہتی اور یگانگت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ورنہ مغربی بنگال کے بنگالی اور مشرقی بنگال کے بنگالی اور مشرقی پنجاب کے مہاجر پنجابی اور مغربی پاکستان کے مسلمان پنجابی اتنی آسانی کے ساتھ آپس میں کس طرح

ضم ہو گئے، جبکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے مہاجر پاکستان کی علاقائی زبانیں بولنے والوں میں بہ آسانی ضم کیوں نہ ہو پائے؟

میں نے ایک بار پھر اپنے ہم سفر اخبار نویس سے ہندوستانی عوام کی غربت کی اصل وجہ جاننے کی خواہش ظاہر کی اور کہا "میں اگرچہ غیر ملکی ہوں، لیکن مجھے ہندوستانی عوام کی ترقی سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور چونکہ میں بھی پیشہ ور اخبار نویس ہوں اس لئے میں ایک اخبار نویس کی زبانی ہندوستانی عوام کی غربت کی اصل وجہ جاننا چاہتا ہوں"۔ میری باتوں سے اجیت کمار سانیال بہت خوش ہوا (اس نے باتوں کے دوران اپنا یہی نام بتایا تھا) اور ہندوستان کے بارے میں اتنی تفصیلی معلومات بہم پہنچائی جو صرف ایک اخبار نویس ہی پہنچا سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہندوستانی عوام کی غربت کی یوں تو کئی وجوہ ہیں، لیکن ایک بڑی وجہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہے۔ پنڈت نہرو کے دور میں یوں تو سوشلزم کی بہت باتیں کی گئیں اور انہوں نے ملی جلی معیشت کا نعرہ بھی لگایا لیکن ان کی اقتصادی پالیسی سے صرف سرمایہ داری کو فروغ ہوا اور آج اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکتا ہے کہ جدید ہندوستان میں غربت و افلاس نے ایک خوف ناک صورت اختیار کر لی ہے، حالانکہ اس عرصے میں صنعتی ترقی کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کی شرح بہت بڑھی ہے، لیکن اس کے ساتھ غربت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ آزادی کے وقت غربت اتنی نہیں تھی جتنی گذشتہ تین چار دہائیوں میں بڑھی ہے۔ ایک حالیہ جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کی مجموعی آبادی کا پچاس فیصد غربت کی سطح سے بہت نیچے ہے، یعنی ملک کی پچاس فیصد آبادی نہایت غربت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ان میں سب سے ناگفتہ بہ حالت دیہی آبادی کی ہے یہ درست ہے کہ جاگیرداری اور زمین داری نظام ختم ہو چکا ہے، لیکن اس کی جگہ دیہات میں ایک نیا زمیندار طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے مختلف جعلی ناموں سے زمینیں حاصل کر رکھی ہیں اور بے زمین کسانوں کے استحصال کو جاری رکھنے کے لئے غنڈوں اور گماشتوں کی پرائیویٹ فوج بنا رکھی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسان دیہات سے اکھڑ اکھڑ کر شہروں میں جمع ہو رہے ہیں اور شہری آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بے روزگاری افلاس، بیماریوں اور جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے"

اجیت کمار سانیال کہتے کہتے رک گیا اور پھر بے خیالی میں جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا اور وہ ابھی ماچس جلا کر سگریٹ سلگانے والا ہی تھا کہ اسے اچانک یاد آیا کہ ٹرین کے اندر سگریٹ پینے کی ممانعت ہے، چنانچہ اس نے سگریٹ پھر سگریٹ کے پیکٹ میں رکھ دی اور گویا ہوا۔

"ہندوستان کی تاریخ میں آج تک غربت کی ایسی مثال نہیں دیکھی گئی جیسی اس وقت نظر
آ رہی ہے۔ آپ لوگ تو غیر ملکی ہیں اور آپ کا ملک تو ہم سے کہیں زیادہ خوشحال ہے۔ ہماری غربت
ناقابل تصور ہے۔ آپ تو کلکتے جارہے ہیں آپ خود اپنی نظروں سے وہاں ہندوستان کے مکروہ چہرے
کو دیکھیں گے۔ ہندوستان کے عوام کس طرح اتنے غریب ہو گئے اور غربت کے خاتمے کا کیا علاج
ہے؟ اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ نہ ماہرین معاشیات کو اور نہ سیاست دانوں کو۔ جو نام نہاد سوشلسٹ
اور انقلابی جماعتیں ہیں وہ نفاق اور اختلاف کا شکار ہیں اور مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹی ہوئی
ہیں۔ اس لئے ملک گیر سطح پر کانگرس کو چیلنج کرنے والی کوئی جماعت نہیں ہے۔

اجیت کمار نے بتایا، "اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے، پڑھے لکھے
نوجوانوں میں بیروزگاری میں اضافے کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی نشہ آور اشیاء کے استعمال کا رجحان بڑھ
رہا ہے۔ ساتھ ہی جرائم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، صنعتی بے چینی اور مزدور طبقے میں اضطراب اس کے
علاوہ ہے۔ ہندوستان کی غربت کی ایک وجہ اس کا دفاعی اخراجات میں غیر معمولی اضافہ بھی ہے۔ پڑوسی
ملکوں، خصوصاً پاکستان سے اچھے تعلقات نہ ہونے اور مسلسل تنازعات کے باعث قومی آمدنی کا بڑا حصہ
دفاعی تیاریوں میں صرف ہو رہا ہے۔"

اجیت کمار سانیال نے ایک ماہر اقتصادیات کی طرح ہندوستان کی حقیقی اقتصادی صورتحال کی
تصویر کھینچ کر رکھ دی اور میں سوچنے لگا "ساٹھ کروڑ انسانوں کے اس ملک کو ایشیا کا سب سے بڑا سیکولر
اور جمہوری ملک ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ لیکن اس کے عوام کتنے غریب ہیں؟ اس کا اندازہ صرف
ہندوستان جا کر ہی ہو سکتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے۔ ہندوستان میں آئینی طور پر
جمہوریت موجود ضرور ہے، لیکن اس سے فائدہ صرف اہل ثروت طبقہ اٹھا رہا ہے۔ وہ نہ صرف روپے
کے بل پر ووٹ خرید لیتا ہے، بلکہ سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کو بھی اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے
اس طرح جمہوریت، سیاسی جماعتیں اور ان کے توسط سے پوری حکومت اس طبقے کی کنیز بن کر رہ گئی
ہے۔ میں نے اجیت کمار سانیال کے ذریعے جدید ہندوستان کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر
لیں، جتنی ہندوستان کے پورے دورے میں کہیں حاصل نہیں ہوئیں۔ اجیت باتیں کرتے کرتے تھک
گیا تھا اس لئے وہ سگریٹ پینے کے لئے اٹھ کر ڈبے سے باہر چلا گیا اور میں کملیش بنیرجی کی جانب متوجہ
ہوا۔

ان دونوں بنگالی ہم سفروں کی وجہ سے سفر بہت آسانی سے گزر گیا، ورنہ چودہ گھنٹے کا اتنا طویل

سفر خاموش رہ کر یا اخبارات و رسائل پڑھ کر گزارنا مشکل ہوتا۔ آخر انسان کتنا پڑھ سکتا ہے۔ خصوصا سفر کے دوران؟

کملیش بینرجی سپریم کورٹ میں ایڈووکیٹ تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے بتایا کہ اس نے دہلی میں مستقل رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ چترنجن پارک میں اس کا اپنا بنگلہ ہے۔ دہلی میں بنگالیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور وہاں ان کا علیحدہ محلہ بھی ہے، خصوصاً گریٹر کیلاش کے علاقے چترنجن پارک کے قرب و جوار میں۔ میں جب تک جوگندر پال کے ہاں رہا۔ اس محلے سے ہی بنگلہ اخبارات و جرائد خرید تا رہا۔ وہاں جا کر ایسا محسوس ہوتا، جیسے میں دہلی کے بجائے کلکتے میں آگیا ہوں۔ اس لئے کہ وہاں کی دکانوں پر ہندی کے ساتھ بنگلہ زبان میں بھی سائن بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بنگالی اپنی زبان اور ثقافت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اس کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس کے برعکس دہلی میں اردو کا کہیں سائن بورڈ نظر نہیں آیا۔

کملیش بینرجی نے بتایا کہ وہ زیادہ تر فوجداری مقدمات قبول کرتا ہے، خصوصاً قتل کے مقدمات۔ میں نے اس سے دریافت کیا، آپ تو کریمینل لا کے ماہر ہیں، کیا آپ نے کبھی نکسلائٹ تحریک سے وابستہ لوگوں کے مقدمات کی بھی پیروی کی ہے؟ اگر کی ہے تو اس کے بارے میں بتائیے مجھے اس تحریک سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ میں نے اس بارے میں پڑھا تو بہت کچھ ہے، لیکن اس کی تاریخ سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔

میں نے سوچا کہ سفر بہت طویل ہے اور کلکتہ بہت دور۔ اس طرح گفتگو کرتے ہوئے وقت اچھا گزر جائے گا کملیش بینرجی نے ٹھنڈی سانس لی اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ اس نے بظاہر کچھ نہیں بتایا، لیکن اس کی ٹھنڈی سانس لینے سے محسوس ہوا کہ وہ کوئی بات چھپانا چاہتا ہے۔

اس نے کہا " مجھے اپنے پریکٹس کے دوران اور اس سے قبل اس تحریک سے وابستہ بہت سے لوگوں سے ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے ان کی طرف سے مقدمات کی پیروی بھی کی ہے۔ بعض میں کامیاب ہوا اور بعض میں ناکام۔ بعض ملزموں کو پھانسی کے پھندے سے بچانے میں کامیاب رہا اور بعض کو نہیں۔ ان میں میرے بعض دوست بھی تھے اور بعض رشتے دار اور بعض محض شناسا۔ میں نے تعلیم کے دوران کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے کریمونولوجی کا موضوع منتخب کا تھا۔ اس ضمن میں مجھے اپنی تھیسس کی تیاری کے سلسلے میں ملک کے مختلف سنٹرل جیلوں میں لمبا

میعاد کی سزا کاٹنے والے مجرموں سے ملنے اور ان سے انٹرویو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں نکسل باڑی تحریک سے وابستہ مجرموں کی بڑی تعداد شامل ہے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان میں میرے بہت سے اچھے دوست اور رشتے دار تھے۔ جن میں میری رشتے کی ایک بہن بھی شامل ہے، لیکن اس سے قبل کہ میں آپ کو تفصیل بتاؤں۔ اس تحریک کے پس منظر کے بارے میں کچھ بتانا ضروری ہے۔

جیسا کہ آپ نے سنا یا پڑھا ہو گا۔ نکسل باڑی جنوبی بنگال کے ضلع دارجلنگ کے سلی گوڑی کے قریب ایک قصبے کا نام ہے۔ جہاں زیادہ تر زمین سے محروم کسان آباد ہیں اور جو آدی باسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، جنہیں عرف عام میں سنتھال کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ بہت ہی پسماندہ ہے اور زیادہ تر آبادی بے زمین کسانوں پر مشتمل ہے، جو یومیہ اجرت پر کاشت کرتی ہے۔ یہ اجرت اناج کی صورت میں بھی ادا ہوتی ہے اور نقد رقم کی صورت میں بھی۔ اس علاقے کے امیر کسان کو جوت دار کہا جاتا ہے، جو زمیندار کی ہی ایک قسم ہے۔ اس علاقے کے بے زمین کھیت مزدوروں کو جن لوگوں نے منظم کیا۔ ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ لیننیٹ) سے تھا جو فوری اور مسلح انقلاب پر یقین رکھتے تھے۔ پچاس کی دہائی میں اسٹالن کے انتقال کے بعد جب عالمی کمیونسٹ تحریک میں انتشار پیدا ہوا تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی اور دنیا کی مختلف پارٹیوں، خصوصاً مغربی ملکوں کی پارٹیوں کی طرح اس نے مسلح انقلاب کے بجائے پر امن اور پارلیمانی طریقے سے کمیونسٹ انقلاب لانے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے تحت اس نے صوبائی اور پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں پھوٹ پڑ گئی اور پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ مرکزی پارٹی سے الگ ہونے والوں نے اپنی تنظیم کا نام "کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) رکھا۔ 1965ء میں کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) نے جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور دوسری ریڈیکل جماعتوں کے ساتھ مل کر مغربی بنگال کے عام انتخابات میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی تو کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) میں مزید پھوٹ پڑی اور کٹر اور انتہا پسند کمیونسٹ اس سے الگ ہو گئے اور انہوں نے اپنی علیحدہ جماعت "کمیونسٹ پارٹی" (مارکسسٹ، لیننیسٹ) کے نام سے قائم کی۔ جس کے رہنما چارو مجمدار تھے۔ اس گروہ کے لیڈر اور کیڈر زیادہ انقلابی اور انتہا پسند تھے اور پارلیمانی نظام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صرف مسلح جدوجہد کے ذریعے ہی بورژوا طبقے کی حکومت کو ختم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس نے انقلاب کے پہلے مرحلے کے طور پر طبقاتی دشمن کو نیست

د نابود کرنا ضروری قرار دیا۔ اس حکمت عملی کے تحت نکسل باڑی میں بے زمین کسانوں نے جوت داروں پر حملہ کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور تلنگانہ کے طرز پر نکسل باڑی کو آزاد کرا لیا۔

نکسل باڑی تحریک کے پھیلاؤ اور متوسط طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں اس تحریک کی مقبولیت کی وجہ نکسل باڑی میں رہنے والے بے زمین کھیت مزدوروں کی فلاکت زدگی نہیں تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ بنگال بہار کیرالا اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں بے زمین کسانوں اور متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں پائی جانے والی سیاسی اور معاشی بے چینی اور مستقبل کے بارے میں مایوسی اور بے یقینی بھی تھی، جس کے باعث ان علاقوں کے نوجوان جوق در جوق اس تحریک میں شامل ہو رہے تھے، نظریاتی طور پر انتہاپسندی کا شکار ہو رہے تھے اور اپنی جانوں کی قربانیاں دے رہے تھے۔ یہ وہ نوجوان تھے، جو کلکتہ یونیورسٹی اور بنگال کے مختلف کالجوں سے پڑھ لکھ کر اور مارکس، لینن اور ماؤ کے نظریات سے لیس ہو کر نکلتے تھے اور فوری انقلاب میں ہی ہندوستانی عوام کی غربت اور پس ماندگی کا حل تصور کرتے تھے اور جن کا ہندوستان کی بورژوا جمہوریت پر کوئی اعتقاد نہیں تھا۔ جس نے تیس پینتیس برسوں کے درمیان ہندوستانی عوام کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا تھا۔ جو صرف سرمایہ دارانہ مفادات کی نگران تھی۔ اور سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے اس تحریک کو کچلنے پر آمادہ رہتی تھی۔ جس سے اس کے طبقاتی مفادات کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ ان نوجوانوں کو محض انتہاپسند کہہ کر برا بھلا کہنا یا ان کی مذمت کرنا کافی نہیں ہے اور نہ یہ ان کے مسائل کا حل ہے۔

کملیش نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "میں جب پریسیڈنسی کالج کا طالب علم تھا تو میں بھی اس تحریک سے دلچسپی لے رہا تھا۔ پولیٹکل سائنس کے محض ایک طالب علم کی حیثیت سے۔ میرے بہت سے دوست پارٹی کے سرگرم کارکن تھے یا گہرے ہمدرد۔ جن میں میری خالہ زاد بہن مہاشیتا بھی تھی۔ ہم زیادہ تر سیاسیات، معاشیات انگریزی اور بنگلہ ادبیات کے طلبا تھے جو عملی سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہم خالی پیریڈ میں کالج کے کینٹین، کامن روم یا انڈیا کافی ہاؤس میں بیٹھے گھنٹوں روس، چین اور ویت نام کے انقلابات اور مارکسزم، لینن ازم اور ماؤ کے نظریات پر بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے اور ہندوستان میں بھی اسی قسم کا انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ بناتے تھے۔ بعض صرف انقلاب کا خواب دیکھتے اور بعض مختلف وجوہ بتا کر، جن میں ناگفتہ بہ گھریلو حالات شامل ہوتے، تعلیم ادھوری چھوڑ کر زندگی کی عملی جدوجہد میں شامل ہو جاتے۔ میرے ہم جماعت دوستوں میں کانو نامی ایک نوجوان بھی شامل تھا، جس کا اصل نام کانو بھٹچاریہ تھا۔ وہ بہت ہی ذہین

ہایت پر جوش اور بہترین ڈیبیٹر تھا۔ اس کی شعلہ بیانی اور من موہنی شخصیت پر پورا کالج فدا تھا اور اس کے ایک اشارے پر نوجوان اپنی زندگی نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ وہ صرف ہمارے لج یا صرف کلکتے کا ہی نہیں، پورے بنگال کا نہایت مقبول اور نڈر طالب علم رہنما تھا۔ جس کے باعث ہاں کی انتظامیہ اس سے خوف زدہ رہتی تھی۔ ایسی دلنواز شخصیتیں کالج کی لڑکیوں میں عموماً بہت مقبول ہوتی ہیں اور لڑکیاں انقلابی رومانیت کی شکار ہو کر ان کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ انکی نظروں میں ایسے لڑکوں کی حیثیت ہیرو جیسی ہوتی ہے۔ ان لڑکیوں میں اگر کوئی کانو کے بہت قریب تھی تو وہ مہاشیتا تھی۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف میری اور کانو کی ہم جماعت تھی، بلکہ اس کی نائب اور پارٹی کیڈر بھی تھی۔ وہ لوگ حکام کی نظروں سے اس وقت تک محفوظ رہے جب تک اس تحریک نے شدت اختیار نہیں کی اور انہوں نے اس میں کھل کر حصہ لینا شروع نہیں کیا اور نکسل باڑی تحریک گاؤں دیہات سے نکل کر کلکتہ جیسے بڑے شہر میں شروع نہیں ہوئی، خصوصاً پولیس کے سپاہیوں، کانسٹیبلوں اور افسروں کو نشانہ بنانے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ ظاہر ہے اس کے بعد سختیاں بڑھ گئیں۔ گرفتاریوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ کانو، مہاشیتا اور بہت سے پارٹی ورکر روپوش ہو گئے۔ اس کے بعد بہت عرصے تک کچھ معلوم نہیں ہوا کہ کانو، مہاشیتا اور دوسرے دوست احباب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ گرفتار ہو چکے ہیں یا ابھی تک انڈر گرائونڈ ہیں۔ حکومت نے اس بارے میں خبریں بلیک آؤٹ کر رکھی تھیں۔

اس دوران میں کالج سے پڑھ کر نکل گیا اور کریمونولوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے کا فیصلہ کیا، میرے والد کی خواہش تھی کہ میں کریمونولوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد محکمہ پولیس سے وابستہ ہو جاؤں، اس لئے میں نے علم جرائم میں ڈاکٹریٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے والد خود بہت بڑے اور مشہور پولیس افسر رہ چکے تھے اور محکمہ کے دوسرے اعلیٰ افسران ان کے دوست اور رفقائے کار تھے۔ اس لئے میرے تھیسس کی تکمیل کے سلسلے میں ہر جگہ سے تعاون حاصل ہوا اور آئی۔ جی جیلز اور محکمہ جیل خانہ جات نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔ اس دوران مجھے مختلف سنٹرل جیلوں میں جانے کا اتفاق ہوا میں ایک دن جب علی پور سنٹرل جیل گیا اور قتل کے خطرناک مجرموں کے سیل میں پہنچا تو وہاں کانو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کانو نے مجھے پہچان لیا، لیکن میں پہلی نظر میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس کی مونچھیں، داڑھی اور انگلیوں کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ سر کے بال بھی لمبے، خشک اور الجھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی پاگل شخص ہو، جیسے پاگل عام طور پر سڑکوں میں پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے بہت اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ اس لئے کہ اس

کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور چہرے کا سوجن صاف نظر آرہا تھا۔ آئی۔جی جیلز سے خصوصی اجازت حاصل ہونے کی وجہ سے مجھے مجرموں سے تنہائی میں ملنے اور باتیں کرنے کی اجازت تھی، چنانچہ میں نے سب سے پہلے وارڈن کو رخصت کر دیا اور سیل کے اندر جا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ وارڈن بیس فٹ کے فاصلے پر خاموش کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔

میں نے کانو سے پوچھا "دوست، تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟

اس نے نہایت روکھے پن سے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا اس پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ میں اپنے ضمیر کے سامنے مطمئن ہوں"

میں نے پوچھا "مہاشیتا کہاں ہے؟ اس کی ماں تو اس کی جدائی کے غم میں اس جہاں سے کوچ کر چکی ہے"

اس نے مختصراً جواب دیا "وہ بھی اس جہاں سے کوچ کر چکی ہے"

"وہ کیسے؟"

"وہ پیک پاڑہ میں پولیس تصادم میں شہید ہو چکی ہے"

"شہید؟" میرا دل دھک سے رہ گیا "مہاشیتا اس دنیا میں نہیں رہی؟" میں تھوڑی دیر کے لئے سکتے کے عالم میں آگیا پھر اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ بعد میں جیلر سے معلوم ہوا کہ کانو پر بھی پولیس کے ایک سپاہی کو قتل کرنے کا الزام ہے اور ہائی کورٹ نے اسے پھانسی کی سزا سنادی ہے۔ کانو سے ملنے کے چند دنوں کے بعد میں نے اخبار میں اسے پھانسی دیئے جانے کی خبر پڑھی۔ ااا دل مسوس کر رہ گیا"

کملیش بنیرجی نے یہ ساری داستان اس طرح سنائی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں کوئی واقعہ نہیں، کہانی سن رہا ہوں۔ دراصل اس کے واقعات بیان کرنے کا انداز داستان گو جیسا تھا۔ میں ہمہ تن گوش بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بعد اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ پولیس آفیسر بننے کے بجائے قانون دان بننا پسند کیا تاکہ کانو اور مہاشیتا جیسے سیاسی ملزموں کے مقدمات کی پیروی کر سکے۔

ان دونوں بنگالی ہم سفروں کی وجہ سے دہلی سے کلکتے تک کا سفر بہت خوشگوار گزرا۔ اب کلکتہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹرین آسنسول سے گزر رہی تھی اور اب لاؤڈ سپیکر پر ہندوستانی نغموں کی جگہ بنگلہ نغمے نشر ہو رہے تھے، یعنی وہی اپنے کلچر کی شناخت کا مسئلہ۔ ٹرین کا اناؤنسر اب ہندی کے بجائے بنگلہ اور انگریزی میں اعلان کر رہا تھا۔

کلکتہ، جو ایک شہر ہے

راج دھانی ایکسپریس کے ہوڑہ سٹیشن پر رکتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔
بالآخر میں پورے اکیس سال کے بعد اپنے آبائی شہر۔ کلکتہ پہنچ گیا۔
ہوڑہ سٹیشن کو اپنی نظروں سے دیکھنے کے لئے میں بے چین ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس لئے بغیر پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ سرخ قمیض میں ملبوس قلی ایک کے بعد ایک ڈبے میں داخل ہونے لگے۔ میں نے ایک قلی کو اپنا سفید سوٹ کیس اشارے سے دکھایا اور اسے ڈبے سے لے کر نیچے اتارنے کی ہدایت کی۔ میں جلد از جلد پلیٹ فارم سے نکل کر کلکتہ کے تاریخی ہوڑہ برج کو دیکھنا چاہتا تھا جو کلکتہ کا سمبل تھا اور جسے دیکھے ہوئے پورے اکیس سال ہو چکے تھے۔ میں بلاوجہ جذباتی بن گیا تھا۔
میں قلی کے سر پر اپنا واحد سوٹ کیس رکھے تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا کہ پلیٹ فارم پر اچانک شور بلند ہوا۔ "پکڑو پکڑو، دوڑو، دوڑو"
میں نے دیکھا ایک شخص پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے سامان میں سے کوئی چیز لے کر بھاگ رہا ہے اور قلی اور سپاہی اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ چور نہایت تیزی کے ساتھ سٹیشن پر کھڑے ہوئے خالی ویگنوں کے نیچے سے گزرتا ہوا غائب ہو چکا تھا اور سپاہی اور قلی دوڑتے دوڑتے رک گئے تھے جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ چور غائب ہو چکا ہے اور اب اس کا تعاقب کرنا بیکار ہے۔
میں نے سوچا، "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کلکتہ کی معاشی حالت درست نہیں ہے، چور نے بالآخر اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لئے ایک وقت کے کھانے کا انتظام کر ہی لیا"
بنگال کے عوام کی حالت یوں بھی کبھی اچھی نہیں رہی اور صرف بنگال ہی کیوں، پورے ہندوستان کے عوام کی خستہ حالی دنیا میں مشہور ہو چکی ہے۔ مجھے 1943ء میں بنگال کے قحط کے بارے میں وامق جونپوری کا مشہور نغمہ "بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال" یاد آ گیا، جسے گا

کر سارے ہندوستان کے ترقی پسند نوجوان ملک کے مختلف حصوں میں قحط بنگال کے لئے چندہ اکٹھا کیا کرتے تھے۔ اس واقعہ کو 42 سال ہو چکے تھے اور اس اثنامیں آزادی کے بعد بھی عوام کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

میں پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا اور جلد از جلد گھر پہنچنے کے لئے غلطی سے ٹیکسی کے بجائے ہاتھ رکشا لے لیا رکشا ڈرائیور مسافروں کے انتظار میں ایک قطار میں کھڑے تھے۔ اتنے دنوں کے بعد انسان پر سواری کرتے ہوئے عجیب سا محسوس ہوا۔ ہاتھ سے کھینچا جانے والا رکشا بھی بار برداری کا عجیب و غریب ذریعہ ہے۔ ہاتھ سے کھینچے جانے والے رکشے کا آغاز یوں تو ماضی میں چین سے ہوا لیکن بنکاک، ہانگ کانگ، سنگاپور، برما، اور ملایا سے ہوتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ ذرائع نقل و حمل کی ترقی اور اس سواری کو "غیر انسانی" گرداننے کے باعث ہینڈ رکشا مشرق بعید کے تمام ملکوں سے ختم ہو چکا ہے لیکن یہ کلکتہ میں آج بھی جاری و ساری ہے، شہری انتظامیہ کی جانب سے اسے ختم کرنے کی کئی بار کوشش کی گئی، لیکن کئی ہزار رکشا مزدوروں کے بے روزگار ہو جانے کے اندیشے کے باعث اسے ختم کرنا ممکن نہ ہوا۔ رکشا چلانے والوں میں اکثریت صوبہ بہار اور مشرقی یو۔پی کے بے زمین کسانوں کی تھی جو اپنی زمینوں سے محروم ہونے کے بعد روزگار کی تلاش میں کلکتہ آتے اور کوئی روزگار نہ پا کر رکشا چلانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ بنگالی یا اڑیا رکشا چلانے والا شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا۔ اس لئے کہ اسے چلانے کے لئے بڑی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور بنگال اور اڑیسہ کے لوگ رکشا چلانے کے لئے "نااہل" تصور کئے جاتے ہیں۔ رکشا مزدور، رکشا مالکان سے یومیہ کرائے پر رکشا حاصل کرتا ہے۔ رکشا پلر ایک مقررہ رقم بطور معاوضہ روز رکشا مالک کو ادا کرتا ہے اور اس مقررہ رقم سے اوپر فاضل آمدنی ہوتی ہے وہ اس کے حصے میں آتی ہے۔ خواہ یہ رقم کتنی ہی ہو۔

آدھی زندگی رکشا پر سواری کرتے ہوئے گزار دینے کے باوجود مجھے کبھی احساس جرم نہیں ہوا لیکن اتنے دنوں کے بعد رکشا پر سواری کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کوئی جرم کر رہا ہوں اور رکشا چلانے والا میری طرح کوئی انسان نہیں، جانور ہے لیکن کیا کیا جا سکتا تھا؟ اگر میں ٹیکسی لے لیتا تو شاید انسانیت کی اس قدر تذلیل اور بے چارگی کا احساس نہ ہوتا۔

ہوڑہ سٹیشن سے روانہ ہوتے ہی معلوم ہو گیا کہ یہ وہ ہوڑہ سٹیشن نہیں ہے جو میں نے دو عشرے قبل دیکھا تھا۔ اب اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ فلائی اوور تعمیر ہو جانے کے باعث ٹرامیں، بسیں اور گاڑیاں اب اس پر سے گزر رہی تھیں اور دریائے ہگلی کے کنارے واقع اشنان گھاٹ

مزید نیچے ہو گیا ہے۔ اس وقت اگرچہ صبح کے سات بج چکے تھے، لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا شہر جاگ اٹھا ہو اور ہر طرف سے گاڑیوں اور راہ گیروں کا سیلاب امنڈ آیا ہو۔ ہوڑہ برج کے دونوں فٹ پاتھوں پر انسانوں کا سر ہی سر نظر آرہا تھا جیسے انسانوں کا بہت بڑا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو "کلکتے کی آبادی میں بلاشبہ غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے" میں نے دل میں سوچا۔

ہوڑہ برج بلاشبہ برٹش امپائر اور اس کی انجینئرنگ کا شاہکار تھا، جس نے اپنی تعمیر کے ساتھ ہی نہ صرف متحدہ ہندوستان، بلکہ ساری دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی، اس لئے کہ اس برج کا افتتاح دوسری جنگ عظیم کے دوران 1941ء میں ہوا تھا۔ جب برطانوی سامراج کا سورج نصف النہار پر تھا اور اس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ کلکتہ، آج کی طرح نہ اس قدر وسیع تھا اور نہ گندا۔ ہندوستان کی زیادہ تر درآمدی اور برآمدی تجارت کلکتے سے ہی ہوتی تھی۔ کلکتہ بڑی بڑی برطانوی تجارتی کمپنیوں، بینکوں اور کارخانوں کا مرکز تھا اور دریائے ہگلی میں ہی تمام غیر ملکی دخانی جہاز لنگر انداز ہوتے تھے، جس کی وجہ سے کلکتہ اور ہوڑہ کے درمیان مستقل پل کا ہونا ضروری ہو گیا تھا۔

ہوڑہ برج پر سے گزرتے ہوئے مجھے لڑکپن کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس وقت میری عمر دس یا بارہ سال کی ہوگی۔ میں نے ہوڑہ کے لکڑی کے پل کو کھلتے اور جڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ فولاد کا موجودہ پل تعمیر ہونے سے قبل دریائے ہگلی پر لکڑی کا پل ہوتا تھا، جو بڑے بڑے جہازوں کے گزرنے کے لئے ہر روز رات کو کھول دیا جاتا تھا۔ لکڑی کا یہ پل کئی حصوں میں منقسم ہوتا تھا اور بڑے بڑے اسٹیمر، پل کے درمیانی حصے کو کھینچ کر ایک دوسرے سے جدا کر دیتے تھے، تاکہ بڑے جہازوں کے گزرنے کے لئے جگہ نکل آئے۔ اس مقصد کے لئے پل کے درمیانی حصے کو اسٹیمر کے ساتھ بڑے بڑے رسوں سے باندھ دیا جاتا تھا اور طاقت ور اسٹیمر انہیں کھینچ کر دریا کی دائیں بائیں جانب لے جاتے تھے۔ میں اس عجیب و غریب منظر کو دیکھنے کے لئے عموماً اپنے والد کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ پل کھول دینے کے باعث کلکتہ اور ہوڑہ کے درمیان تمام ٹریفک معطل ہو جاتی تھی اور صبح کے وقت پل کے جڑتے ہی دونوں جانب سے گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی تھی۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں اس طرح تازہ ہو گئیں، جیسے کل کی باتیں ہوں۔

اس پل کا جب افتتاح ہوا تھا تو اسے نہ صرف کلکتہ، بلکہ ساری دنیا میں ایک "واقعہ" قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ پل بھی سان فرانسسکو کے گولڈن گیٹ برج کی طرح دنیا کا ایک عظیم الشان برج

اور انسانی حکمت کا بیمثال نمونہ تھا۔ اس کے افتتاح پر سارے برٹش امپائر میں خوشیاں منائی گئیں۔ اس پل کی خوبی یہ تھی کہ وہ دریائے ہگلی کی سطح سے بہت بلند تھا۔ اس کے صرف دو ستون تھے جو دونوں کناروں پر ایستادہ تھے اور درمیان میں پل کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے اور بلند و بالا جہاز اس کے نیچے سے بآسانی گزر جاتے تھے۔ یہ پل اس قدر مضبوط تھا کہ اس پر سے نہ صرف بڑی اور بھاری گاڑیاں گزر جاتی تھیں بلکہ ٹرامیں بھی گزرتی تھیں۔ اس پل کی تعمیر سے کلکتہ اور سارے ہندوستان کے درمیان زمینی رابطہ قائم ہو گیا تھا اور کھلنا اور جیسور (موجودہ بنگلہ دیش) سے لے کر پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے درمیان آمد و رفت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔

رکشا پر سواری کرنے کی یہ سزا ملی کہ رکشا پتلی پتلی گلیوں میں جا کر پھنس گئی۔ کلکتے کی ٹریفک پولیس نے رکشاؤں اور دوسری سست رفتار گاڑیوں کو بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر سے گزرنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے رکشا اور ٹھیلہ گاڑی (ہینڈ کارٹ) وغیرہ صرف گلیوں سے ہی گزر سکتی تھی اور کلکتے کی گلیاں اس قدر تنگ اور بھری ہوئی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ اس وقت اگرچہ صبح کے صرف سات بجے تھے، لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دن کے بارہ بج چکے ہوں۔ تمام گلیاں رکشاؤں، ٹھیلہ گاڑیوں، سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس پر ٹریفک کے اصولوں کا قطعی فقدان، سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا اور ضبط و نظم کا دور دور تک سراغ نہیں مل رہا تھا چنانچہ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی رکشے کو رک جانا پڑتا تھا۔

اب رکشا ہوڑہ برج سے گزر کر بڑا بازار کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ جو کلکتے کا سب سے بڑا اور مصروف ترین کاروباری علاقہ تھا اور جہاں خورد و نوش اور تھوک اشیا کی آڑھت تھی۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں صبح ہوتے ہی لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی۔ یہ علاقہ کراچی کے جوڑیا بازار اور کھارادر سے بہت زیادہ ملتا جلتا تھا دونوں کی تعمیر اور گلی کوچے اور وہاں کے رہنے والوں میں بڑی مشابہت تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کراچی میں اس علاقہ کی نقل میں مکانات اور بازار تعمیر کئے گئے ہوں۔

ان گلیوں کی خوبیاں یہ تھیں کہ گائے اور بیل بیچ سڑک پر نہایت اطمینان سے اندھتے پھرتے تھے اور انہیں کوئی ہٹانے والا نہیں تھا۔ یوں بھی ہندوؤں کے لئے گائے اور بیل مقدس ہوتے ہیں اور یہ خالص جینیوں (جین مت کے ماننے والوں) اور مارواڑیوں کا محلہ تھا۔ اس لئے ان مقدس جانوروں کو کون ہاتھ لگاتا۔ سڑک پر رومن طرز کے سیاہ پتھر بچھے ہوئے تھے، جو برطانوی دور کی یادگار تھے۔

برطانوی حکومت نے سڑکوں کی تعمیر کا یہ انداز رومنوں سے سیکھا تھا۔ جولیس سیزر نے جب برطانیہ پر قبضہ کیا اور لندن میں سڑکوں کی تعمیر شروع کی تو سڑکوں پر اسی قسم کے سیاہ پتھر بچھا دیئے تھے، تاکہ سڑک کے ٹوٹنے پھوٹنے کا امکان نہ رہے اور روز روز تعمیر کی تکلیف سے محفوظ رہا جائے۔ چنانچہ جب برٹش حکومت نے لندن کے طرز پر کلکتے کی تعمیر شروع کی تو سڑکوں کی تعمیر کے لئے یہی رومن طرز اختیار کیا لیکن ایسی سڑکیں اب کلکتے کی چند گلیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس کی جگہ اب کنکریٹ کی سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں۔

انسانوں سے بھری ہوئی چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرنے میں بہت زیادہ وقت ضائع ہو گیا، لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اکیس سال کے بعد کلکتے کو اس کی اصل صورت میں دیکھا اور محسوس کیا کہ کلکتہ پہلے سے زیادہ پر ہجوم اور گندا ہو چکا ہے اور کلکتے کی گندگیوں کے بارے میں جو کچھ سنتا رہا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ کلکتہ ماضی میں ہندوستان کا واحد شہر تھا جس کی سڑکیں روز صبح و شام دریائے ہگلی کے پانی سے دھوئی جاتی تھیں۔ متعدد خاکروب صبح و شام برش سے رگڑ رگڑ کر سڑکوں پر سے غلاظتیں صاف کرتے تھے اور ان کے کام کی نگرانی کے لئے خاص طور پر نگران مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ اعلان آزادی تک جاری رہا۔ اس وقت کلکتے کی آبادی میں اس قدر اضافہ نہیں ہوا تھا دوسری جنگ عظیم کے دوران شہر کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہونے کے باوجود آبادی، کلکتہ کارپوریشن کے قابو میں تھی، اس لئے شہر کلکتہ، صفائی اور ستھرائی میں آج سے کہیں زادہ خوب صورت تھا۔

برطانوی حکومت نے پہلا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے کلکتے کو لندن کی طرز پر تعمیر کیا تھا۔ اس کی سڑکیں، اس کی چورنگیاں، اس کی عظیم الشان پیلیشیل بلڈنگیں پارک، شاہراہیں اور یادگار میناریں، فوارے اور آمدورفت کی سواریاں سب کچھ لندن کے طرز پر بنائی گئی تھیں، جس نے بھی لندن دیکھا ہے وہ کلکتہ دیکھنے کے بعد میرے خیال سے اتفاق کرے گا، لیکن یہ شہر کس طرح قائم ہوا۔ اسے قائم کرنے والے کون تھے؟ یہ اپنی جگہ بہت دلچسپ داستان ہے۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتا ہوا میں جب اپنے محلے امرتلہ لین۔ (بڑا بازار) میں پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ اکیس سال کے دوران یہاں کچھ بھی نہیں بدلا۔ رنگ و روغن سے محروم وہی بوسیدہ مکانات، وہی راہ گیروں کا جم غفیر، وہی چہل پہل، وہی کاروباری لین دین۔ وہی آڑھت داری، سب کچھ وہی، جو میں دو عشرے قبل یہاں چھوڑ کر گیا تھا، البتہ اب مسلمانوں کا محلہ ہندوؤں کے محلے میں تبدیل ہو چکا تھا اور جن محلوں میں اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے گونجتے تھے، اب وہاں جئے

ہند اور بندے ماترم کے نعرے گونج رہے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل امرتلہ لین، زکریا سٹریٹ، کولو ٹولہ، سندریا پٹی وغیرہ مسلمانوں یعنی مسلمان تاجروں اور اونچے طبقہ کے مسلمان روسا کے محلے تھے، لیکن اس دوران مسلمان رفتہ رفتہ اپنا کاروبار سمیٹ کر اور اپنی جائیدادیں بیچ کر پاکستان چلے گئے۔ ان کی جگہ ہندو سیٹھوں نے لے لی اور اپنا کاروبار شروع کر دیا اور میرے اہل خاندان کی طرح جو عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کی ہوئی جائیدادوں کو فروخت نہ کر سکے، وہاں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس لئے کہ ان کے سامنے اور کوئی متبادل راہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی خاندانی ساکھ قائم رکھنے اور ذرائع آمدنی بڑھانے کے لئے خالی گھروں اور کمروں، دالانوں اور آنگنوں میں ہندو کرایہ داروں کو بسا لیا تھا اور اب ایک ہی کوٹھی میں ہندو بھی رہنے لگے اور مسلمان اور سکھ بھی۔ جاتی دھرم کا بھید بھاؤ یہاں چل نہ سکا۔ اس لئے کہ سب ہی ایک چھت کے نیچے رہنے پر مجبور تھے۔

میرا خاندان کلکتہ کے قدیم ترین خاندانوں میں سے تھا۔ میرے جد امجد حاجی قاسم عارف مہتر، برٹش امپائر کے زمانہ عروج میں سورت (گجرات) کے ضلع راندیر سے نقل مکانی کر کے برطانوی ہند کے پہلے دارالحکومت کلکتے میں آبسے تھے اور سوت اور دوسری اشیائے خورد و نوش کی تھوک تجارت کے ذریعے خوب دولت کمائی تھی مکان نہیں، مکانات تعمیر کئے تھے اور موجودہ پیلیشیل بلڈنگ (3. امرتلہ لین) تعمیر کروائی تھی۔

اس دور کے کلکتے کی مضافات الٹا ڈانگہ میں ریشمی کپڑے کا پہلا کارخانہ "بنگال سلک ملز (لمیٹڈ)" کے نام سے قائم کیا تھا جو برصغیر کے کسی مسلمان کا پہلا سلک ملز تھا۔ حاجی قاسم عارف مہتر نے اپنی تمام اسلام پسندی اور روایتی تہذیب اور طرز زندگی اپنانے کے باوجود اپنے بچوں کو جدید اور مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کی اجازت دے دی تھی، چوں کہ یہی زمانے کا تقاضا تھا۔ خود شریعت کے مطابق چار شادیاں کیں اور ان سے ہونے والی اولادوں (احمد قاسم عارف، یوسف قاسم عارف، سلیمان قاسم عارف، علی قاسم عارف، غلام حسین قاسم عارف اور یعقوب قاسم عارف) کو ملک کی بہترین درس گاہوں میں تعلیم دلوائی اور صرف اتنا ہی نہیں زمانے کے مطابق علی گڑھ، آکسفورڈ اور کیمبرج بھیج کر اعلیٰ ترین تعلیم بھی دلوائی۔

جیسا کہ دنیا کا دستور ہے۔ انسان صرف دولت و ثروت سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ دنیاوی جاہ و حشم اور اعلیٰ سماجی مرتبے کا بھی خواہش مند ہوتا ہے، چنانچہ میرے پردادا اور دادا کو کاروبار کے ذریعے بے پناہ دولت حاصل ہو گئی تو انہیں سماجی مرتبے کے حصول کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ انگریز حکمرانوں سے

رسم و راہ استوار کر کے اور ان کی خوشنودی کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا تھا داداؤں نے انگریزی تہذیب پہلے ہی اختیار کر لی تھی اور آکسفورڈ اور کیمبرج سے اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ میموں سے بھی سول میرج کر لیا تھا، لیکن ابھی خطابات کا حصول باقی تھا۔ خاندان کے بزرگ اپنی دولت اور حشمت کے بل پر انگلش سوسائٹی کی سب سے بڑی علامت "کلکتہ کلب" کے ممبر بھی بن چکے تھے۔ اب اعلیٰ انگریز عہدیداروں سے بھی ربط و ضبط اور رسم و راہ بڑھی گارڈن پارٹیوں کے ساتھ ساتھ گھروں اور اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں ڈنر پارٹیاں ہونے لگیں، انگریز بہادر کی نظروں میں سرخرو ہونے اور تاج برطانیہ سے اپنی غیر مشروط وفاداری کا سکہ جمانے کے نتیجے میں خان بہادر اور خان صاحب کا خطاب تو نہ ملا البتہ کنگ کونسل کی رکنیت حاصل کرنے کا اعزاز ضرور حاصل ہو گیا، جو 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت معرض وجود میں آنے والی سنٹرل لیجسلیٹو کونسل سے قبل سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی اور بڑے بڑے امراد روسا اس کے لئے ترستے تھے۔ میرے داداؤں میں سے ایک یعنی چچازاد دادا یعنی والد کے چچا یعقوب عارف جب کے سی بن گئے تو ہمارے خاندان کا سر فخر سے بلند ہو گیا اور سارے ملک میں "عارف فیملی" کو شہرت حاصل ہو گئی۔ میرے ایک اور دادا غلام حسین عارف کو عملی سیاست سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ مسلم لیگ کی سرپرستی کرنے لگے جس کے نتیجے میں 1907ء میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس اسی عمارت یعنی 3 نمبر امرتلہ لین میں منعقد ہوا۔ اس وقت 3 نمبر امرتلہ لین۔ 5 نمبر امرتلہ لین کہلاتا تھا۔

کلکتہ کے رئیسوں میں شامل ہونے کے بعد اس کے مطابق بود و باش اختیار کرنا بھی ضروری تھا۔ جس وقت حاجی قاسم عارف نے زکریا اسٹریٹ اور چیت پور روڈ سے متصل امرتلہ میں موجودہ عظیم الشان پیلیشیل بلڈنگ تعمیر کروائی اس وقت وہاں شاذ و نادر ہی کوئی دوسری عمارت تھی۔ ہر طرف کھلی جگہ اور بڑا سا میدان تھا چنانچہ اس کوٹھی کو (جو لال کوٹھی کے نام سے مشہور تھی) اس دور کے فیشن کے مطابق جھاڑ فانوس، سنہری فریموں والی قد آدم دیوار گیر تصویروں (جو زیادہ تر خاندان کے بزرگوں کی تھیں) بڑی بڑی بلوریں کرسیوں وکٹورین طرز کی میزوں، الماریوں اور قیمتی کشمیری قالینوں سے آراستہ کیا گیا۔ ایک کمرہ خاص طور پر رقص و سرود کے لئے وقف کر دیا گیا جو "ناچ گھر" کہلایا۔ اعلیٰ انگریز افسروں اور معزز مہمانوں کی ضیافت کے بعد بلیرڈ کھیلنا اس دور کے مہذب لوگوں کا دستور تھا، لہذا ایک لمبی سی بلیرڈ ٹیبل کا بھی اہتمام کر دیا گیا اور یہ کمرہ "بلیرڈ روم" کہلایا۔ یہ سارا ٹھاٹ باٹ کروفر کا ساز و سامان اور تزک و احتشام میں نے اپنے لڑکپن میں اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔

خاندان کے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں سے میں نے عارف فیملی کے عروج و زوال کی پوری داستان سنی وہ بہت ہی عبرت ناک ہے ان بزرگوں کے بیان کے مطابق یہ تزک و احتشام صرف دو نسلوں تک (یعنی پردادا اور ان کی اولادوں تک) جاری رہا۔ اس کے بعد ہی زوال شروع ہو گیا۔ دولت ہمیشہ برکتوں کے ساتھ بہت سی برائیاں بھی لاتی ہے۔ ان برائیوں میں عیش پرستی (طوائفوں کے کوٹھیوں پر جانا) ہر اتوار کو کلکتہ ٹرف کلب میں جا کر گھڑ دوڑ پر داؤ لگانا، کلکتہ کلب میں فلیش اور پوکر میں روز سینکڑوں اور ہزاروں روپے کی بازی لگا کر ہار جانا، شامل ہیں۔ خاندان کی تیسری نسل (یعنی میرے والد اور چچا صاحبان) نے اپنے اپنے حصے کی دولت، ان خرافات میں لٹا دی۔ اسی کے ساتھ ایک چچا کے ہاتھوں ایک معروف طوائف کا قتل، اس کے نتیجے میں ہائیکورٹ سے لے کر پیروی کونسل تک مقدمہ بازی اور پھر پھانسی تک کی نوبت چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری نقدی اور نجی جائیدادیں ختم ہو گئیں اور جو جائیدادیں فروخت ہونے سے بچ گئیں وہ اس لئے بچ گئیں کہ انہیں فروخت کرنا ممکن نہ ہوا۔ جد امجد حاجی قاسم عارف نے اپنی بے پناہ جائیدادوں میں سے ایک حصہ اپنی وصیت کے مطابق عوام الناس کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جس کو فروخت کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا اب خاندان کے باقی ماندہ افراد اسی وقف العوام کی عمارتوں میں مقیم تھے اور زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔

آخر میں یہ ساری باتیں کیوں لکھ رہا ہوں؟ میں نے تو یہ باتیں اس سے قبل کسی کو نہیں بتائیں حتیٰ کہ اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی نہیں۔ میرے دوست و احباب میرے ماضی اور میرے خاندانی پس منظر سے قطعی ناواقف ہیں۔ میں نے انہیں کبھی بتانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس لئے کہ مجھ جیسے خستہ حال شخص کو دیکھ کر ان باتوں پر کون یقین کرے گا؟ اس لئے میں نے اس سلسلے میں خاموش رہنے کو ہی قرین مصلحت تصور کیا۔ یہ شاید کلکتے کا سفر تھا۔ جس نے ماضی کی ساری باتیں اس طرح تازہ کر دیں جیسے یہ ابھی ابھی گزری ہوں۔ میں رکشا سے اتر کر ان باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وقت تھا کہ چشم زدن میں گزر چکا تھا۔

اب نہ وہ افراد خانہ ہیں اور نہ وہ جاہ و حشم۔ جو لوگ بچ گئے تھے۔ سب رفتہ رفتہ پاکستان جا چکے تھے۔ سب کچھ قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ اب صرف ماضی کی یادیں رہ گئی تھیں، جنہیں چند لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان میں میرے بڑے بھائی سلیمان عارف بھی شامل ہیں۔

رکشا کے میرے آبائی گھر کے سامنے رکتے ہی مجھے اپنے بھائی کی باتیں یاد آ گئیں۔

میں جب پاکستان روانگی سے قبل آخری بار ان سے ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے پاکستان جانے سے روکتے ہوئے آبدیدہ ہو کر کہا، "ہم سب کو چھوڑ کر پاکستان نہ جاؤ۔ وہاں تمہیں کیا ملے گا؟ یہاں تمہارا آبائی مکان ہے۔ رشتے دار اور عزیز و اقارب ہیں۔ اجنبی ملک میں تمہارا کون ہے؟"

لیکن میں پاکستان چلا آیا تھا۔ ان کے منع کرنے کے باوجود۔ میں جب ہر حال میں پاکستان جانے کے لئے بضد ہو گیا تو انہوں نے ناراض ہو کر بد دعا دی، "اچھی بات ہے۔ جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن تم وہاں کبھی خوش نہیں رہو گے"

ان کی بد دعا مجھے نہیں لگی۔ میں پاکستان آ کر زندگی اور اپنے کیریر میں کامیاب رہا، میری بیوی بچے خوش ہوئے۔ انہیں اطمینان اور خوشحالی نصیب ہوئی لیکن اکیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد اپنے آبائی شہر پہنچ کر جس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہوا، وہ یہ کہ مجھے پاکستان میں سب کچھ ملا لیکن پاؤں کے نیچے زمین نہیں ملی، جس پر میں اور میری آئندہ نسلیں کھڑی ہوتیں، اس کے برعکس میرے بھائی اور ان کی طرح لاکھوں، کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستانی مسلمانوں کی طرح خوشحالی نصیب نہ ہوئی لیکن وہ اپنی آبائی سرزمین پر ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے تو ہیں۔

مجھے اپنے دوست رفیع الدین راز کا یہ شعر بے اختیار یاد آیا

چھوڑو ان کتابوں کو، آؤ ہم بتاتے ہیں
پاؤں سے نکلتی ہے دوستو زمین کیسے

اس دفعہ کلکتہ گیا تو میں نے اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے کلکتہ شہر کی سیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے 2 نمبر ڈبل ڈیکر بس پر سوار ہو گیا، جو شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہے۔ میں نے زکریا سٹریٹ سے لے کر ٹالی گنج کے آخری سرے اشوک نگر تک اور شام بازار اور بیلگچھیا سے دمدم تک کی سیر کی، تاکہ کلکتہ کی وسعت کا اندازہ ہو، لیکن معلوم ہوا کہ کلکتہ صرف یہیں تک محدود نہیں ہے، وہ بارک پور اور دریائے بھاگیرتی کے اس پار ہوڑہ ہگلی اور بالی برج سے بھی آگے پھیل چکا ہے اور قرب و جوار کی 22 میونسپلٹیاں اس میں ضم ہو چکی ہیں اور اس کی مجموعی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اصل کلکتے کی آبادی تقریباً 91 لاکھ 40 ہزار 4 سو 50 ہے۔

میں ڈبل ڈیکر بس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ تین چھوٹے چھوٹے گاؤں کلکتہ، سوتانٹی اور گوبند پور پر مشتمل یہ خطہ اتنا بڑا شہر کیسے بن گیا اور اس کا شمار دنیا کے چند بڑے شہروں میں کیسے ہونے لگا حالاں کہ میں نے جس وقت کلکتہ کی سرزمین پر قدم رکھا اس وقت اس شہر کو قائم ہوئے دو سو چھیانوے برس ہو چکے تھے (یعنی تین صدی پورے ہونے میں صرف چار سال باقی تھے) انگریز مورخوں کا کہنا تھا کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ جوب چارنک نے 1690ء میں کلکتہ میں تیسری بار "ہالٹ" (قیام) کیا اور تجارتی مال و اسباب کو رکھنے کے لئے کوٹھی تعمیر کی اس وقت سے کلکتہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ شہر انہوں نے بسایا ہے۔ اس وقت کلکتہ ڈیہی کلکتہ کہلاتا تھا۔ مقامی زبان میں "ڈیہی" اس مقام کو کہتے ہیں، جہاں ریاست کے لئے مالگذاری جمع کروائی جاتی ہے۔ اس وقت کلکتہ کی حد (سرحد) موجودہ مہاتما گاندھی روڈ (پرانے ہیرسن روڈ) سے شروع ہو کر جنوب میں دھرم تلہ اسٹریٹ اور دریا کے کنارے تک تھی۔ اس کے بعد سوتانٹی اور گوبند پور واقع تھا۔

ان تینوں گاؤں کا مالک بوڑیشا کا زمیندار شابرن چودھری تھا جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے چند ہزار روپے کے عوض ان تینوں گاؤں کو خرید لیا تھا اور بعد میں اپنی نو آبادی قائم کی تھی۔ یہ درست ہے کہ ڈیہی کلکتہ کی تقدیر اس وقت بدلی جب سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں مغربی نو آباد کاروں نے یہاں آکر کاروبار شروع کیا، لیکن کلکتہ اور سوتانٹی اپنی کاروباری حیثیت کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل ہی مشہور تھی اور دریائے بھاگیرتی کے اس پار واقع ہگلی اور ست گرام کے بیوپاری اپنے کاروبار اور لین دین کے لئے ڈیہی کلکتہ اور سوتانٹی آیا کرتے تھے، چنانچہ جب فرنگی تاجر اپنے بحری جہازوں کے ذریعے کلکتہ پہنچے تو انہیں اپنے کاروبار کے لئے یہ مقام مناسب نظر آیا اور انہوں نے اپنی کوٹھی تعمیر کر لی، لیکن یہ سمجھنا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر ہی پہلے یورپی تھے جنہوں نے کلکتے کی سرزمین پر قدم رکھا، درست نہیں ہے، جدید تحقیق کے مطابق آرمینین پہلے مغربی تاجر تھے، جنہوں نے 1630ء میں کلکتہ میں اپنی نو آبادی قائم کی اور ہندوستانیوں سے لین دین شروع کیا۔ اس کا ثبوت دریائے ہگلی کے کنارے واقع مرغی ہٹہ (موجودہ کیننگ اسٹریٹ) میں واقع وہ آرمینین نزارتھ چرچ ہے جس کے مقبرے سے ایک کتبہ دریافت ہوا ہے جو ...ہالی نامی ایک آرمینی عورت کا مقبرہ ہے جس میں آرمینی زبان میں ایک عبارت درج ہے جس کے ساتھ 1630ء کا ہندسہ درج ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جوب چارنک کی آمد سے نصف صدی قبل آرمینی تاجر یہاں کاروبار کرتے تھے اور آرمینی راہبوں نے ہی یہاں گرجا تعمیر کیا تھا۔

میں کلکتہ کے ماضی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ ماضی اس قدر دلچسپ اور سنسنی خیز ہے کہ اس پر بہت عمدہ ناول لکھا جا سکتا ہے۔ بنگلہ اور انگریزی میں قدیم کلکتہ کے پس منظر میں کئی دلچسپ ناول لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں ایک ناول "کیری صاحب کا منشی" ہے۔ ایک اینگلو انڈین مصنف نے قدیم کلکتے کے پس منظر میں ناول لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی اس کا نام جان ماسٹر ہے۔ جس کے ناول "بھوانی جنکشن" پر لاہور کے پس منظر میں فلم بھی بن چکی ہے اور اس ناول نے اپنی ہندوستان دشمنی کی وجہ سے بڑی شہرت پائی ہے۔ ذرا سوچئے، نواب سراج الدولہ کے دور حکومت میں جب انہیں معلوم ہوا کہ فرنگی، تجارت کے بہانے ہندوستان کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور اس ملک کو ہتھیانے کے لئے کوشاں ہیں تو وہ 1756ء میں فرنگیوں کو ملک سے نکالنے کے لئے ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ان کی تجارتی کوٹھیوں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ فرنگی سپاہی بھاگ کر اپنے

جہازوں میں پناہ لیتے ہیں اور ان کے جہاز دریائے بھاگیرتی سے فرار ہو کر بحیرہ بنگال میں لنگر انداز ہو جاتے ہیں اور وہ وہاں اس وقت تک انتظار کرتے ہیں جب تک کلکتہ اور سوتانٹی پر سے نواب سراج الدولہ کے سپاہیوں کا قبضہ ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ اس وقت بنگال کا دارالحکومت مرشد آباد ہے۔ کلکتہ اور سوتانٹی کی اس وقت تک کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ محض ایک گاؤں اور تجارتی منڈی ہیں۔ نواب سراج الدولہ کے پاس چونکہ بحری بیڑا نہیں ہے اس لئے وہ مفرور فرنگیوں کا نہ بحیرہ بنگال تک تعاقب کر سکتے ہیں اور نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ ہندوستان پر ایک ہزار سال تک حکومت کرنے کے باوجود مسلمان حکمرانوں نے اپنی سمندری سرحدوں کی حفاظت کے لئے کبھی غور نہیں کیا۔ اس لئے بحری بیڑا بھی تیار نہیں کیا حالانکہ عربوں نے اپنے زمانہ عروج میں اس جانب خصوصی توجہ دی تھی، لیکن ہندوستان کے مسلمان حکمران سمندری راستے سے دشمن کے حملے کے امکان سے بالکل لاپرواہ رہے چنانچہ جب نواب سراج الدولہ کے سپاہی کلکتہ سے واپس چلے گئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہی اور تاجر پھر کلکتہ آگئے۔ اس کے ایک سال کے بعد 1757ء میں جنگ پلاسی ہوئی، جس میں فرنگیوں کی سازش کے نتیجے میں انگریزوں کی جیت ہوئی اس کے بعد سے کلکتے پر انگریزوں کا مستقبل تسلط قائم ہو گیا۔

یہ سارے تاریخی واقعات اور اس کے بعد اس عظیم شہر کے بسنے کی داستان، کلکتے کی سماجی ثقافتی اور اقتصادی ترقیاں غالب کی کلکتہ آمد اور مقامی شاعروں سے چپقلش وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن پر ایک بڑے تاریخی ناول کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ کاش کوئی محنتی ناول نویس اس جانب توجہ دیتا۔

کلکتے کی سیر کے دوران میرے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوا کہ صوبہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود شہر کلکتہ میں ہندوؤں کی اکثریت کیوں ہے۔

غور کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی اصل وجہ فرنگیوں کی پالیسی ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ شہر کلکتہ کو آباد کرنے والے یہی فرنگی تاجر ہیں، جنہوں نے اپنی تجارتی اشیا کی حفاظت کے لئے دریائے ہگلی کے ساحل پر واقع تین چھوٹے چھوٹے گاؤں سوتانٹی، کلکتہ اور گوبند پور کو خرید کر اپنی کوٹھیاں تعمیر کیں اور اپنی بستیاں آباد کیں، لیکن جوں جوں ان کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھتا گیا اور سلطنت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آتی گئی۔ انہوں نے مسلمانوں کو کچلنے اور ہندوؤں کو نوازنے کی حکمت عملی اختیار کی، خصوصاً مسلمانوں کی جاگیریں ضبط کرنے اور قدیم زرعی نظام کے خاتمے

اا۔ بنگال میں زمینداری سسٹم کے قیام کے نتیجے میں ہندو (بنگالی) بنیاوں میں ایک نیا طبقہ نہایت تیزی کے ساتھ ابھرا۔ جس کا کام مسلمان کسانوں سے نقد لگان وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کروانا تھا۔ انگریزوں نے ابتدا سے ہی ہندوؤں (بنگالی تاجروں اور سود خور بنیاؤں) کو نوازنے کی حکمت عملی اختیار کر لی تھی، جس کی ایک واضح مثال سوابازار کے مہاراجہ نب کرشن تھے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں وارن ہیسٹنگ کے ساتھ ایک معمولی کیرانی (کلرک) تھے اور ہیسٹنگ کو فارسی پڑھاتے تھے۔ اس وقت وارن ہیسٹنگ اور نب کرشن تیسرے درجے کے سرکاری ملازم شمار کئے جاتے تھے، لیکن وقت نے پلٹا کھایا اور ہیسٹنگ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوٹھیوں کے جونیئر نگران آفیسر (فیکٹر) سے ترقی کر کے گورنر جنرل بن گئے تو انہوں نے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے پرانے رفیق کار نب کرشن کو سوتانٹی (پورے شمالی کلکتے) کا تعلقدار بنادیا۔ صرف اتنا ہی نہیں، انہیں "مہاراجہ" کا جلیل القدر خطاب بھی عطا کیا اور انہیں خطاب اور خلعت عطا کرنے کے لئے ایک عظیم الشان دربار بھی منعقد کیا۔ جس کا انتظام لارڈ کلائیو کی خصوصی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ اس موقع پر "مہاراجہ" نب کرشن سوابازار سے وائسرائے ہاؤس تک ایک سجے ہوئے ہاتھی پر سوار ہو کر نہایت شان کے ساتھ تشریف لائے۔ اس موقع پر شہر میں جتنے بھی انگریز تھے۔ وہ سب اس "دربار" میں حاضر ہوئے۔

صرف اس ایک مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو بنگالی کس طرح ابتدا سے ہی انگریزوں کی آنکھوں کے تارے بن گئے تھے۔ اس کے برعکس جتنے بھی بنگالی مسلمان تھے۔ وہ سب بڑے بڑے ہندو زمینداروں کے کھیتوں میں کاشت کر رہے تھے۔ مسلمان زمینداروں میں صرف نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ یا ان جیسے دو چار ایسے مسلمان تھے جنہوں نے انگریزوں سے نقد رقوم کے عوض زمینیں خرید کر اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کر کے مہاراجہ نب کرشن کی طرح نواب کا خطاب حاصل کر لیا تھا اور وہ بھی اس لئے ممکن ہوا تھا کہ وہ کشمیری ریشم اور پہاڑی نمک کے تاجر تھے۔

کلکتے کی تجارتی دنیا میں مسلمانوں کا ورود بہت بعد میں اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا اور وہ بھی گجرات اور کچھ کے علاقے سے نقل مکانی کر کے آنے والے تجارت پیشہ مسلمانوں کا ورود (میرے خاندان کا تعلق بھی انہی لوگوں سے تھا) اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ برصغیر میں انگریزوں کی سرپرستی میں ہندوستانی بورژوا (تجار اور صنعت کار) طبقے کا ظہور سب سے پہلے کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسے ساحلی شہروں میں اس لئے ہوا کہ فرنگی سب سے پہلے

انہی شہروں میں آئے اور نئی تہذیب اور نئے اقتصادی نظام کی داغ بیل ڈالی۔

ابتدا میں کلکتہ میں سب سے پہلے صنعتیں انگریزوں نے گارڈن ریچ کے علاقے میں قائم کیں اصل کلکتہ سے دور ایک ساحلی مقام ہے اور جہاں سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں تعمیر اور مرمت کے لئے ڈک یارڈ قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے نیل اور چائے کی کا کی جانب توجہ دی اور اس طرح ہندوستان کی قدیم جاگیردارانہ معیشت کی جگہ نئی بورژوا معیشت بنیادیں وسیع اور پائیدار ہوتی گئیں۔ اس مہم میں ہندو تجارت پیشہ طبقہ جونیئر پارٹنر کے طور پر ہو گیا اور رفتہ رفتہ مضبوط سرمایہ دار طبقہ بن کر ابھرا۔ کلکتہ کو نیا صنعتی شہر بنانے میں اگر انگریز تام اور صنعت کاروں کا ہاتھ ہے۔ تو اسی کے ساتھ راجستھانی مارواڑیوں، بمبئی کے گجراتی بھائیاں سورت، کچھ اور کاٹھیاواڑ کے مسلمان تاجروں کا بھی ہاتھ ہے، جو انگریزوں کی سرپرستی میں بہت مرکنٹائیل بورژوا سے انڈسٹریل بورژوا بن گئے۔ اس مہم میں ثقافتی میدان میں راجہ رام موہن را اور دوار کا ناتھ ٹیگور کی قیادت میں شروع ہونے والے رینے ساں (نشاۃ الثانیہ) کا بھی بڑا ہاتھ ہے ملک سے دور مغلیہ کے جاگیردارانہ نظام کو جڑ سے اٹھا پھینکنے میں ہندو بورژوا طبقے نے بھی بھر کردار ادا کیا ہے۔ کیوں کہ برٹش امپائر کے فراہم کردہ سماج کے بورژوا ڈھانچے کو برقرار رکھنے لئے پرانے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ضروری تھا۔ پرانا اقتصادی نظام ان کے نئے نظام کی ترقی سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1857ء میں جب سارے ہندوستان میں بغاوت لہریں رواں دواں تھیں، اس وقت پورا بنگال اس سے قطعی لاتعلق تھا۔

نئے اقتصادی نظام کے طفیل کلکتہ میں تعلیم یافتہ ہندو متوسط طبقہ پیدا ہوا جو انگریزی پڑھ کر اور سرکاری ملازمتیں اختیار کر کے انگریزوں کا حلیف بن گیا، لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے آگے چل کر یہی ہندو بورژوا اور متوسط طبقہ آزادی کی جدوجہد کے دوران برٹش امپائر کا سب سے مخالف بن گیا، لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔

کلکتے کے قیام کے دوران میں نے اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے شہر کی تمام معرا شاہراہوں اور راستوں کو پیدل چل کر دیکھا، تاکہ یہ گلیاں اور یہ کوچے میرے دل و دماغ میں رچ بس جائیں۔ معلوم نہیں پھر کب کلکتہ آنا ہو اور آنا بھی ہو یا نہیں، کسے معلوم؟ میں نے فیصلہ کیا کہ کم نہیں ان راستوں کو ایک بار پھر نظر بھر کر دیکھ لوں، جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین شب و ر گزارے ہیں۔

میں یہ سوچ کر اینگلو انڈین محلوں خصوصاً فری اسکول اسٹریٹ، ویلسلی سٹریٹ، رپن اسٹریٹ، تالتلہ، کالنگہ، پارک اسٹریٹ، بہو بازار اسٹریٹ ایلیٹ روڈ اور نیو مارکیٹ کی طرف نکل گیا۔ یہ محلے اب برائے نام اینگلو انڈین رہ گئے تھے۔ ان کے نام بھی بدل چکے تھے لیکن میں ان کے پرانے نام سے واقف تھا۔ وسط کلکتہ میں واقع یہ محلے کسی دور میں یورپین باشندوں اور اینگلو انڈین کمیونٹی کے لئے مخصوص تھے اور کرسمس ایوز اور نیو ائیر زڈے کے مواقع پر بڑے پر رونق ہوا کرتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلکتے کے تہوار، خواہ وہ ہندوؤں کا کالی پوجا ہو، درگا پوجا ہو، دیوالی ہو یا کرسمس اور سال نو کی تقریب۔ اس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب ہی حصہ لیتے تھے، خصوصاً عیسائیوں کے بڑے دن اور سال نو کی تقاریب میں۔ یہ انگریزوں کے دور سے ایک ریت چلی آرہی تھی۔ اس کی ایک وجہ دور غلامی میں ہندوستانیوں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کی انگریز پرستی اور ان کی تہذیب و تمدن کی تقلید بھی تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا صرف نصف صدی قبل تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے ارسٹو کریٹ طبقوں میں انگریزوں کی طرح پہناوا اختیار کرنا، ان کی طرح انگریزی بولنا، کھانے پینے کے آداب (ایٹی کیٹ) اور ٹیبل مینرز کو اختیار کرنا، باعث فخر تصور کیا جاتا تھا۔ اس دور کے متمول ہندو اور مسلمان، فیوڈل اور صنعتی عہد کے ارسٹو کریٹ، کرسمس اور نئے سال کی شب کو گرینڈ ہوٹل، گریٹ ایسٹرن ہوٹل، فرپو، کانٹی نینٹل ہوٹل اور دیگر بڑے بڑے ہوٹلوں میں اپنی اپنی گرل فرینڈز یا اینگلو انڈین داشتاؤں کے ساتھ رقص و سرود کی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس دور میں یہی پنج ستارہ ہوٹل تصور کئے جاتے تھے۔ جو غریب یا متوسط طبقہ کے اینگلو انڈین ہوتے تھے وہ فری سکول سٹریٹ میں واقع فائر بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹر میں رقص و موسیقی کی محفل سجاتے تھے اور شراب پی کر اپنی محبوباؤں کو باہوں میں جکڑ کر سڑکوں پر گھومتے اور بوس و کنار میں مگن رہتے تھے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے لئے یہ سارے نظارے لطف و انبساط کا باعث ہوتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے معاشرے میں اس قسم کی آزادی کہاں تھی چنانچہ وہ یہ سب دیکھنے کے لئے رات کے وقت ان اینگلو انڈین محلوں میں منڈلاتے رہتے تھے اور پھر اس موقع پر تمام انگریزی سینماؤں میں مڈ نائٹ شو بھی ہوتا تھا جس کے ٹکٹ کئی کئی ہفتے قبل فروخت ہو جاتے تھے اور ان انگلش سینماؤں میں اس رات بھی انیگلو انڈین جوڑے وہی کچھ کیا کرتے تھے جو وہ سینما گھروں کے باہر کیا کرتے تھے۔

یہ اینگلو انڈین کون تھے؟ ان کا اوریجن کیا ہے؟ یہ لوگ ہندوستان میں کہاں سے آئے؟ یہ جاننے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دو سو سال قبل کی تاریخ کے اوراق کو پلٹنا

کافی ہے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں عہد وکٹوریہ میں ہندوستان میں رہ جانے والے ان انگریزوں کی اولادیں ہیں، جنہیں اتفاق سے یا طبقاتی تفریق کی بنا پر شادی کے لئے فرنگی عورتیں نہیں ملیں اور انہوں نے ہندوستانی عورتوں سے شادی کر لی۔ اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں پہلی ربع صدی تک کلکتہ میں فرنگی عورتوں کی بڑی کمی تھی۔ جو چند فرنگی عورتیں ہندوستان کے تمول کی شہرت سن کر "بر" کی تلاش میں ہندوستان آتیں انہیں امیر کبیر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز فرنگی پہلے ہی اچک لیتے تھے اور غریب فرنگیوں کو ہندوستانی عورتوں سے شادی کئے بنا چارہ نہ رہتا تھا۔ اس طرح ہندوستان میں اینگلو انڈین طبقے کا وجود عمل میں آیا۔

آزادی سے قبل ان کے شب و روز بڑے اطمینان سے گزر رہے تھے کہ فلک کج رفتار نے پلٹا کھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بدل گیا خصوصاً آزادی کے بعد ان کی حالت اور بھی بدتر ہو گئی۔ اس لئے کہ ان کے مربی اور سرپرست ہندوستانیوں کو اقتدار سونپ کر انگلینڈ سدھار گئے اور انہیں دور غلامی میں روزگار کے سلسلے میں جو مراعات حاصل تھیں، وہ حاصل نہ رہیں، آزادی سے قبل اس طبقے کے لئے ریلوے، کلکتہ پولیس، فائر بریگیڈ، انگریزی اخبارات میں نشستیں مخصوص تھیں اور وہ اسی طرح کے محکموں میں چھائے ہوئے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد جوں جوں "انڈین نائزیشن" کا عمل بڑھتا گیا وہ ان ملازمتوں سے محروم ہوتے گئے اور جب معاش کا دروازہ بند ہو گیا تو انہوں نے ہندوستان سے نقل مکانی شروع کر دی اور کوئی انگلینڈ میں جا کر بس گیا تو کوئی آسٹریلیا اور امریکہ میں۔ لیکن ان ممالک میں بھی ان کے جسم کا رنگ رکاوٹ ثابت ہوا۔

کلکتے کے قیام کے دوران اینگلو انڈین کمیونٹی کی حالت دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔

غالب کی تلاش میں

کلکتے میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے باوجود میں نے کبھی غالب کی اس رہائش گاہ کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی، جہاں انہوں نے اپنے مقدمے کے دوران ایک سال، نو مہینے اور آٹھ دن قیام کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ یوں بھی گھر کی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال اس سے دی جاسکتی ہے کہ میں نے کلکتے میں رہائش کے دوران کبھی روبندر ناتھ ٹیگور کی آبائی رہائش گاہ "جوڑاساں کو" کو نہیں دیکھا، جو اس وقت کلکتے کی سب سے بڑی ثقافتی زیارت گاہ بن چکی ہے اور اس کا شمار کلکتے کے قابل دید مقامات میں ہونے لگا ہے۔ جو بھی سیاح کلکتے کی سیاحت کے لئے آتا ہے، وہ روبندر ناتھ ٹیگور کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے وہاں ضرور جاتا ہے۔ اسی لئے کلکتے کی گائیڈ بک میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ میں نے کلکتے کی طویل رہائش کے دوران کبھی غالب کی رہائش گاہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن میں جب اکیس سال کے بعد کلکتہ گیا تو ہوڑہ اسٹیشن میں ٹرین سے اترتے ہی تہیہ کر لیا کہ غالب کی رہائش گاہ کا ضرور کھوج لگاؤں گا۔ میں نے اس بارے میں پہلے ہی بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم تھا کہ غالب کی رہائش گاہ کس طرح تلاش کی جاسکتی ہے۔ میں کلکتہ پہنچنے کے بعد فرصت ملتے ہی اس مہم پر روانہ ہو گیا۔ سوال یہ تھا کہ غالب کی رہائش گاہ کا کیسے سراغ لگایا جائے۔ کلکتہ کارپوریشن یا مغربی بنگال اردو اکیڈیمی نے کبھی اس جانب توجہ نہیں دی تھی اور پھر غالب کو کلکتہ آئے ہوئے ایک سو اٹھاون سال بیت چکے تھے اور اس دور کی کوئی شے یادگار کے طور پر محفوظ نہیں تھی۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ غالب، دسمبر 1826ء میں اپنے پینشن کے مقدمے کے سلسلے میں فیروز پور جھرکا سے دلی گئے بغیر سفر کلکتہ پر روانہ ہو گئے تھے۔ دلی نہ جانے کی وجہ قرض خواہوں کا خوف تھا، جنہوں نے قرض کی ادائیگی کے لئے تقاضے کر کر کے غالب کو پریشان کر دیا تھا۔ غالب کا خیال

تھا کہ وہ اگر سر چارلس مٹکاف کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور اپنا وظیفہ دوبارہ جاری کرنے کی درخواست کریں گے تو ان کا وظیفہ ضرور جاری ہو جائے گا۔ اس دوران نواب احمد بخش خاں کی جانب سے غالب کو سر چارلس مٹکاف سے نہ ملانے پر انہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی اور وہ دو تین ملازموں کو ساتھ لے کر باندہ سے خشکی کے راستے سے گھوڑے پر کلکتے روانہ ہو گئے تھے۔ غالب 21 فروری 1828ء کو کلکتہ پہنچے اور انہیں اسی روز شملہ بازار (متصل چیت پور بازار) میں گرد تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کے لئے مکان مل گیا، لیکن یہ شملہ بازار کہاں واقع تھا؟ اور پھر گرد تالاب کہاں پر تھا؟ اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ البتہ چیت پور روڈ کے نام سے ایک بڑی اور لمبی سڑک ضرور موجود تھی۔ لیکن اب اس کا نام بھی بدل گیا تھا۔

ڈیڑھ سو سال کے دوران کلکتے کی کایا پلٹ چکی تھی۔ کلکتے نے صنعتی عہد میں قدم رکھنے کے بعد اپنا روپ اس قدر بدل لیا تھا کہ اب ماضی کی بہت کم نشانیاں باقی رہ گئی تھیں، حتیٰ کہ پرانے محلے کا نام تک باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے عمر کے چالیس سال کلکتے میں گزارے تھے لیکن کبھی شملہ بازار کا نام نہیں سنا تھا۔ سن بلوغت سے لے کر جوانی تک میں نے قدیم کلکتہ کے جن علاقوں اور بازاروں کا نام سنا تھا۔ ان میں سوا بازار، شام بازار، باگ بازار، مرزا پور، بڑا بازار، بہو بازار، دھرم تلہ، انٹالی، بٹ تلہ، ملنگا، ٹھنٹھنیا بازار، سیالدہ اور بڑ تلہ وغیرہ کے نام تو شامل تھے، لیکن شملہ بازار نہیں۔

میں نے سوچا کہ شملہ بازار کا سراغ لگانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ میں برصغیر جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری نیشنل لائبریری جاؤں اور قدیم کلکتے کے بارے میں کتابیں اور نقشہ جات تلاش کروں۔ ترک وطن سے قبل میں نیشنل لائبریری کا باقاعدہ ممبر تھا اور بڑی باقاعدگی سے وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں میں نے قدیم کلکتہ کے بارے میں انگریزی، اردو اور بنگلہ میں بیشمار کتابیں دیکھی اور پڑھی تھیں۔ اس لئے شملہ بازار کا اگر کہیں سراغ مل سکتا تھا تو وہ نیشنل لائبریری ہی تھی، چنانچہ میں نے اپنے مختصر سفر کلکتہ کے دوران ایک دن اس کام کے لئے وقف کر دیا اور صبح سویرے نیشنل لائبریری پہنچ گیا۔ اسسٹنٹ لائبریرین مقیت الحسن نیشنل لائبریری کے بہار سیکشن کے نگران تھے جو میرے اچھے دوست تھے۔ موجودہ بنگلہ دیش کے ضلع بوگرا کے مشہور زمیندار بہار نے اپنی اردو، فارسی اور عربی کی نادر و نایاب کتابیں نیشنل لائبریری کو دے دی تھیں۔ اس لئے اردو، فارسی اور عربی کتابوں کے گوشے کو "بہار سیکشن" کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ مقیت الحسن کے توسط سے میں نے "ایک یوم کی ممبر شپ" حاصل کی اور کیٹلاگ کی مدد سے کلکتہ سے

تمام اہم کتابوں اور اس کے مصنفوں کے نام اور کتب نمبر نوٹ کر لئے اور اپنا پورا ایک دن ان کتابوں کے درمیان گزارا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قدیم کلکتہ کے بارے میں ایک بہت ہی پرانی کتاب میں ایک ایسا نقشہ مل گیا جس میں شملہ بازار کا جائے وقوع دکھایا گیا تھا اور جس سے اندازہ ہوا کہ غالب آج سے ڈیڑھ سو سال قبل جس جگہ ایک سال نو مہینے اور آٹھ روز مقیم تھے، وہ کہاں پر واقع ہے۔

کارنوالس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولہ (تلہ) اسٹریٹ کے نکڑ پر ایک گرجا گھر واقع ہے۔ جس کا نام "کرائسٹ چرچ" ہے۔ اس گرجے کی پشت پر کسی زمانے میں ایک بازار ہوا کرتا تھا جو مانک تلہ اسٹریٹ سے شروع ہو کر شمال میں بیڈن اسٹریٹ (موجودہ آزاد ہند باغ) کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسی علاقے کا کسی زمانے میں شملہ بازار نام تھا۔ واضح رہے کہ لفظ شملہ کا بنگلہ زبان میں اصل تلفظ "شی مولا" ہے۔ شی مول دراصل ایک خاص قسم کے کپاس کا نام ہے جو بہت ہی نرم اور گداز ہوتا ہے۔ اسی سے شی مولا بازار نام پڑا یعنی شی مولا کپاس کی منڈی۔ یہ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب اس کے کچھ حصے میں عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں اور باقی میں بیتھون رو (Bethone row) واقع ہے۔ مرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اسی جگہ تھا۔ جہاں اس وقت بیتھون رو کا مکان نمبر 133 واقع ہے اور اس کے صحن کا کنواں 1935ء میں پاٹا گیا تھا۔

میں نے شملہ بازار کا سراغ لگاتے ہی دوسرے روز پیدل کالج اسٹریٹ اور کارنوالس اسٹریٹ ہوتا ہوا آزاد ہند باغ روانہ ہو گیا، تاکہ میں غالب کے مکان اور اس محلے کو اپنی نظروں سے دیکھ سکوں، کالج اسٹریٹ ہیرسن روڈ اور ٹھنٹھینا کا سارا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ اکیس سال کے بعد میں پھر ان مقامات کی سیر کر رہا تھا۔ لیکن مجھے نہ گرد تالاب ملا اور نہ شملہ بازار ہی۔ قدیم کلکتے میں کسی زمانے میں بہت سے تالاب ہوا کرتے تھے۔ لیکن مچھروں کی یورش اور ملیریا کے مرض کے عام ہو جانے کے باعث بلدیہ عظمیٰ کلکتہ نے بہت سے تالابوں کو بند کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان میں گرد تالاب بھی شامل ہو۔ جس کے ذریعے مرزا علی سوداگر کی اس حویلی کی نشان دہی ہوتی تھی۔ مشہور مصنف حمید احمد خاں کا خیال ہے کہ موجودہ کالج اسکوائر میں گول تالاب کے نام سے جو تالاب مشہور ہے وہی غالب کے زمانہ قیام کا گرد تالاب ہے میرے خیال میں ان کا قیاس درست نہیں ہے۔ شملہ بازار، کالج اسکوائر کے تالاب سے بہت دور، کارنوالس اسکوائر (آزاد ہند باغ) کے قریب واقع تھا چنانچہ میں بلا کشش و پنج سیدھے کرائسٹ چرچ کے قریب بیتھون رو کے مکان نمبر 133 کے سامنے پہنچ گیا اور گرد و نواح

کا جائزہ لینے لگا ڈیڑھ سو سال کے دوران دنیا بدل چکی تھی۔ اب نہ شملہ بازار تھا اور نہ چیت پور ہا
البتہ اس علاقے سے بہت دور چیت پور روڈ کے نام سے ایک مشہور شاہراہ موجود تھی۔ جس پر سنہ
پٹی کی مسجد اور حاجی سیٹھ موسیٰ صالح جی کا مسافر خانہ واقع تھا۔

میں غالب کی قیام گاہ کے سامنے کھڑا آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اس دور کے کلکتے کے بار
میں سوچ رہا تھا۔ جب غالب یہاں مقیم تھے اور ان کی آمد کی اطلاع شہر کے تمام باذوق ادبی حلقو
کو ہو چکی تھی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ غالب کا سفر کلکتہ ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا۔ م
نے ان کو ذہنی اور فکری طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ غالب کلکتہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ زندگ
بھر اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ انہوں نے مولوی سراج الدین احمد کو لکھا کہ "اگر میں عنوان شباب م
وہاں (کلکتہ) گیا ہوتا اور شادی اور خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو مدت الع
کے لئے کلکتہ ہی میں رہ جاتا" غالب نے کلکتے کے قیام کے دوران نئی مغربی تہذیب سے اپنے متا
ہونے کا برملا ذکر کیا ہے۔ کلکتہ، غالب کا آبائی یا اختیاری وطن نہ تھا (جیسا کہ آگرہ اور دلی کو کہا جاسک
ہے) وہ کلکتے میں اپنے پینشن کے لئے آئے تھے اور ان کے قیام کی مدت ایک سال نو مہینے اور ا
دن پر محیط تھی، لیکن پونے دو سال کے کلکتے کے قیام نے غالب کو اس شہر کا اس طرح گرویدہ بنا د
کہ وہ اپنے خطوں اور اشعار میں اس کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ بادی النظر میں انہیں
آگرہ اور دلی کے مقابلے میں کلکتے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ
دلی سے کلکتے تک کے سفر کے دوران غالب شمالی ہند کے اکثر بڑے شہروں سے گزرے۔ وہاں ان کا
پڑاؤ بھی ہوا۔ انہوں نے لکھنو، الہ آباد، بنارس اور پٹنے کو گھوم پھر کر دیکھا بھی، لیکن یہ سارے شہ
غالب کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ انہوں نے اپنی مثنوی میں بنارس کی تعریف ضرور کی، لیکن یہ تعریف
صرف صبح بنارس کی تھی۔ اس کے برعکس شہر کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ اسے کبھی فراموش نہ
کر سکے۔

غالب کے مشہور محقق اور مصنف حمید احمد خان نے غالب کے سفر کلکتہ کی تفصیلات سے ج
نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بہت حد تک خام ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غالب کو کلکتہ اس لئے پسند آیا کہ اس
شہر کا پانی، اس کی ہوا، اس کا سبزہ، اس کی سڑکیں اور شہر کی خالص جغرافیائی کیفیتیں انہیں قابل قدر
معلوم ہوئیں۔ انہوں نے یہ نتیجہ غالب کے بعض اشعار اور خطوط میں کلکتے کے موسم اور آب و ہوا کے
تذکرے سے اخذ کیا تھا۔ ان کو انیسویں صدی کے ربع اول میں ہندوستان کے اس نئے اور اہم شہ

میں رونما ہونے والی سماجی، تہذیبی اور اقتصادی تبدیلیاں، جدید مشینی عہد کی ترقیاں اور برکتیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا نیا بورژوا طبقہ نظر نہیں آیا۔ انہیں وہ نیا اقتصادی نظام اور نیا معاشی ڈھانچہ بھی نظر نہیں آیا جس نے صدیوں پرانے اور فرسودہ جاگیردارانہ معاشی رشتے پر اثرانداز ہو کر اسے بدلنا شروع کر دیا تھا۔

غالب جب کلکتہ آئے تھے اس وقت کا کلکتہ کیسا تھا؟ انہوں نے وہاں کیا دیکھا، جو کلکتے کے عشق میں اس طرح مبتلا ہو گئے؟ یہ ساری باتیں غالب کے محققین کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گی، لیکن غالب کی رہائش گاہ کی تلاش کے دوران ذاتی طور پر مجھے بھی اس عہد کے کلکتے کے بارے میں جاننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی اور میں چشم تصور میں غالب کے زمانے کے کلکتے میں پہنچ گیا۔ غالب نے جس وقت 1828ء میں کلکتے میں قدم رکھا تھا وہ راجہ رام موہن رائے کا عہد تھا (یعنی بنگال میں رینیے ساں۔ نشاۃ الثانیہ کا عہد) راجہ رام موہن رائے اور دوار کا ناتھ ٹیگور کی معیت میں برہمو سماج کے قیام کے ساتھ ہی نشاۃ الثانیہ کے رجحان نے پروان چڑھنا شروع کر دیا تھا اور یہ سب کچھ برطانوی تسلط کے باعث اور جدید ترین مغربی افکار کے نتیجے میں رونما ہوا تھا۔ برصغیر کے مشرقی حصے میں انگریزوں کے غلبے، انگریزی زبان کے رواج اور نئے پیداواری رشتے کے باعث کلکتے میں ایک نئے کلچر نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ جنگ پلاسی (1757) میں سراج الدولہ کی فیصلہ کن شکست کے بعد بنگال پر برطانیہ کا پرچم مستقل طور پر لہرانے لگا تھا۔ بنگال کے پڑھے لکھے ہندو اوپری طبقے میں سیاسی اور قومی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ اپنی قدیم تہذیب اور روایات کو نیا رنگ و روپ دینے کی خواہش اور مغربی تعلیم کے نتیجے میں روشن خیالی کے رجحان نے پورے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے برعکس غالب ہندوستان کے جس خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس علاقے کی تہذیب میں ان کی جڑیں پیوستہ تھیں، جہاں جاگیردارانہ مسلم تہذیب اپنے وجود کی بقا کے لئے نئی تہذیب سے برسرپیکار تھی، یعنی وسطی اور شمال مغربی ہندوستان۔ (دلی، لکھنو اور آگرہ) وہاں اس وقت تک نئے دور کی ہلکی سی کرن بھی نہیں پہنچی تھی۔ اس خطے کے مسلمانوں نے سیاسی شکست کھانے کے بعد مغربی اثرات کے سیلاب کو روکنے کے لئے مدافعتی حربے کے طور پر مغربی تعلیم و تہذیب کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ جب بنگال، مہاراشٹر اور بمبئی میں نئے دور کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس وقت ان علاقوں میں قدیم تہذیب دم توڑ رہی تھی۔

مغرب کے ساتھ رابطے نے بنگال کے اہل دانش اور اہل ثروت طبقے کو اس قابل بنا دیا تھا کہ

وہ یورپی کلچر، نیز مغرب کے فلسفیانہ اور جمالیاتی تصورات کو اختیار کر کے اپنی تہذیب و ثقافت ا
ادب کو پروان چڑھائیں۔ بنگال جب مغربی تہذیب کو اختیار کر کے اپنے شعر و ادب کو ترقی دے ر
تھا۔ اس وقت دلی اور لکھنو کا زنگ آلود جاگیر دار معاشرہ روایتی شعر و ادب تخلیق کرنے میں مگ
تھا۔ اس تناظر میں غالب نے جب کلکتہ کا سفر کیا تو نئی مغربی تہذیب اور اس کی نیر نگینیوں کو دیک
کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس دور کا کلکتہ آج کے دور کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ
سہی، لیکن دلی اور لکھنو سے یقیناً ترقی یافتہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب راجہ رام موہن رائے اپنا مشہو
صحیفہ "جام جہاں نما" شائع کر رہے تھے۔ جس کے ہر شمارے میں بیک وقت بنگلہ فارسی، اردو او
انگریزی کے صفحات موجود ہوتے تھے۔ اس دور میں بنگالی اور انگریز نہ صرف اردو اور فارسی سے
واقف تھے، بلکہ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ غالب کو کلکتہ کے پونے دو سالہ قیام کے
دوران اپنے ہم زبانوں کے علاوہ یقیناً اردو اور فارسی دان بنگالیوں اور انگریزوں سے ملنے اور ان سے
تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملا ہو گا، اس لئے کہ اس دور کے کئی بنگالی، اردو میں باقاعدگی سے شعر کہہ
رہے تھے۔ یہ صرف گمان نہیں۔ اس دور کے کلکتے کی سماجی تاریخ کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتا
ہے۔

غالب کے دور کا کلکتہ

غالب کی کلکتہ آمد سے 48 سال قبل، یعنی 1780ء میں کلکتہ میں اور اس سے قبل 1778ء میں ہگلی میں پریس کا قیام عمل میں آچکا تھا اور انگریزی، بنگلہ اور اردو میں نئے اخبارات و جرائد شائع ہو رہے تھے، مثلاً روزنامہ "بنگال ہرکارہ" "کرونکل" "جون بل" "کلکتہ گزٹ" سہ روزہ "گورنمنٹ گزٹ" "انڈیا گزٹ" "بنگال کرونکل" ہفت روزہ "بنگال ہیرلڈ" "لٹریری گزٹ"۔ "اورنٹیل آبزرور" "سماچار درپن (بنگلہ) اور "جام جہان نما" (فارسی) مدیر راجہ رام موہن رائے (مجریہ 1822ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ غالب کی آمد سے 48 سال قبل یعنی 178()ء میں کلکتہ میں سر چارلس ولکنس نے عربی اور فارسی کا ٹائپ ایجاد کر لیا تھا۔ سر چارلس ولکنس، سر ولیم جونز اور پادری ولیم کیری (بانی سری رام پور بپٹسٹ مشن) کے قریبی رفیق کار تھے۔ انھوں نے اردو ٹائپ کا اختراع ولیم کیری کے مطبع سے وابستہ ہونے کے بعد انجیل مقدس کی طباعت کی غرض سے کیا تھا۔ اس مطبع سے 1781ء میں اردو کی پہلی کتاب "انشائے ہرکرن" نسخ ٹائپ میں شائع ہوئی تھی جو فرانسیس بالفور کی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اس کے بعد 1788ء میں اردو میں "لیلیٰ مجنوں" شائع ہوئی جس کا مقدمہ سر ولیم جونز نے لکھا تھا۔ غالب کی کلکتہ آمد سے قبل کلکتے سے اردو اور فارسی میں جو اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ ان میں "مراۃ الاخبار" (فارسی) "شمس الاخبار" (فارسی اور اردو) "آئینہ سکندر" (فارسی) اور "سلطان الاخبار" (فارسی) شامل ہیں۔ یہ سارے اخبارات ٹائپ میں چھپتے تھے۔ غالب کے کلکتہ سے واپسی کے آٹھ سال بعد یعنی 1836ء میں لتھو پرنٹنگ ایجاد ہوئی اور شمالی ہند میں سب سے پہلا اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" کے نام سے لتھو میں شائع ہوا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غالب کے کلکتہ آنے سے قبل وہاں سے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" (1801) "آرائش محفل" (1802) نوطرز مرصع 1798ء "بتیال پچیسی" 1802ء پند

نامہ سعدی 1802ء "سنگھاسن بتیسی" 1801ء "طوطا کہانی" 1803ء "آرائش محفل" 1804 "کلیات میر" 1810ء "کلیات تپش" 1811ء وغیرہ لاتعداد اردو کتابیں شائع ہو چکی تھیں اس سے اس دور کے کلکتے کی لسانی اور ثقافتی حیثیت اور ادبی مرکزیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ ہمارا المیہ ہے کہ اردو میں آج تک برصغیر ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی تاریخ لکھی نہیں گئی۔ ورنہ ہمیں معلوم ہوتا کہ ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کلکتے میں کس طرح سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے اور ہمارے طرز فکر اور طرز زندگی میں کس طرح رفتہ رفتہ تبدیلیاں رو نما ہوئیں، خصوصاً انقلاب فرانس نے اس دور کے بنگالی دانش ور طبقے کو کس طرح متاثر کیا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کلکتہ میں اخبارات و جرائد کے اجرا کے ساتھ ہی مغرب میں رونما ہونے والے اہم اور تازہ ترین سیاسی اور تاریخی واقعات کی خبریں کلکتہ کے انگریزی، بنگلہ، اردو اور فارسی اخبارات میں شائع ہونے لگی تھیں اور بعض انگریزی اخبارات میں نصف حصہ صرف انقلاب فرانس کی تفصیلات سے بھرا رہتا تھا۔ اس دور کے ہندوستان کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ یہ اخبارات بہت غور اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتا اور اس سے متاثر ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے اپنے اخبار "جام جہان نما" میں انقلاب فرانس کا پرشکوہ الفاظ میں خیر مقدم کیا تھا، خصوصاً اس دور کے فرانس کے مشہور نعرے "آزادی، اخوت اور مساوات" کا۔ انہوں نے اپنے اس اخبار کے ذریعے ہندوستانی عوام میں فرانس کے نئے افکار کو قبول کرنے کی ترغیب دی تھی۔

اس دور کے کلکتے میں مغربی دانش وروں، مثل روسو، والیٹر، گبن، ہیوم، رینال اور ہیرس کی تصانیف کی کس قدر مانگ تھی۔ اس کا اندازہ اس دور کے مشہور اخبار "کلکتہ گزٹ" کے اشتہارات سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں مغرب سے درآمد شدہ مختلف اشیائے تعیش کے ساتھ نئی کتابوں، مثلاً رچل کے سفر نامے، بریسبن کی "اناٹومی آف پینٹنگ" بریخ کی "ہسٹری آف دی رائل سوسائٹی" ہیوم کی "ہسٹری آف انگلینڈ" ہیرس کی "لائف آف کروموئل" رینال کی فال آف رومن امپائر" کے اشتہارات بھی باقاعدگی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ میں نے یہ ساری تفصیلات اس لئے بیان کی ہیں کہ غالب کے دور کے کلکتے کی مجموعی انٹلیکچوئل فضا کا اندازہ ہو جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر سے کلکتہ کا دانش ور طبقہ روسو، والٹیر اور دوسرے انقلابی دانش وروں کے افکار سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اگر غالب کلکتہ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے تو وہ یقیناً دور مغلیہ کے آخری دور کے غالب سے مختلف ہوتے۔

غالب کی کلکتہ آمد سے بہت پہلے سے نئے دور کی آمد کا جرس سنائی دے رہا تھا، چنانچہ اس زمانے سے ہی بنگال میں ذہنی انقلاب رونما ہونا شروع ہو چکا تھا۔ جسے راجہ رام موہن رائے کے برہمو سماج اور ڈیروزیو اور رچرڈسن کے پیرو کاروں نے تکمیل تک پہنچایا۔ غالب نے جس وقت کلکتے کا سفر کیا تھا۔ اس وقت اگرچہ ہندوستان میں صنعت سازی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن غیر ممالک سے چھوٹے پیمانے پر کل کارخانے آنے شروع ہو چکے تھے۔ یہ مشینیں آج کے دور کے مقابلے میں بالکل ابتدائی نوعیت کی تھیں اور مختلف اشیا ہاتھ کے بجائے مشینوں کے ذریعے بننا شروع ہو گئی تھیں۔ یعنی مینو فیکچرنگ کا عہد شروع ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ اس دور کے اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہار سے بھی ہوتا ہے مثلاً یہ کہ 11 مارچ 1826ء کو ایگریکلچر سوسائٹی کے ایک جلسے میں ڈیوڈ اسکاٹ نے چاول صاف کرنے کی ایک ایسی مشین پیش کی، جس کے ذریعے صرف دو آدمی یومیہ دس من دھان صاف کر سکتے تھے، جبکہ اس سے قبل تک دس آدمی مل کر روز نصف من سے زیادہ دھان صاف نہیں کر پاتے تھے۔ 8 اگست 1829ء کو بنگلہ اخبار "سماچار درپن" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ دریا کے کنارے گندم پسنے کی ایک ایسی مشین نصب ہوئی ہے جس کے ذریعے دھان سے چاول الگ کیا جا سکتا ہے۔ سرسوں سے تیل نکالا جا سکتا ہے اور گندم کو پس کر آٹا، میدا اور سوجی تیار کی جا سکتی ہے۔ یہ سارا کام صرف تیس ہارس پاور کی بھاپ کی مشین سے انجام دیا جاتا ہے۔ ان عجیب و غریب مشینوں کو دیکھنے کے لئے لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں۔

ایک اور بنگلہ اخبار "سنگبار پر بھاکر" میں یہ مژدہ سنایا گیا کہ بہو بازار کے مشہور تاجر راجندر دت نے امریکہ سے ایک ایسی عجیب و غریب مشین در آمد کی ہے جس کے ذریعہ بہت کم وقت میں قمیض، چپکن، ازار اور پتلون وغیرہ کے علاوہ تھیلے سئے جا سکتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان نت نئی مشینوں کو جن لوگوں نے پہلی بار ہندوستان در آمد کیا وہ معاشرے کے متمول لوگ تھے۔ لیکن ان مشینوں پر جن لوگوں کو کام کرنے کے لئے متعین کیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو آگے چل کر صنعتی مزدور کے نام سے موسوم کئے گئے۔ یہ وہی متمول لوگ تھے جو آگے چل کر ہندوستان میں صنعت کاری کے پیش رو ثابت ہوئے۔

اس دور کے اخبارات کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غالب نے جس دور میں کلکتے کا سفر کیا تھا۔ اس وقت وہاں صنعت کاری اپنی ابتدائی شکل میں شروع ہو چکی تھی اور انگریزوں نے گارڈن ریچ میں اپنے جنگی اور تجارتی جہازوں کی مرمت کے لئے بہت بڑا ورکشاپ قائم کر لیا تھا۔

غالب کے دور میں کلکتہ ایک نیا اور ترقی پذیر شہر تھا۔ یہاں کے باشندے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے عوام کے مقابلے میں زیادہ خوشحال اور خوش پوشاک تھے۔ اس لئے کہ یہ صنعت و حرفت کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ اس دور کے اخبارات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت کلکتے میں نہایت تیزی کے ساتھ سمٹ کر اکٹھی ہو رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ آزادانہ تجارت تھی، خصوصاً انگریزوں کے تجارت کے پیشے میں داخل ہونے کے بعد کلکتہ میں کوڑیوں کا بطور سکہ استعمال بند ہو چکا تھا۔ جو نئے دور کی آمد اور خوش حالی کی پہچان ہے۔ اس کے ساتھ مزدوروں کی اجرت اور ملازمت پیشہ لوگوں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس طرح عوام کی مالی حالت بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ تجارت میں بھی تیز رفتار ترقی جاری تھی۔ غالب جب کلکتہ آئے اس وقت انہوں نے ہندوستان کے دیگر علاقوں کی بہ نسبت یہاں ایک خوشحال معاشرہ دیکھا۔ غالب کے کلکتہ سے متاثر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔

تجارت اور صنعت کے فروغ کے ساتھ ساتھ دیگر شعبوں میں ترقی بھی لازمی تھی، چنانچہ جوں جوں شہر کلکتہ پھیلتا گیا۔ اس کی سڑکیں بھی کشادہ ہوتی گئیں۔ اس دوران کلکتہ میں کئی اہم اور پختہ سڑکیں تعمیر ہوئیں، جن میں 1820ء میں چاندنی چوک سے باغ بازار تک کا راستہ اور دھرم تلہ سے بہو بازار تک کا راستہ شامل ہے۔ 1822ء میں دریائے ہگلی کے کنارے خضر پور ڈوک سے گارڈن ریچ تک کی سڑک تعمیر ہوئی۔ اسی کے ساتھ کئی بینک اور بیمہ کمپنیاں بھی وجود میں آئیں۔ ان میں سری رام پور بینک (1819) کمرشل بینک (1819) کلکتہ بینک (1824) کلکتہ ایکسچینج بینک (1829) اور سنچیے بھنڈار (1828) شامل ہیں۔

غالب کے زمانہ قیام میں کلکتہ کی بندرگاہ تعمیر ہو چکی تھی۔ دریائے ہگلی کے کنارے بھاپ سے چلنے والے بڑے بڑے تجارتی جہاز لنگر انداز رہتے تھے۔ نئے طرز کے دخانی جہاز غالب کے لئے یقیناً بالکل نئے ہوں گے۔ اس دور کے اخبارات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چین، فرانس، پرتگال، امریکہ اور انگلستان جانے والے مسافر بردار جہازوں کے علاوہ متعدد تجارتی جہاز کلکتہ کی بندرگاہ پر ہمیشہ لنگر انداز رہتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ بندرگاہ اس وقت تک مصروف ترین بندرگاہ بن چکی تھی۔ غالب کی آمد سے تین سال قبل 1825ء تک دھرم تلہ اور دیگر علاقوں میں گیس لائٹ کا ابتدائی سطح پر استعمال شروع ہو چکا تھا۔

غالب نے کلکتہ کے جن علاقوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چیت پور، شملہ بازار، انٹالی، لال دگھی

اور برجو تالاب شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا ان علاقوں سے گزر ہوتا تھا۔ غالب کے عہد میں نواب صولت جنگ (ولد نواب محمد رضا خان) چیت پور کے نواب تھے۔ غالب نے انٹالی کا اپنے کئی فارسی خطوط میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے انٹالی کی درگاہ شریف مخدومی محرومی میں اپنے فاتحہ پڑھنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ غالب نے کلکتہ کے جس برجو تالاب کا ذکر کیا ہے۔ وہ آج بھی موجود ہے۔ یہ تالاب موجودہ کلکتہ کلب اور سینٹ پال کیتھیڈرل چرچ کے درمیان واقع ہے۔ غالب نے اپنے خط میں "لعل ڈگی" کا ذکر کیا ہے جو دراصل "لال دگھی" ہے۔ یہ ڈلہوزی اسکوائر کا وہی تالاب ہے جس کے سامنے رائٹرز بلڈ نگ قائم ہے اور جس کا موجودہ نام رہنوئے بادل ڈنیش باغ ہے۔ یہ باغ اب تقریباً تباہ ہو چکا ہے۔ اس کے بڑے حصے پر بس ٹرمینس اور ٹیلی فون بھون قائم ہے، لیکن انگریزوں کے دور میں اور حصول آزادی کے بعد بہت عرصے تک یہ علاقہ سیر و تفریح کا بہترین مقام تصور کیا جاتا تھا۔ غالب کے دور میں بھی یہ علاقہ بہت خوب صورت تھا۔ اس لئے کہ اس علاقے میں زیادہ تر انگریز آباد تھے۔ غالب کو بھی رائٹرز بلڈ نگ (اس دور کے سکریٹریٹ) میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس باغ سے گزرنا پڑتا تھا۔

غالب جب کلکتہ پہنچے اس وقت تک فورٹ ولیم کالج، ایشیاٹک سوسائٹی، مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ احتشام حسین اور حمید احمد خان نے غالب کے حوالے سے کلکتے کی عالیشان عمارتوں اور کشادہ شاہراہوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جنہیں دیکھ کر غالب بہت متاثر ہوئے۔ کلکتے کی عمارتیں، دہلی، لکھنو اور دیگر شہروں کی عمارتوں سے قطعی مختلف طرز کی تھیں، سوال یہ ہے کہ کلکتے کی وہ کون کون سی عمارتیں تھیں جو کلکتے میں غالب کے زمانہ قیام تک تعمیر ہو چکی تھیں اور جس سے غالب متاثر ہوئے؟ کلکتے کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اس دور کے کلکتے کی جو عظیم الشان عمارتیں دیکھی ہیں ان میں گورنمنٹ ہاؤس (1796) بنگال کلب (1827) مدرسہ عالیہ (81_1780) اکٹارلونی منومینٹ (1828) ٹاؤن ہال (1814) رائٹرز بلڈ نگ (1821) بلوے ڈیا بلڈ نگ، سینٹ جارج چرچ (1887) اور سنسکرت کالج (1824) وغیرہ شامل ہیں۔ غالب نے اپنے فارسی خطوط میں گول تالاب کا ذکر کیا ہے۔ اس تالاب کے مشرقی کنارے پر سنسکرت کالج 1824ء میں قائم ہوا۔ غالب نے یہاں سے گزرتے ہوئے یقیناً اس عظیم الشان عمارت کو دیکھا ہو گا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں غالب آم کے بڑے شوقین تھے۔ احتشام حسین خیال ہے کہ غالب کلکتہ

کے قیام کے دوران آم سے متعارف ہوئے۔ احتشام حسین کا یہ خیال بحث طلب ہے۔اس لئے کہ آم ہندوستان گیر پھل ہے۔ اس لئے احتشام حسین کا خیال کہاں تک درست ہے۔ یہ تحقیق طلب ہے، البتہ یہ درست ہے کہ بنگال کے آم، خصوصاً مرشد آباد اور مالدہ کے آم بہت مشہور ہیں۔ احتشام حسین نے لکھا ہے کہ آم سے مرزا کا تعارف غالباً کلکتہ میں ہوا۔ جہاں وہ تقریباً دو سال قیام پذیر رہے اور مرشد آباد کے آم ان کے کھانے میں آئے۔

غالب کے قیام کلکتہ کے وقت کلکتے میں کوئی بڑی اور قابل ذکر مسجد نہیں تھی۔ نہ ناخدا مسجد جیسی عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی تھی اور نہ دھرم تلہ کی تاریخی ٹیپو سلطان مسجد۔ البتہ زکریا اسٹریٹ کے علاقہ میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو فوج داری بالا خانے والی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ جس پر بعد میں مسجد ناخدا تعمیر ہوئی۔

غالب جس زمانے میں کلکتے میں تشریف فرما تھے۔ راجہ رام موہن رائے بھی کلکتے آچکے تھے اور انہوں نے 133 نمبر اپر سرکلر روڈ پر اپنی عظیم الشان عمارت تعمیر کروائی تھی۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ غالب کی راجہ رام موہن رائے سے کبھی ملاقات ہوئی یا نہیں، البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان کے عہد میں ان کا مشہور اخبار "جام جہاں نما" (جو اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہوتا تھا) شائع ہو رہا تھا۔ راجہ رام موہن رائے اس دور کے کلکتے کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ اس لئے ان کا غالب سے ملاقات نہ ہونا حیرت کی بات ہے، لیکن ملاقات نہ ہونے کی ایک وجہ راجہ رام موہن رائے کا مرزا افضل بیگ سے رابطہ ہو سکتا ہے۔ مرزا افضل بیگ شاہ دہلی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے اور ان کا غالب کے مخالفین میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اس زمانے میں راجہ رام موہن رائے کو شاہ دہلی کا سفیر بنا کر انگلستان بھیجنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مرزا افضل بیگ، خواجہ حاجی کے برادر نسبتی تھے اور جائیداد کے سلسلے میں دائر شدہ مقدمے میں غالب ان کے مخالف تھے۔ البتہ غالب نے ایک خط میں راجہ رام موہن رائے کا ذکر کیا ہے۔

کلکتہ کے قیام کے دوران غالب کا زیادہ تر ملنا جلنا ایرانیوں سے رہا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ خود بھی ایرانی نژاد تھے اور فارسی دان ہونے کے باعث ان سے خود کو زیادہ قریب محسوس کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ میں ایرانیوں کا بڑا شہرہ تھا اور زیادہ تر ہوٹل اور قیام گاہیں انہی کی تھیں۔ فوج داری بالا خانہ، آرمینین اسٹریٹ اور سند ریا پٹی میں بلند و بالا عمارتیں قائم ہو چکی تھیں۔

کلکتہ میں غالب کے ساتھ جو ادبی ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کا براہ راست تعلق مدرسہ عالیہ کے سالانہ

مشاعرے سے تھا۔ دوسرا ہنگامہ قاطع برہان کے سلسلے میں ہوا۔ اس کا اگرچہ کلکتہ سے براہ راست تعلق نہیں تھا، لیکن اس میں بنگال کے اہل قلم نے سرگرم حصہ لیا تھا۔ مدرسہ عالیہ میں ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ غالب جس وقت کلکتہ تشریف لائے اس وقت بھی یہ روایت جاری رہی۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں اردو کے علاوہ فارسی کے شعرا بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ غالب سے متنازعہ کس تاریخ کے مشاعرے میں ہوا۔ البتہ اتنا معلوم ہوا کہ ان کی آمد کے دو تین ماہ کے اندر یہ ہنگامہ برپا ہوا اور انہوں نے اس کے رد عمل میں مثنوی "باد مخالف" لکھا۔ جیسا کہ اس دور کا دستور تھا۔ بعض شرکائے مشاعرے نے غالب پر بعض الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں اعتراض کیا۔

غالب سے اس معرکے میں اس دور کے جن شعرائے کرام نے حصہ لیا ان میں قتیل کے شاگرد مولوی احمد علی گوپاموی، (پرنس غلام محمد کے میر منشی) احمد وجاہت علی لکھنوی (دفتر گورنر جنرل بہادر کا ملازم) اور دیگر شعرا شامل ہیں۔ کفایت علی خان اور علی اکبر خان کے مشورے سے کلکتہ کے شعراء سے مخاصمت کو مزید نہ بڑھانے کی غرض سے غالب نے "باد مخالف" لکھا۔ اس طرح سفر کلکتہ کے نتیجے میں غالب کی دو فارسی مثنویاں منظر عام پر آئیں۔ پہلی مثنوی چراغ دیر" ہے، جو انہوں نے کلکتہ کے قیام کے دوران قیام بنارس سے متاثر ہو کر کہی اور دوسری مثنوی "باد مخالف" ہے۔ جو کلکتہ کے بارے میں ہے۔

مدرسہ عالیہ کے مشاعرے میں برپا ہونے والا ہنگامہ صرف مشاعرے تک محدود نہیں تھا، بلکہ راستہ چلتے ہوئے لوگ ان پر آوازے کسنے لگے تھے۔ چنانچہ اپنے محسن نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد حسن کے مشورے پر غالب نے یہ مثنوی کہی اور کلکتہ میں ہی ایک کتابچے کی صورت میں چھپوادی۔ غالب نے اپنے محسن کے مطابق تمام اعتراضات کا جواب دیا اور کلکتہ کے بااثر مخالفین سے معذرت کر لی۔

کلکتہ کے دو سالہ قیام کے دوران جہاں غالب کے مخالفین پیدا ہوئے۔ وہاں ان کے شاگردان بھی کم پیدا نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں ان کے قدر دانوں اور معتقدین کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ غالب کے کلام اور خطوط میں ان کے کلکتہ کے جن ہم عصروں کا نام ملتا ہے ان میں آغا احمد علی اصفہانی، احمد علی گوپاموی، اختر خواجہ عبدالغفار، راجہ جنم جیسے مترا ارماں، سید محمود آزاد، نواب سید، افضل بیگ اور شہزادہ بشری الدین توفیق شامل ہیں۔

ارمان، عہد غالب میں بنگال کے بلند پایہ شاعر تھے۔ غالب سے ملاقات کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ خیال ہے کہ ان سے غالب کی ضرور ملاقات ہوئی ہو گی۔ وہ ہم عصر شعرائے بنگال میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ان کا اہم کارنامہ تذکرہ "نسخہ دلکشا" ہے جو غالب کی زندگی میں مکمل ہوا، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے راجندر لال مترا نے 1870 ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ غالب جب کلکتہ آئے تو ان سے سید محمود آزاد سے ملاقات ہوئی اور وہ زندگی بھر کے لئے غالب کے ہو رہے اور بذریعہ خط اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتے میں افضل بیگ غالب کے سخت ترین مخالف تھے اور جائیداد کے سلسلے میں ناکامی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

غالب کے کلکتہ کے قیام کے زمانے میں وہاں کئی انگلش اور بنگالی تھیٹر قائم ہو چکے تھے، البتہ اس وقت تک اردو (یعنی پارسی) تھیٹر معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ انگریزوں نے جب بنگال پر اپنا مستقل تسلط قائم کر لیا تو کلکتے میں انگلینڈ کی طرز پر تفریح طبع کے لئے تھیٹر بھی قائم کر لیا۔ اس دور کے انگلش معاشرے میں تھیٹر کے سوا تفریح طبع کا اور کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ غالب کی کلکتہ آمد سے قبل وہاں 1813 ء میں چورنگی تھیٹر، کلکتہ تھیٹر اور ہندو تھیٹر قائم ہو چکے تھے۔ یہ سارے تھیٹرز چورنگی سے لے کر چائنا بازار اور بہو بازار کے علاقے میں واقع تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر غالبیات کے ماہرین غالب کے اس دور کے کلکتے کے معاشرتی اور ادبی حالات کے بارے میں تحقیق کرتے تو کتنی مفید معلومات اکٹھی ہو جاتیں۔ میں تو محض ایک سیاح تھا۔ اکیس سال کے بعد اپنے آبائی شہر آیا تھا۔ میں جب چند روزہ قیام میں چشم تصور میں غالب کے دور کے کلکتے کی سیر کر سکتا ہوں تو ماہرین غالبیات ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

پری چہرہ لوگ

میں جب تک کلکتے میں رہائش پذیر رہا روز شام کو دوستوں کے ساتھ اور بعض اوقات تنہا سیر کی غرض سے ایڈن گارڈن اور آئرم گھاٹ ضرور جاتا تھا جو نہایت پر فضا، صاف ستھرا، فرحت بخش اور شہر کے ہنگاموں سے پاک علاقہ تھا اور شہر کے زیادہ تر لوگ گھٹن سے بچنے کے لئے سیر کی غرض سے اسی مقام پر آتے تھے۔

اس دفعہ میں جب کلکتہ گیا تو میں نے اس علاقے کی سیر کرنے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ میں ماضی کے لمحوں کو تازہ کر سکوں اور کلکتے کی یادیں ایک دفعہ پھر اپنے دل میں بسا سکوں۔ یہ شاید میری نوسٹلجیا ہی تھی، جس نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایڈن گارڈن برطانوی ہند کے گورنر جنرل لائیڈ آک لینڈ کی بہن مسز ایڈن کے نام پر 1835ء میں قائم کیا گیا تھا تاکہ فرنگی مرد اور عورتیں ٹمٹن اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ تفریح کی غرض سے یہاں آسکیں۔ یہ گارڈن شہر کے اس علاقے میں واقع تھا جہاں ماضی میں زیادہ تر برٹش باشندے رہائش پذیر تھے اور یہ علاقہ صرف انہی کے لئے مخصوص تھا، لہذا بہت عرصے تک اس گارڈن میں "کالے ہندوستانیوں" کا داخلہ منع تھا۔ یہ گارڈن کلکتہ ہائیکورٹ اور فورٹ ولیم کے درمیان دریائے ہگلی کے کنارے واقع تھا۔ اعلان آزادی کے بعد اس کی ایک جانب آل انڈیا ریڈیو کا کلکتہ اسٹیشن اور دوسری جانب رنجی کرکٹ اسٹیڈیم تعمیر ہوا۔ جہاں فرسٹ کلاس کرکٹ کے علاوہ ٹیسٹ میچ ہوتے ہیں۔

ایڈن گارڈن میں سب سے قابل ذکر، پر کشش اور دیکھنے کی شے برمی پگوڈا تھا جسے انگریزوں نے برما فتح کرنے کی نشانی کے طور پر کلکتہ لا کر بڑے اہتمام کے ساتھ اسی ایڈن گارڈن میں نصب کیا تھا تاکہ ہندوستانی رعایا پر سلطنت انگلشیہ کا رعب و دبدبہ قائم ہو، جب طویل جدوجہد کے نتیجے میں ہندوستانیوں کو اس باغ میں داخلے کی اجازت مل گئی تو لوگ سیر و تفریح کے ساتھ ساتھ اس پگوڈا کو

دیکھنے کے لئے خاص طور پر آنے لگے، لیکن اس دفعہ میں کلکتہ گیا تو اس عظیم الشان پگوڈا کو جگہ جگہ شکستہ پایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں سے نہ اس کی رنگائی ہوئی ہے اور نہ صفائی۔ سرخ رنگ کا عظیم الشان پگوڈا موسم کے اثرات اور مسلسل بے اعتنائی کے باعث سیاہ مائل ہو چکا تھا اور اس کی وہ کشش بھی ماند پڑ چکی تھی جو میں نے اکیس بائیس سال قبل دیکھی تھی۔ کبوتروں اور مختلف پرندوں نے اس کے اندر اپنے اپنے گھونسلے بنا لئے تھے اور ان کے بیٹ کی وجہ سے فرش آلودہ تھا اور بدبو کے مارے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایڈن گارڈن اب بلدیہ عظمیٰ کلکتہ کے ماتحت تھا اور "فادرز آف سٹی" نے اس یادگار کو (جو دراصل برمی بدھوں کی عبادت گاہ تھی) تباہ ہونے کے لئے چھوڑ دیا تھا. جیسے اہل خانہ کسی بہت ہی بوڑھے اور معذور شخص کو مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔

پگوڈا دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں چشم تصور میں اس دور میں پہنچ گیا جب ایڈن گارڈن اپنی خوبصورتی اور ہریالی کے اعتبار سے پورے شباب پر تھا اور فرنگی مرد اور عورتیں اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس جگہ سیر و تفریح کیلئے آیا کرتے تھے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ابتدائی دور تھا. اس دور میں بہت کم انگریز یہاں ہوتے تھے اور جو ہوتے تھے ان میں بھی عورتوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جن انگریز ملازموں (فیکٹروں) اور کلرکوں (رائٹروں) نے یہاں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی ان کے لئے شادی کی غرض سے انگریز عورتوں کی تلاش اس دور کا بہت بڑا مسئلہ ہوا کرتا تھا، لہذا اس دور کے کنوارے انگریز ملازمین "دلہن" کی تلاش میں اسی ایڈن گارڈن کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے تاکہ کوئی خوب رو حسینہ نظر آئے اور وہ فوراً اپنا تعارف کرا کے رسم و راہ استوار کر سکیں۔

اس دور میں ہندوستان کی دولت و حشمت کی خبریں برطانوی ملازموں اور ملاحوں کے ذریعے انگلینڈ کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھیں۔ انہیں یہ بھی اطلاع مل چکی تھی کہ یہاں دولت کی ریل پیل ہے اور معمولی سے معمولی انگریز ملازمین بھی راجاؤں اور نوابوں کی طرح عیش و عشرت کے ساتھ شاہانہ زندگی گزارتے ہیں۔ اس دور کے انگلینڈ میں جن لڑکیوں اور زیادہ عمر کی عورتوں کو اچھا رشتہ نہیں ملتا تھا۔ وہ "بر" کی تلاش میں اور نئے ملک کی سیر کرنے کی غرض سے کلکتہ میں مقیم اپنے چچاؤں، ماموؤں خالوؤں پھوپھاوں یا رشتے کے بھائیوں کے ہاں آجاتی تھیں اور ان کے آتے ہی کوئی نہ کوئی خوب رو، متمول اور اعلیٰ انگریز افسر، ان سے رشتے کا طلب گار ہو جاتا تھا۔ اس ضمن میں ... لندن یا لنکاشائر سے کوئی جہاز کلکتہ پہنچنے والا ہوتا تو ان افسروں کا

جہاز کی آمد کی تاریخ اور وقت کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا۔ اس روز آرٹم گھاٹ اور دیگر بندر گاہوں میں کنوارے انگریزوں کا غیر معمولی ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا۔ یہ انگریز نوجوان جھالر دار زرق برق قمیض، چست پتلون، نیپولین کے طرز کا ٹیل کوٹ، اٹھارویں اور انیسویں صدی کا مخصوص ہیٹ پہنے اور بوٹائی باندھے ساحل کے کنارے اسٹرینڈ روڈ پر قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور جب جہاز کی سیڑھی سے ایک ایک کر کے مرد اور عورتیں اترتیں تو یہ نوجوان للچائی ہوئی نظروں سے حسین صورتوں کو تلاش کرتے رہتے اور جب کوئی خوبصورت بلا اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ نظر آتی تو ہجوم میں سے کوئی نہایت اسمارٹ سا نوجوان آگے بڑھ کر اپنا تعارف کراتا۔ اپنے عہدے اور مرتبے کا رعب جماتا اور انہیں ان کے گھر تک اپنی شاندار فیٹن میں پہنچانے کی پیش کش کرتا۔ انگلینڈ سے آئی ہوئی "لیڈی" ابتدا میں قدرے تکلف اور لیت و لعل سے کام لیتی اور بالاخر مفت کی سواری کی پیشکش قبول کر لیتی۔ اس طرح کنوارے انگریز افسر یا ملازم سے اس کا تعارف ہو جاتا جو آگے چل کر شادی پر منتج ہوتا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ "دلہن" کی دریافت اور اس کے حصول کی دوڑ میں بھی طبقاتی فرق اور اونچ نیچ آڑے آتی اور اعلیٰ اور زیادہ آمدنی والے انگریز افسران، زیادہ تر حسین عورتوں کے حصول میں کامیاب رہتے اور چھوٹے افسران اور ملازمین منہ دیکھتے رہ جاتے فرنگی دلہن کی تلاش کی ایک جگہ کسی بڑے پادری یا ریورینڈ کی رہائش گاہ بھی ہوتی تھی۔ جہاں ہر اتوار کو انگلینڈ سے آنے والی خواتین (لیڈیز) عبادت کی غرض سے اکٹھا ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے کہ اس وقت تک کلکتے میں بہت کم گرجا گھر تعمیر ہوئے تھے۔ شادی کے خواہش مند انگریز افسران اور ملازمین عبادت کے بہانے ان مذہبی اجتماعات میں بھی پہنچ جاتے تھے اور اپنی پسند کی خاتون سے راہ و رسم استوار کرنے کا موقع تلاش کر لیتے تھے۔ دلہن پسند کرنے کا ایک ذریعہ وہ پرائیویٹ پارٹیاں اور رقص کی محفلیں ہوا کرتی تھیں جو کسی صاحب حیثیت انگریز کے محل نما بنگلے میں منعقد ہوا کرتی تھیں، لیکن رقص و سرود کی ان محفلوں میں صرف صاحب حیثیت انگریز ہی جایا کرتے تھے۔

اس دور میں موٹر کاریں نہیں تھیں، اس لئے خوبصورت اور ہر طرح سے سجا ہوا فیٹن ہی "اسٹیٹس سمبل" یا سماجی حیثیت کی پہچان ہوا کرتا تھا۔ اس لئے خوبصورت دلہن کے حصول کے لئے صرف زرق برق لباس، یا اعلیٰ سرکاری عہدہ کافی نہیں ہوتا تھا بلکہ چاک و چوبند گھوڑے والا نہایت اعلیٰ درجے کا فیٹن کا ہونا بھی ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ انگریز مرد اور عورتیں انہی فیٹنوں پر سوار ہو

کر ایڈن گارڈن اور ساحل کی سیر کے لئے جایا کرتی تھیں۔ قدیم دور کے ایڈن گارڈن میں انگریز صاحب اور میموں کی تفنن طبع کے لئے بینڈ باجے کا بھی خصوصی اہتمام ہوتا تھا۔ بینڈ پارٹی کے اراکین کے بیٹھنے کے لئے ایک چھجے دار چبوترا بھی تعمیر کیا گیا تھا جو ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی قائم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس دور میں انگریز مرد اور عورتیں بینڈ کی دھنوں پر ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص کیا کرتی تھیں اور آج بینڈ کی دھنوں پر چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اچھلتی کودتی رہتی ہیں۔ اس دور کی اگر کوئی شے یادگار رہ گئی ہے تو بس برمی پگوڈا اور یہی چبوترا۔ ایڈن گارڈن کی یہ رونق اور چہل پہل غالب کے سفر کلکتہ کے دوران تھی یا نہیں، یہ تو نہیں معلوم اس لئے کہ ایڈن گارڈن غالب کے سفر کلکتہ (1828_29) کے سات سال بعد 1835ء میں قائم ہوا لیکن اسٹرینڈ روڈ اور آرم گھاٹ اس سے بہت قبل قائم تھا اور اس دور کے لوگ شام کے وقت سیر و تفریح کے لئے اسی مقام پر آیا کرتے تھے جہاں انگلینڈ سے آئے ہوئے جہاز لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ خیال ہے غالب بھی اپنے کلکتے کے طویل قیام کے دوران اسٹرینڈ روڈ کے اس ساحلی علاقے کی سیر کے لئے ضرور آتے ہوں گے اور پری جمال فرنگی عورتوں کو دیکھ کر ضرور متاثر ہوئے ہوں گے جن کی تعریف میں کپلنگ سے لے کر تھیکرے اور مارک ٹوکن تک رطب اللسان تھے۔

میں جب آرم گھاٹ پہنچا تو شام کے وقت یہ علاقہ بہت ہی خوبصورت نظر آرہا تھا۔ مشرق کی جانب ہوڑہ برج اپنی تمام تر عظمت کے ساتھ ایستادہ تھا اور مغرب کی سمت میں غروب آفتاب کا منظر بہت ہی دلکش محسوس ہو رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں سے ہوڑہ برج انگارے کی طرح سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ دریائے ہگلی پر بڑے بڑے تجارتی جہاز لنگر انداز تھے اور ان کے قریب سے چھوٹے اور درمیانی درجے کے اسٹیمر شور مچاتے اور لہروں کو چیرتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں مسافروں سے لدی ہوئی چھوٹی بڑی کشتیاں بھی گزر رہی تھیں۔ یہ مسافر بردار کشتیاں تھیں جو شام کے وقت چاند پال گھاٹ سے ملازمت پیشہ لوگوں کو لے کر مٹیا برج، گارڈن ریچ اور دریا کے اس پار کمپنی باغ کے قریب شب پور گھاٹ تک جاتی تھیں۔ کلکتہ کی اصطلاح میں یہ وہ "ڈیلی پسنجر" تھے جو ملازمت کی غرض سے صبح کو کلکتہ آتے اور شام کو اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے یہ لوگ آبی راستہ اس لئے اختیار کرتے تھے کہ آمدورفت میں ان کا کم وقت صرف ہو اور وہ آسانی کے ساتھ دفتر آ اور جا سکیں اور بسوں میں طویل سفر اور تھکا دینے والی مسافت سے بچ سکیں۔

چورنگی

کوئی شخص کلکتہ جائے اور چورنگی نہ جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ چورنگی کا علاقہ در حقیقت کلکتے کا دل ہے۔ اس لئے جو شخص بھی کلکتہ جاتا ہے ایک بار چورنگی ضرور جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس دفعہ کلکتہ گیا تو سیدھے چورنگی کی سیر کے لئے نکل گیا۔ دراصل مجھے تھیٹر روڈ میں واقع اسپیشل برانچ کے دفتر میں اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے جانا تھا اور وہاں جاتے ہوئے اسی مقام سے گزرنا تھا، چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس علاقے کو پیدل چل کر دیکھا جائے۔ معلوم نہیں دوبارہ کب دیکھنے کا موقع ملے۔ چنانچہ میں نے تنہا چورنگی کی سیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

چورنگی وہ جگہ ہے جو کسی زمانے میں کلکتے کا سب سے زیادہ صاف ستھرا اور "پوش" علاقہ تصور کیا جاتا تھا، لیکن اب اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ اب نہ وہ پہلی جیسی صفائی تھی اور نہ رونق۔ چورنگی پر واقع عظیم الشان عمارتوں کی دیواریں بوسیدہ، میلی اور سیاسی جماعتوں کے پوسٹروں سے اٹی ہوئی تھیں اور یہ عمارتیں ایک عرصے سے رنگ و روغن سے محروم تھیں۔ میں نے 65ء میں کلکتہ چھوڑنے سے قبل اس علاقے کو دیکھا تھا تو یہ ایسا نہ تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جو ایک زمانے میں صرف انگریزوں کے لئے مخصوص تھا۔ جہاں کئی کئی بیگھوں پر مشتمل انگریزوں کے بڑے بڑے اور شاندار بنگلے تھے اور جہاں صرف انگریز بیرسٹر، وکلا اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان رہا کرتے تھے۔ جہاں سیاہ فام ہندوستانیوں کی رہائش ممنوع تھی۔ قریب ہی اولڈ کورٹ اسٹریٹ اور دریائے ہگلی کے کنارے سپریم کورٹ واقع تھا۔ جہاں اس وقت کلکتہ ہائیکورٹ واقع ہے۔

انگریز تجار اور بڑے بڑے سرکاری افسران زیادہ تر گارڈن ریچ میں بڑے بڑے بنگلوں میں رہتے تھے اور ان کے دفاتر ڈلہوزی اسکوائر اور اس کے گرد و نواح میں واقع تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تقریباً تین سو سال قبل شہر کلکتہ کے قیام کے ساتھ ہی اسے طبقاتی اور نسلی بنیادوں پر بازار کلکتہ اور ٹاؤن کلکتہ میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ بازار کلکتہ میں ہندو اور مسلمان آباد تھے اور ٹاؤن کلکتہ میں

صرف فرنگی، بازار کلکتہ اور ٹاؤن کلکتہ کی سرحدیں مشرق میں بہو بازار اور مغرب میں لال دگھی اور بڑا بازار سے آکر ملتی تھیں۔

شہر کلکتہ کا صحیح معنوں میں قیام جنگ پلاسی کے بعد ہوا۔ جب انگریزوں کو بنگال پر مکمل تسلط حاصل ہو گیا ورنہ جنگ پلاسی سے ایک سال قبل نواب سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کر کے نہ صرف انگریزوں کے قدیم فورٹ ولیم کو نیست و نابود کر دیا تھا بلکہ فرنگیوں کو اپنے سمندری جہازوں پر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور بھی کر دیا تھا لیکن جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی قسمت کا فیصلہ ہو جانے کے بعد انگریزوں نے کلکتے کی تعمیر کی جانب یکسوئی سے توجہ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے تین چھوٹے چھوٹے گاؤں سوتانٹی گوبند پور اور کالی کٹا پر مشتمل یہ خطہ ایشیا کا جدید ترین شہر بن گیا۔

جنگ پلاسی کے وقت کلکتہ کی زمین کی قیمت اتنی کم تھی کہ آج اس بارے میں تصور تک کرنا دشوار ہے۔

میئرز کورٹ کی قدیم دستاویزات اور لوٹری کمیٹی کی رپورٹ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ 1757ء کی جنگ پلاسی کے وقت کمار ٹولی میں ایک کٹھا زمین کی قیمت صرف گیارہ روپے تھی۔ 1780ء میں شملہ بازار کے علاقے (جہاں 1828ء میں مرزا غالب نے قیام کیا تھا) ایک کٹھا زمین کی قیمت صرف دس روپے اور باغ بازار میں ایک کٹھا کی قیمت پچیس روپے تھی۔ اس زمانے میں تین بیگھہ اور 19 کٹھے پر مشتمل ایک بنگلہ صرف نو سو روپے میں فروخت ہوا تھا، لیکن جوں جوں شہر پھیلتا گیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اراضی کی قیمتوں میں دن دگنا اور رات چوگنا اضافہ ہوتا گیا۔ ابتدا میں سوتانٹی، گوبند پور اور کلکتہ میں زیادہ تر غریب غربا اور محنت کش طبقہ سے تعلق رکھنے والے رہا کرتے تھے، لیکن شہر کے قیام اور اس کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ لینڈ بردکروں کی ریشہ دوانیوں کے باعث زمین پر سے غریب طبقے کا قبضہ ختم ہوتا گیا اور وہاں نئی نئی عمارتیں اور سڑکیں تعمیر ہونے لگیں۔ اس زمانے میں کلکتہ میں جا بجا جنگلات، ندی، نالے اور تالاب ہوا کرتے تھے۔ جنہیں شہر کے پھیلاؤ کے لئے مٹی سے بھر دیا جاتا تھا اور ان پر نئی نئی وسیع و عریض سڑکیں تعمیر ہو جاتی تھیں۔ اور سنسان اور ویران گاؤں رفتہ رفتہ جدید شہر کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس دور کے تالابوں میں سے آج بھی بعض تالاب اور اسکوائر موجود ہیں۔

قدیم دیہات کے شہر میں منتقل ہونے سے عوام الناس کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے

برعکس شہر کی توسیع کے ساتھ ساتھ انہیں ان کی اپنی زمینوں سے بے دخل ہونا پڑا اور انہیں دھکیل کر شہر کے باہر نکال دیا گیا جو عرف عام میں سلم ایریا کہلایا لیکن یہ لوگ کسی نہ کسی طرح شہر کے اندر گھس جانے میں کامیاب ہو گئے، اس لئے کہ ان کے رہنے کی جگہ ان کے روزگار کی جگہ سے بہت دور تھی اور ان کے لئے روز آمدورفت مشکل تھی لہذا انہوں نے شہر کے اندر خصوصاً "بازار کلکتہ" میں اپنی چھوٹی چھوٹی پناہ گاہیں بنا لیں جو علاقائی اصطلاح میں "بستیاں" کہلائیں۔ آج بھی یہ بستیاں بدلی ہوئی صورت میں موجود ہیں۔ اس طرح شہر کے اندر غریبوں کا محلہ قائم ہو گیا، جہاں قلی، مزدور، گھریلو ملازم، پالکی بردار، کوچ مین، گاڑی بان اور عام کاریگر اور ہنرمند لوگ اور ان کے لواحقین رہنے لگے۔ اسی کے ساتھ متوسط طبقہ کے کم آمدنی والے لوگ بھی شہر میں آکر آباد ہونے لگے۔ لیکن یہ سب "بازار کلکتہ" میں ہوا۔ ٹاؤن کلکتہ (یعنی چورنگی) آبادی کی یلغار سے محفوظ رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ "بازار کلکتہ" اور "ٹاؤن کلکتہ" میں ثقافتی اعتبار سے بھی فرق ظاہر ہونے لگا۔ فرنگیوں کی بستی، ٹاؤن کلکتہ میں ان کی تفریح طبع کے لئے کلبوں، ریستورانوں اور اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں کے قیام کے ساتھ ساتھ تھیٹر اور اوپیرا ہاؤس بھی قائم ہونے لگے چنانچہ گرینڈ ہوٹل، گریٹ ایسٹرن ہوٹل اور برسٹل ہوٹل اسی عہد کے یادگار ہیں۔

میں چورنگی پہنچ کر دھرم تلہ اسٹریٹ سے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا میٹرو سینما، پرانے وہائٹ وے اور گرینڈ ہوٹل کے آرکیڈ سے گزرتا ہوا، میوزیم اور ایشیاٹک سوسائٹی اور پارک سرکس کے نکڑ کو عبور کرتا ہوا، تھیٹر روڈ سے ہوتا ہوا، سرکلر روڈ اور وکٹوریہ میموریل کے قریب سینٹ پال کیتھیڈرل تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد چورنگی کی سرحد ختم ہو کر بھوانی پور کی سرحد شروع ہوئی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی چورنگی کس قدر شاندار ہے۔ جیوتی باسو کی کمیونسٹ حکومت نے سارے شہر کو بھکاریوں اور بے گھر لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ جنہوں نے فٹ پاتھوں پر اپنی جھونپڑیاں بنا لی ہیں، لیکن یہ علاقہ ابھی تک ان کی یلغار سے محفوظ ہے۔ اس لئے کہ یہ علاقہ آج بھی غیر ملکی سیاحوں کا مرکز ہے اور کمیونسٹ حکومت اس علاقے کو سلم علاقے میں بدلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کلکتہ، خاص طور پر چورنگی اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ غیر ملکی سیاحوں کے لئے بڑی کشش رکھتا تھا لیکن اب کلکتے کی ساری دلکشی اس کی گندگی اور بوسیدگی کی وجہ سے ختم ہو چکی ہے۔ مغربی بنگال میں دارجلنگ ایک اہم سیاحت گاہ تھی لیکن وہاں گورکھاؤں کی سیاسی

تحریک اور سورش کی وجہ سے وہ بھی اپنی کشش اور اہمیت گنوا چکا ہے۔ چورنگی کی جو کسی زمانے میں بڑی شہرت تھی اب خاک میں مل چکی ہے اور اسے دیکھنے کے بعد افسوس ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی چورنگی ہے جو کسی زمانے میں اتنی شہرت رکھتی تھی؟

فورٹ ولیم

آج کے دور میں فورٹ ولیم کی جنگی نقطہ نظر سے خواہ کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو، تاریخی اعتبار سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں تو فورٹ ولیم کالج اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ زندہ اور پائندہ رہے گا۔ اس لئے کہ جدید اردو نثر کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی ہے میں کلکتہ میں جب تک رہا میں نے کبھی اس تاریخی قلعے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ہر سال یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے مواقع پر فورٹ ولیم عوام الناس کے لئے کھول دیا جاتا تھا، تاکہ وہ اس تاریخی قلعے کو اندر سے دیکھ سکیں۔ عامؑ دنوں میں اسے دیکھنے کے لئے خصوصی اجازت لینی پڑتی تھی۔ میں اس دفعہ کلکتہ گیا تو میں نے اس تاریخی مقام کو ہر حال میں دیکھنے کا تہیہ کر لیا، چنانچہ ایک روز صبح کو فورٹ ولیم پہنچ گیا۔ فورٹ کے نگران کو میں نے بتایا کہ میں ایک پاکستانی ادیب اور صحافی ہوں اور کلکتہ کی سیاحت کے لئے آیا ہوں اور فورٹ ولیم کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ہے۔ غیر ملکی ادیب اور صحافی ہونے کے ناطے مجھے فوراً اجازت مل گئی۔ اور میں نے فورٹ ولیم کا چپہ چپہ گھوم کر دیکھا۔

یہ قلعہ آج کے دور میں محض ایک یادگار بن کر رہ گیا ہے، لیکن سترھویں اور اٹھارویں صدی میں، جبکہ فن حرب میں زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی اور نت نئے ہتھیار دریافت نہیں ہوئے تھے، جنگی نقطہ نظر سے اس قلعے کی بڑی اہمیت تھی اور فرنگی برے وقتوں میں اس کے اندر چھپ کر ہی اپنی حفاظت کرتے تھے۔ قلعہ رقبے کے اعتبار سے پانچ مربع کیلو میٹر پر محیط تھا اور اس کے اندر کئی ہزار افراد بہ آسانی رہ سکتے تھے۔ فورٹ ولیم اس وقت جہاں واقع ہے وہاں اس سے قبل جنگلات کے سوا کچھ نہ تھا۔ پہلا فورٹ ولیم ڈلہوزی اسکوائر میں اس جگہ تعمیر کیا گیا تھا جہاں اس وقت جنرل پوسٹ آفس واقع ہے اور جسے نواب سراج الدولہ نے 16 جون 1756ء کو حملہ کر کے تباہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے جنگ پلاسی میں فتح حاصل کرنے کے بعد اوٹرم گھاٹ کے قریب

1758 ء میں نیا فورٹ ولیم تعمیر کیا۔ نئے قلعہ کی تعمیر کے لئے جس مقام کا انتخاب کیا گیا، وہ قدیم گوبندپور تھا اور جہاں اس وقت ایڈن گارڈن اور اوٹرم گھاٹ واقع ہے۔ اس جگہ پر پہلے جنگل ہی جنگل تھا اور آبادی برائے نام تھی، تاہم ان دنوں جو لوگ وہاں آباد تھے۔ انہیں انگریز حکام نے ان کی زمین اور مکانات کا خطیر معاوضہ ادا کر کے سوا بازار، کمہار ٹولی اور تالتلہ میں آباد کیا تھا۔ اس قلعے کی تعمیر پر اس زمانے میں بیس لاکھ اسٹرلنگ خرچ ہوا اور یہ 1758 ء سے شروع ہو کر 1772 ء میں مکمل ہوا۔ اس کے آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں سے پانچ خشکی پر اور تین دریا کے دہانے پر کھلتے ہیں۔ قلعہ اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ اگر دشمن حملہ آور ہو اور پسپائی کی ضرورت محسوس ہو تو دریا کے راستے سے فرار ہونا ممکن ہو۔ دریائی راستہ 9 میٹر گہرا اور 15 میٹر چوڑا ہے۔ اس میں ایسا انتظام ہے کہ ان تینوں دریائی راستوں کو دریا کے پانی سے بھرا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک دروازے کا نام چورنگی گیٹ۔ دوسرے کا پلاسی گیٹ، تیسرے کا کلکتہ گیٹ، چوتھے کا واٹر گیٹ، پانچویں کا سینٹ جارج گیٹ اور چھٹے کا ٹریزری گیٹ ہے۔ اس میں قدیم زمانے کی توپیں اور اسلحہ نہایت اہتمام کے ساتھ سجا کر رکھے گئے ہیں۔

انگریزوں نے جنگلات کاٹ کر اس مقام پر قلعہ تعمیر کرنے کا تو فیصلہ کر لیا لیکن ماضی کے تلخ تجربے کے پیش نظر فوجی نقطہ نظر سے قلعہ کے گرد و نواح میں دور دور تک اونچی عمارت کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی اور وہاں اسپلینیڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسپلینیڈ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں قلعہ تو واقع ہو، لیکن دور دور تک کوئی درخت یا مکانات نہ ہوں، تاکہ دور ہی سے فوج کی نقل و حمل پر بہ آسانی نظر رکھنا آسان ہو۔ یہ سب اٹھارویں صدی کی جنگی حکمت عملی کے پیش نظر کیا گیا تھا لیکن جنگ پلاسی کے بعد جب انگریزوں کا پایہ اقتدار مستحکم ہو گیا اور سارے ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا تو وقت کے ساتھ ساتھ اس قلعے کی جنگی اہمیت بھی ختم ہو گئی اور بالآخر انگریز حکام نے وہاں انگریز افسروں کی تعلیم کے لئے کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو آگے چل کر فورٹ ولیم کالج کہلایا۔

تاریخ میں فورٹ ولیم کا دو باتوں کی وجہ سے خاص طور پر ذکر آتا ہے۔ ایک، اس کے ہندوستانی زبانوں کے کالج کی وجہ سے اور دوسرا، بنگلہ زبان کے مشہور شاعر مائیکل مدھوسودن دت کے اس جگہ پناہ لینے کی وجہ سے۔ اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی جب ہندوستان آئی تو وہ اپنے ساتھ نئی تہذیب اور نیا مذہب بھی لے کر آئی۔ یہ مذہب تھا عیسائیت۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں

کے ساتھ عیسائی مبلغین بھی بنگال میں آئے اور انہوں نے تبلیغ کے ذریعے نہایت سرعت کے ساتھ ہندوؤں کو عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ ہندوؤں کے ابھرتے ہوئے مہاجن اور جاگیردار طبقے نے ابتدا میں انگریزی زبان اور تہذیب کے ساتھ عیسائیت کا بھی اثر قبول کیا اور بعض سرکردہ ہندوؤں نے عیسائیت قبول کر لی۔ ان میں مدھو سودن نامی اعلیٰ ذات کا ایک ہندو برہمن (شاعر) بھی شامل تھا۔ جس پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں زبردست اشتعال پیدا ہو گیا اور انہوں نے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کا فیصلہ کیا۔ عیسائی مشینریوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے مدھو سودن کو اسی فورٹ ولیم میں چھپا دیا، جہاں عام ہندوؤں کی پہنچ بہت مشکل تھی، (اس بارے میں تفصیل علیحدہ باب میں ملاحظہ فرمائیے)

فورٹ ولیم میں انگریزوں کو مقامی زبانیں سکھانے کیلئے باقاعدہ کالج، لارڈ ویلیزلی کے عہد میں مئی 1800ء میں قائم کیا گیا۔ یہ تاریخ سقوط میسور کی پہلی سالگرہ کی یاد میں مقرر کی گئی تھی، چنانچہ اسی سال نومبر سے عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں لیکچر کا سلسلہ شروع ہوا۔ دیگر زبانوں کی کلاس فروری 1801ء سے شروع ہوئی۔ ابتدا میں ہی اس کالج کو بعض ایسے باصلاحیت اساتذہ اور منشی مل گئے، جنہوں نے اپنی اپنی زبان و ادب کو بہت فروغ دیا۔ اساتذہ اور منشیوں کی حوصلہ افزائی اور طالب علموں میں دلچسپی اور اردو اور فارسی کا معیاری نصاب تیار کرنے کے لئے کالج کے سربراہ جان گل کریسٹ نے انعامات مقرر کئے۔ ولیم کیری نے اسی قسم کے انعامات ہندی اور بنگلہ تالیفات کے لئے مقرر کئے۔ اس طرح باغ و بہار، ہفت پیکر، آرائش محفل، قصہ حاتم طائی، گل بکاولی، خرد افروز، بارہ ماسہ، قصہ گل اور ہرمز وغیرہ بلند پایہ تصانیف تخلیق کی گئیں، فورٹ ولیم کالج کے دیسی مصنفوں نے (جنہیں اس دور میں منشی کہا جاتا تھا) جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی اور تراجم و تالیفات کے ذریعہ زبان کو وسعت بخشی۔ ان مصنفوں اور مولفوں کی نثری تصانیف نے پہلی بار اردو کو وہ اسلوب بخشا۔ جس نے اردو زبان کو عوام الناس تک پہنچا دیا۔

1802ء سے 1828ء تک کا زمانہ فورٹ ولیم کالج کی تاریخ میں سنہری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1802ء میں جان گلکریسٹ نے اپنا تاریخی مطبع "ہندوستانی پریس" قائم کیا۔ جس نے مولفین کالج کی تالیفات کو ٹائپ کی صاف ستھری چھپائی میں طبع کر کے کم سے کم عرصہ میں شائقین علم و ادب تک پہنچا دیا۔ یہ کالج تقریباً پچاس سال تک خدمات انجام دینے کے بعد 1754ء میں ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اس کالج کی لائبریری کی بہترین اور نایاب کتابیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور کچھ نیشنل لائبریری منتقل کر دی گئیں۔

مسجد ناخدا

کلکتہ پہنچنے کے بعد میں نے پورا دن بھائی، بہن، بھابی اور بچوں کے ساتھ گزارا اور دوسرے روز ناشتہ کرتے ہی باہر نکل گیا، تاکہ کلکتے کی صبح کا روپ دیکھ سکوں۔ کلکتہ کی صبح کا روپ دیکھے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ کلکتہ کی صبح بہت سہانی ہوتی ہے بشرطیکہ موسم خوشگوار ہو اور بارش یا گرمی نہ پڑ رہی ہو۔ انسان کی طرح شہر بھی سوتے اور خواب سے بیدار ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ صنعتی شہر ہونے کی وجہ سے کلکتہ صرف چند گھنٹوں کے لئے سوتا ہے۔ صبح کا کلکتہ، دوپہر اور رات کے کلکتے سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت تک زیادہ تر لوگ سوتے رہتے ہیں۔ دکانیں بند رہتی ہیں اور سڑکوں پر گاڑیاں بھی کم چلتی ہیں، لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے۔ ٹریفک اور راہ گیروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ دفتروں اور کارخانوں میں جانے والے لوگ گھروں سے نکل پڑتے ہیں اور ٹراموں اور بسوں پر مسافر نہ صرف لد کر بلکہ لنگوروں کی طرح لٹک کر سفر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ٹریفک کے حادثات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بسیں، ٹرامیں اور پرائیویٹ گاڑیاں رینگ رینگ کر چلتی ہیں جس کی وجہ سے قریب جانے والے راہ گیر سواری کے بجائے پیدل چل کر دفتر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب کلکتہ روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا اور پورا شہر بقعہ نور بنا رہتا تھا، خصوصاً چورنگی کے علاقے میں اتنی زیادہ روشنیاں ہوتی تھیں کہ آج اس کا تصور تک محال ہے۔ اگر زمین پر سوئی بھی گر جائے تو یہ بہ آسانی ڈھونڈی جا سکتی تھی، لیکن یہ ماضی کی باتیں ہیں۔ اب لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے گھنٹوں بجلی غائب رہتی ہے اور شہر کی سڑکوں پر جلنے والی روشنیاں اتنی کم ہو چکی ہیں جیسے شہر کلکتہ، شہر ماتم ہو۔ لیمپ پوسٹوں کے قمقمے کم کر دیئے گئے ہیں تاکہ بجلی کم خرچ ہو، جس کی وجہ سے پورا شہر بجھا بجھا سا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے شہر کی رونق چھین لی ہو، حقیقت یہ ہے کہ اس دفعہ کلکتہ گیا تو پورا شہر بیمار بیمار سا لگا، جیسے کسی نے اس شہر کا سہاگ لوٹ لیا ہو۔ شہر کلکتہ پژمردہ نظر آرہا

تھا۔ اس کی واحد وجہ عوام کی مجموعی فلاکت ہے۔ آبادی میں حد سے زیادہ اضافہ ہو جانے کی وجہ سے گندگیوں میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور گھر بار نہ ہونے کی وجہ سے بے گھر لوگوں نے فٹ پاتھوں اور بعض جگہ سڑکوں کے عین وسط میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے راہگیروں کو آمدورفت میں بڑی دشواری پیش آنے لگی تھی، آبادی کی اکثریت نے اسے اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ صوبے میں جب کانگریس کی وزارت تھی تو بلدیہ اور پولیس نے ان بے گھر لوگوں کو مار پیٹ کر شہر سے مضافات کی جانب دھکیل دیا تھا، لیکن اب مضافات کا تصور ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ شہر بے پناہ پھیل چکا تھا۔ جب سے کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی تھی اس نے بے گھر لوگوں کو شہر کے اندر بسنے کی اجازت دے دی تھی۔ جس کی وجہ سے شہر کے درمیان جابجا کپڑوں، بچائیوں اور بانس کی جھونپڑیاں قائم ہو گئی تھیں اور شمالی کلکتہ کا بڑا حصہ ریفیوجی کیمپوں میں بدل گیا تھا۔

کلکتے کی ایک خاص بات ڈیلی پسنجروں کی آمدورفت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کلکتہ کے مختلف سرکاری اور نجی دفتروں میں ملازمت کرتے ہیں اور بنگلہ دیش کے سرحدی سٹیشنوں راناگھاٹ اور بن گاؤں سے لے کر بہار کی سرحد کے قریب واقع بردوان اور آسنول جیسے دور دراز اسٹیشنوں سے روز ٹرین پر کلکتہ آتے اور جاتے تھے۔ ان کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ ملازمت پیشہ لوگ ہیں جو صبح چھے ساڑھے چھے بجے اپنے گھروں سے روانہ ہوتے ہیں اور رات آٹھ نو بجے گھروں کو واپس لوٹتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی بچوں سے اتوار کے سوا کسی روز ملاقات نہیں ہوتی تھی۔

میں گھر سے نکلتے ہی سیدھے زکریا اسٹریٹ پہنچا، جو میرے گھر کے بالکل قریب مسلمانوں کا سب سے مشہور محلہ تھا، لیکن اب اس کا رنگ و روپ بہت حد تک بدل چکا ہے۔ ناخدا مسجد اگرچہ آج بھی اپنے تمام تر جلال و جمال کے ساتھ ایستادہ ہے لیکن زکریا اسٹریٹ میں اب مسلمانوں کی تعداد کم اور ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہو چکی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی، لیکن اب مندر اسٹریٹ تک ہندو آباد ہو چکے ہیں اور بہت ساری ٹرانسپورٹ کمپنیاں کھل چکی ہیں۔ اس علاقے کے دو مشہور مسلمان ہوٹل۔ امینیہ ہوٹل اور امجدیہ ہوٹل۔ قائم ضرور ہیں لیکن اب پہلے جیسی شان و شوکت باقی نہیں ہے۔ اسی ہوٹل کی پہلی منزل پر واقع خلافت کمیٹی کا سائن بورڈ اگرچہ حسب سابق آویزاں ہے، لیکن اب نہ وہاں وہ رونق ہے اور نہ چہل پہل۔ اس کے روح رواں مشہور سماجی کارکن ملا محمد جان کب کے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اب نہ ان کا کوئی نام لیوا ہے اور نہ خلافت کمیٹی کا۔ یہ وہی تاریخی مقام ہے اور یہ وہی تاریخی محلہ ہے جہاں سے خلافت تحریک کے رہنما

مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی قیادت میں تحریک آزادی چلی تھی۔ تحریک خلافت کے ماند پڑنے کے بعد اسی مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا دفتر قائم ہوا تھا۔ جہاں خواجہ ناظم الدین اور حسن شہید سہروردی اور دوسرے مسلم لیگی رہنما بڑی باقاعدگی سے جمع ہوا کرتے تھے اور مجلس عاملہ کے جلسے منعقد کیا کرتے تھے۔ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں اس عمارت اور اس محلے کو مرکزی اہمیت حاصل تھی اور مسجد ناخدا کے جائے وقوع کے باعث اس علاقے کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

میں زکریا اسٹریٹ کا گشت لگانے کے بعد سیدھے ناخدا مسجد میں داخل ہو گیا۔ یہ مسجد مجھے ہمیشہ سے اچھی لگتی رہی ہے۔ اس کی بناوٹ اتنی پرکشش اور اس کی قامت اس قدر بلند ہے کہ پہلی نظر میں ہی آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ اس کا شمار کلکتہ کے قابل دید مقامات میں ہوتا ہے اور غیر ملکی سیاح اسے دیکھنے اور اس کی تصاویر اتارنے کے لئے خاص طور پر آتے ہیں۔ اس کا مینار کئی سو فٹ بلند ہے جس پر چڑھنے کے بعد سارا شہر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن میں نے یہاں مبالغے سے کام لیا ہے۔ کلکتہ شہر اس قدر وسیع و عریض ہے کہ تاحد نظر تک مکانات ہی مکانات نظر آتے ہیں۔ میں ہمت باندھ کر آہستہ آہستہ مینار پر چڑھ گیا تاکہ ایک نظر میں شہر کو دیکھ سکوں۔ دن کا وقت تھا۔ اور آسمان بالکل صاف تھا اس لئے بہت دور تک شہر نظر آیا۔ مینار سے میرے مکان کی چھت اور مکان کا بالائی حصہ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے آبائی گھر اور آبائی وطن کو چھوڑ کر کتنی دور اپنی دنیا بسالی ہے جہاں نہ اپنا کوئی ہے اور نہ جہاں اپنی سرزمین۔

مسجد ناخدا صرف کلکتے کی ہی نہیں، ہندوستان کی چند بڑی مسجدوں میں سے ایک ہے۔ اس کا طرز تعمیر جامع مسجد دلی سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی تعمیر کی کہانی بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کی تعمیر کا تمام تر سہرا مولانا ابوالکلام آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین کے سر بندھتا ہے، جو اس شہر کی بہت ہی اہم اور برگزیدہ شخصیت تصور کئے جاتے تھے۔ وہ 1831ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ ہنوز کمسن تھے۔ نانا نے پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے اس وقت کے تمام مشہور اساتذہ سے کسب علم کیا۔ تکمیل تعلیم مفتی صدرالدین آزردہ کے ہاتھوں ہوئی۔ مولانا خیرالدین کے نانا بزرگوار نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو یہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے اور مکہ معظمہ پہنچے۔ یہاں مولانا خیرالدین کی شادی شیخ محمد طاہر کی بھانجی سے ہوئی اور مولانا خیرالدین مکہ شریف میں بس گئے اور باب السلام پر واقع محلہ قدوہ میں

اپنا نجی مکان تعمیر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے مکہ میں بڑا کام لیا۔ ان کی تحریک پر نہر زبیدہ کی صفائی اور مرمت کا کام انجام پایا۔ وہ ذاتی طور پر اس کام کے نگران تھے۔ ترکی سلطان عبدالحمید نے ان کی خدمات سے خوش ہو کر ان کو "تمغہ مجیدی درجہ دوم" عنایت فرمایا۔ حاجی زکریا کلکتوی وہی شخصیت ہیں، جن کے نام سے زکریا اسٹریٹ منسوب ہے۔

مکہ میں ان کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے وہ ہندوستان لوٹنے پر مجبور ہو گئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ایک روز مولانا خیرالدین گر پڑے۔ جس کی وجہ سے ان کے بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مکہ معظمہ میں ان کا خاطر خواہ علاج نہ ہو سکا۔ ان کے مرید انہیں علاج کی غرض سے کلکتہ لے آئے۔ اس طرح مولانا خیرالدین معہ اہل و عیال ہندوستان لوٹ آئے اللہ کو ان سے ایک اور نیک کام لینا تھا۔ وہ مکہ سے لوٹے تو موجودہ کیننگ اسٹریٹ کے علاقے میں ہی قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت تک اس علاقے کا نام حاجی زکریا کے نام پر نہیں رکھا گیا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی لاکھوں پر مشتمل تھی لیکن قرب و جوار میں کوئی ایسی مرکزی مسجد نہیں تھی، جہاں مسلمان جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھ سکیں وہ واعظ اور نماز پڑھنے کی غرض سے زکریا اسٹریٹ کی چھوٹی سی مسجد میں آتے تھے جہاں اس وقت مسجد ناخدا واقع ہے۔ ان کی مجلس واعظ میں بڑی بھیڑ ہوا کرتی تھی اور بعض دفعہ لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی جس کی وجہ سے افراتفری مچ جاتی تھی ایک روز ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ جس میں کئی لوگ زخمی ہو گئے۔ مولانا خیرالدین نے حاجی عبدالواحد سے کہا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنے بڑے علاقے میں، جہاں لاکھوں مسلمان بستے ہیں۔ ایک قاعدے کی مسجد نہیں ہے۔ جس میں خدا کے بندے جمع ہو کر خدا کا ذکر سن سکیں۔ یہ بات حاجی عبدالواحد کے دل پر لگی۔ اس زمانے میں اس مقام پر دو چھوٹی چھوٹی مسجدیں تھیں ان کے درمیان ایک قطع اراضی خالی پڑا تھا، چنانچہ دونوں مسجدوں اور درمیان کی زمین کو ملا کر موجودہ مسجد کی تعمیر شروع ہو گئی۔ اس کام میں اس دور کے بہت سے مخیر حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن سب سے زیادہ رقم حاجی عبدالواحد اور حاجی زکریا نے فراہم کی۔ مولانا خیرالدین اپنے وقت کے بڑے مبلغ در مصنف تھے۔ دھرم تلہ اسٹریٹ کے نکڑ پر واقع مسجد ٹیپو سلطان کی بنیاد بھی انہوں نے رکھی تھی۔ ان کا انتقال 1808ء میں کلکتہ میں ہوا۔

ایک بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ اگر مولانا خیرالدین مکہ سے ہندوستان نہیں لوٹتے تو ہندوستان کے عوام کو مولانا ابوالکلام آزاد جیسا بلند پایہ ادیب، انشا پرداز، خطیب، مصنف اور رہنما بھی نہ

میرا اخبار "عصر جدید"

زکریا اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے میں بلائی دت اسٹریٹ پہنچا۔ جہاں میرے اخبار "عصر جدید" کا دفتر واقع تھا۔ جس سے میں طویل عرصہ تک وابستہ رہا۔ میں جس وقت عصر جدید کے دفتر پہنچا۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ صبح کے وقت اخبارات کے دفاتر میں عموماً عملہ موجود نہیں رہتا۔ اخبار کے منیجر اقبال احمد کا انتقال ہو چکا ہے۔ نیوز ایڈیٹر، اپنے دور کے مشہور شاعر اور اخبار نویس شہاب لکھنوی بھی گزر چکے ہیں۔ ان کی جگہ رئیس جعفری نیوز ایڈیٹر ہیں۔ اسی ادارے سے شائع ہونے والا شام کا اخبار "امروز" بند ہو چکا ہے۔ اس کے ایڈیٹر اقبال اکرامی بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یعنی اکیس سال کے دوران عصر جدید کی دنیا بدل چکی ہے۔ تمام پرانے صحافی یا تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں یا دوسرے شہروں اور اخبارات میں منتقل ہو چکے ہیں۔ اخبار کی حالت بہت پتلی ہے اور اپنے زمانے کا مشہور و معروف اخبار اور تحریک پاکستان کا ہراول اور بے باک ترجمان "عصر جدید" کی اشاعت صرف واد چر کاپیوں کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے (یعنی مشتہرین اور بعض مخصوص اداروں اور حلقوں میں تقسیم ہونے کیلئے) "عصر جدید" کی حالت زار کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔ ایک زمانہ تھا جب عصر جدید ہندوستان کے اردو دان طبقے میں مسلم لیگ کا غیر سرکاری ترجمان تصور کیا جاتا تھا۔ اس وقت تک دہلی سے قائداعظم کا اردو اخبار "منشور" اور انگریزی اخبار "ڈان" نکلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ صوبہ بنگال میں چونکہ مسلم لیگ کی وزارت قائم تھی۔ اس لئے کلکتہ، مسلم لیگ کا سب سے اہم مرکز بن گیا تھا۔ دارالحکومت اگرچہ دہلی تھا اور کانگرس اور مسلم لیگ کے صدر دفاتر دلی میں تھے لیکن بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت ہونے کے باعث کلکتہ کو خود بخود مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ ایسے عالم میں مشرقی ہندوستان میں "عصر جدید" ہی واحد اخبار تھا جو مطالبہ پاکستان کی حمایت زور و شور کے ساتھ کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی مقبولیت اور اشاعت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر شائق احمد عثمانی تھے۔ یہ اخبار 1918ء سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا تھا۔ اس کے مقابل

روزنامہ "ہند" تھا جو 1929ء سے شائع ہو رہا ہے۔ ابتدا میں اسے چند سوشلسٹ نوجوانوں مثلاً کامریڈ عبدالرزاق اور کامریڈ عبدالحلیم وغیرہ نے آپس میں رقم جمع کر کے نکالا تھا۔ اس کے بانی ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے جو اپنے زمانے کے مشہور و معروف اور بے باک صحافی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے دست راست اور ان کی طرح قوم پرست تھے اس لئے ان کا اردو اخبار روزنامہ "ہند" عصر جدید کے مقابل صف آرا ہو گیا اور حصول آزادی تک صف آرا رہا۔ اس کے بعد مالکانہ حقوق کے سوال پر اختلاف کی بنا پر مولانا ملیح آبادی روزنامہ "ہند" سے الگ ہو کر پہلے ہفت روزہ "اجالا" اور پھر 1946ء میں اپنا ذاتی اخبار "آزاد ہند" جاری کیا۔ دوسری جانب "عصر جدید" کے مالکان نے اسے 1950ء میں خان بہادر محمد جان کے ہاتھوں فروخت کر کے پاکستان کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ اس طرح "عصر جدید" تقسیم ملک کے بعد کانگریس کا ہم نوا بن گیا "عصر جدید" ایک ایسا اخبار تھا جس کے عملے میں مختلف ادوار میں ملک کے مشاہیر ادبا اور صحافی شامل رہے جن میں جمیل مظہری، چراغ حسن حسرت، کرشن چندر، اسرائیل احمد، رضوان اللہ، عطاء الرحمان، ابراہیم ہوش، محمد مصطفی صابری، فاتح ارح، ایچ نظام الدین، شہاب لکھنوی، ناظر الحسینی اور رئیس جعفری شامل ہیں۔

"عصر جدید" کے دفتر سے باہر نکلنے کے بعد میں کلکتہ میں اردو صحافت کی تاریخ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کلکتہ میں اردو صحافت کی تاریخ کم و بیش 176 سال پرانی ہے۔ اب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" تھا، جو 1822ء میں کلکتے سے شائع ہوا، جس کے مدیر اس دور کے عظیم سماجی مصلح راجہ رام موہن رائے تھے اور جو بنگلہ کے علاوہ فارسی اور اردو ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ یہ ٹائپ نہ نستعلیق تھا اور نہ نسخ۔ اس کے درمیان کی کوئی شے تھی۔ ہندوستان میں پریس سب سے پہلے سری رام پور (بنگال) کے مشنریوں نے قائم کیا، تاکہ وہ ہندوستانیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی غرض سے مقامی زبانوں میں انجیل شائع کر سکیں۔ اس سے قبل برصغیر میں اردو طباعت کا کوئی طریقہ رائج نہیں تھا۔ مصنفین کتابیں لکھتے تھے اور خوش نویس (کاتب) ان کی نقلیں تیار کرتے تھے۔ چارلس ولکنس نے سری رام پور میں مشنری ولیم کیری کے اشتراک سے 1780ء میں اردو ٹائپ وضع کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ چارلس ولکنس بنگالی، اردو، فارسی، ہندی اور سنسکرت زبانوں سے واقف تھے۔ 1780ء میں انہوں نے نستعلیق رسم الخط میں سیسے کا ٹائپ ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی اور 1781ء میں اردو کی پہلی کتاب "انشائے کرن" کے نام سے شائع ہوئی، جو فرانسس گلیڈون کی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اسی سال 1781ء میں "لیلیٰ مجنوں" (فارسی) اور 1791ء میں "کلیات

سعدی" شائع ہوئی۔ اس کا "ناشر ایسٹ انڈیا کمپنی پریس" کلکتہ تھا۔

اس دور میں کلکتہ سے اردو اور فارسی کے جو اخبارات شائع ہوئے، مثلاً "مراۃ الاخبار" (فارسی) "شمس الاخبار" (فارسی اور اردو) "آئینہ سکندری" (فارسی) اور "سلطان الاخبار" (فارسی) وہ سب ٹائپ میں شائع ہوئے 1835ء میں عیسائی مبلغوں نے لدھیانے سے "لدھیانہ اخبار" کے نام سے فارسی میں جو اخبار شائع کیا، وہ بھی کلکتے کے اردو ٹائپ میں ہی شائع ہوتا تھا۔ دہلی سے پہلا اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" 1837ء میں جاری ہوا جس کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر (مولانا محمد آزاد کے والد) تھے اسی سال سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے "سید الاخبار" جاری کیا جو 1848ء سے 1853 تک جاری رہا۔ اس دور میں اردو اخبارات اور کتابیں ٹائپ میں شائع ہو کر مقبول ہو رہی تھیں کہ 1825ء میں ہندوستان میں پہلا لیتھو پریس قائم ہوا۔ جس نے فن طباعت میں انقلاب برپا کر دیا اور 1825ء میں ہی لیتھو میں اردو کی پہلی کتاب "فتاویٰ حمادیہ" شائع ہوئی۔ لیتھو گرافی اردو طباعت کے لئے بہت بڑی رحمت ثابت ہوئی اس کے بعد اردو میں ٹائپ کا استعمال یک لخت ترک کر دیا گیا۔ ہندی، بنگلہ اور ہندوستان کی دوسری زبانوں نے طباعت کے لئے ٹائپو گرافی کو اختیار کیا۔ اس کے برعکس اردو والوں نے لیتھو گرافی کو ترجیح دی اور اخبارات و کتب کتابت کے ذریعے لیتھو میں شائع ہونے لگیں۔ گلکریسٹ کا مشہور رسالہ "قواعد زبان اردو" 1831ء میں ایشیاٹک لیتھو گرافک پریس سے شائع ہوا۔

میں فیرس لین میں روزنامہ "آبشار" کے دفتر کے سامنے پہنچتے ہی رک گیا اور اس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ آبشار کے ایڈیٹر ابراہیم ہوش پر فالج گرنے کی وجہ سے وہ اخبار سے الگ ہو چکے ہیں، اخبار بند ہو چکا ہے اور اس کے مالک مشہور شاعر اور بزنس مین سالک لکھنوی فیرس لین کا گھر چھوڑ کر سوتارکن اسٹریٹ منتقل ہو چکے ہیں۔

ابراہیم ہوش کلکتہ کے مشہور اور نہایت ہر دل عزیز اور کہنہ مشق شاعر اور صحافی تھے اور نصف صدی سے زیادہ عرصے تک صحافت سے وابستہ تھے۔ کلکتے کی ادبی اور صحافتی زندگی میں ان کا خاص مقام تھا۔ مجھے ان کے ساتھ "آبشار" اور ہفت روزہ "آثار" میں طویل عرصے تک کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میری صحافتی زندگی کی ابتدا ہی "عصر جدید" "آبشار" اور "آثار" سے ہوئی تھی۔ میں "آبشار" میں سب ایڈیٹر اور "آثار" میں مدیر معاون تھا۔ ہفت روزہ "آثار" 59ء میں شائع ہوا۔ میں اس کے پہلے شمارے سے آخری شمارے تک یعنی تقریباً دو سال اس سے وابستہ رہا۔ اس دوران میں

نے بحیثیت صحافی نہ صرف شہرت حاصل کی، بلکہ آثار کے ذریعے مجھے ادبی اور اخباری حلقوں میں بلند مقام حاصل ہوا۔ "آثار" کے دور ادارت میں ہی ہندوستان بھر کے ادیبوں، مثلاً خلیل الرحمان اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، شارب ردولوی، ابن فرید، شہریار، شہاب جعفری، قمر رئیس، راج نرائن راز، وامق جون پوری، سلام مچھلی شہری، محمد رضا نقوی، واہی عظیم آبادی اور قیوم خضر وغیرہ سے خط و کتابت کے ذریعے رسم و راہ قائم ہوئی۔

ابراہیم ہوش کا اصل نام محمد ابراہیم اور تخلص ہوش تھا۔ وہ ابتدا میں آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ پھر انہوں نے حضرت رضا علی وحشت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ انہیں نظم گوئی پر جس طرح قدرت تھی۔ اسی طرح غزل گوئی پر بھی دسترس، لیکن انہوں نے اپنا کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا۔ وہ ابتدا میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے پرجوش حامی رہے۔ بعد میں اشتراکیت سے متاثر ہو کر کمیونسٹ پارٹی کے ہمدرد بن گئے، لیکن کبھی پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ کلکتہ کے عوام میں فٹ بال بہت ہی مقبول عام کھیل ہے اور جب فٹ بال کا سیزن شروع ہوتا ہے تو سارا کلکتہ اس کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے۔

تقسیم ملک سے قبل کلکتہ میں محمڈن سپورٹنگ، موہن بگان اور ایسٹ بنگال مقبول عام فٹ بال ٹیمیں تھیں۔ محمڈن اسپورٹنگ کلب مسلمانوں کا کلب تھا۔ موہن بگان مغربی بنگال کے ہندوؤں کا کلب اور ایسٹ بنگال، مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے ہندو بنگالیوں کا کلب۔ یہ تحریک آزادی کے عروج کا زمانہ تھا، چنانچہ محمڈن اسپورٹنگ کی اس دور کے مسلمان زعما، خصوصاً مسلم لیگی رہنما خواجہ ناظم الدین، خواجہ نور الدین اور حسین شہید سہروردی وغیرہ کھل کر سرپرستی کرتے تھے۔ دوسری جانب موہن بگان کو کانگرس کی کھلی حمایت حاصل تھی۔ اس طرح اسپورٹس، خصوصاً فٹ بال میچوں میں سیاست داخل ہو چکی تھی، چنانچہ جب موہن بگان اور محمڈن اسپوٹنگ کے درمیان فٹ بال لیگ یا آئی، ایف، اے شیلڈ کا مقابلہ ہوتا تو ہندو اور مسلمان واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے اور نہ صرف محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے درمیان مقابلہ شروع ہو جاتا، بلکہ کفر و اسلام کے درمیان جنگ چھڑ جاتی۔ ایسے موقع پر ابراہیم ہوش محمڈن اسپورٹنگ کی حمایت میں لمبی لمبی نظمیں کہتے، جسے "عصر جدید" اپنے پہلے صفحے پر نمایاں طور پر شائع کرتا اور ہر طرف ابراہیم ہوش کا ڈنکا بجنے لگتا۔ ابراہیم ہوش فٹ بال کے بڑے رسیا تھے اور فٹ بال سے اس طرح دلچسپی لیتے تھے، جیسے شعر و ادب سے۔ انہوں نے نصف صدی تک کلکتہ اور بمبئی کے تمام اہم اخبارات میں ایڈیٹر کے فرائض

انجام دیئے، لیکن انہوں نے شاعری کے بارے میں کبھی سنجیدہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ نظمیں اور غزلیں کہتے اور ضائع کر دیتے یا بہت ہوا تو اخبارات میں شائع کرادیتے۔ انہوں نے 46ء میں شعرائے بنگال کا منظوم تذکرہ لکھا جو غیر مکمل رہ گیا۔ انہوں نے اپنے اخبار "آبشار" میں کلکتیہ اردو میں ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا جو عوام الناس میں بہت مقبول ہوا۔ یہ کالم نثر و نظم پر مشتمل ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنا شعری مجموعہ تو مرتب نہیں کیا، البتہ کلکتیہ اردو میں کہی جانے والی نظموں کا مجموعہ "جندگی کا میلہ" (زندگی کا میلہ) کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے زندگی میں نصف درجن سے زیادہ اخبارات و رسائل کی ادارت کی، جن میں روزنامہ "ہند" روزنامہ "آزاد ہند" روزنامہ "عصر جدید" روزنامہ "آبشار" کے علاوہ ہفت روزہ "آثار" (کلکتہ) ہفت روزہ "ضرب کلیم" (کلکتہ) اور ہفت روزہ "نظام" (بمبئی اور کلکتہ) شامل ہیں۔

میں "آبشار" سے سیدھے روزنامہ "آزاد ہند" کے دفتر روانہ ہو گیا۔ جس کے مدیر مولانا عبدالرزاق کے لائق فرزند احمد سعید ملیح آبادی تھے اور جس سے میں پاکستان آنے سے قبل اسٹاف رپورٹر کی حیثیت سے وابستہ تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ دہلی گئے ہوئے ہیں۔ ان سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس ہوا۔

کالج اسٹریٹ

کالج اسٹریٹ، کلکتے کا وہ علاقہ ہے۔ جسے اگر علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا۔ اس سڑک پر نہ صرف کلکتہ یونیورسٹی، بلکہ کلکتے کی بیشتر اہم دانش گاہیں اور کتابوں کی دکانیں واقع ہیں۔ اسی لئے اس راستے کا نام کالج اسٹریٹ رکھا گیا ہے ورنہ اس کا کوئی بھی نام رکھا جا سکتا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے میرا روز گزر ہوتا تھا۔ اس کی وجہ اس کے فٹ پاتھ پر لگنے والی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی وہ دکانیں ہیں، جہاں دنیا بھر کی انگریزی اور بنگلہ کتابیں اور رسائل نہایت کم قیمت پر دستیاب ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم یہاں پر واقع کتابوں کی دکانوں کے علاوہ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی خریداری کے لئے خاص طور پر آیا کرتے تھے۔ میں بھی دن میں ایک مرتبہ اس علاقے کا گشت ضرور لگاتا تھا اور نہایت کم قیمت پر بعض نہایت اہم اور قیمتی کتابیں خرید لیا کرتا تھا۔ وہاں اصل قیمت سے پچھتر فیصد کم پر کتابیں اور رسائل مل جاتے تھے کراچی کے فٹ پاتھ کے کتب فروشوں کی طرح لوٹ مار نہیں ہوتی تھی چنانچہ میں اس دفعہ کلکتے گیا تو وقت نکال کر کالج اسٹریٹ کی سیر کرنے کے لئے نکل پڑا، لیکن وہاں پہنچ کر بڑی مایوسی ہوئی، کیوں کہ اب دنیا بدل چکی تھی۔ فٹ پاتھ کی دکانوں کے بجائے سڑک کی دونوں جانب (کراچی کی زبان میں) چھوٹے "کھوکھے" (دکانیں) بن چکے تھے۔ جس کی وجہ سے کالج اسکوائر کا سارا حسن غارت ہو چکا تھا۔ اور تالاب اور کلکتہ یونیورسٹی اور پریسیڈنسی کالج کا احاطہ راہگیروں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

یہاں کسی زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی کا رومن طرز کا عظیم الشان اور پرشکوہ سینٹ ہال ہوا کرتا تھا۔ جسے مسمار کر کے اس کی جگہ جدید طرز کی کثیر المنزلہ عمارت تعمیر کی گئی تھی اور اسے مسمار کرتے

وقت کسی نے بھی اس کی ثقافتی اہمیت اور اس کے قومی ورثہ ہونے پر غور نہیں کیا تھا۔ سینٹ ہال کسی زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی کی علامت تصور کیا جاتا تھا جس طرح وکٹوریہ میموریل کلکتے کی علامت۔ کالج اسکوائر اور اس کا تالاب ہر جانب سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ باہر سے معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کے اندر ایک خوب صورت پارک اور تالاب واقع ہے، جہاں کسی زمانے میں "ایکوابال" کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ کالج اسٹریٹ کی دونوں جانب کھوکھے تعمیر کرنے کی اجازت صوبے کی کمیونسٹ حکومت نے دی تھی تاکہ دکان داروں کو مستقل آمدنی کا ذریعہ حاصل ہو جائے۔ اس طرح سیکنڈ ہینڈ کتب فروشوں کو مستقل دکانیں تو مل گئیں لیکن اس کے نتیجے میں اس راستے کی خوبصورتی غارت ہو گئی۔

میں نے ان دکانوں سے کئی بنگلہ کتابیں خریدیں اور سوچنے لگا کہ کلکتے کی جس سڑک پر آج اتنی ساری کتابوں کی دکانیں ہیں وہاں ماضی بعید میں الو بولا کرتا تھا اور صرف کالج اسٹریٹ میں ہی نہیں بلکہ پورے شہر میں کتاب کی کوئی دکان نہیں ہوتی تھی۔ آج کے دور میں اس بات پر مشکل سے یقین آئے گا کہ کلکتہ جیسے عظیم الشان شہر اور برطانوی حکومت کے پہلے دارالحکومت میں کسی زمانے میں کتابیں ریڑھیوں پر آوازیں لگا کر فروخت کی جاتی تھیں اور شہر میں کتاب کی ایک بھی دکان نہیں تھی۔ یہ بات ناقابل یقین ہونے کے باوجود حقیقت ہے۔ کلکتے کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جدید پریس یا فن طباعت کا آغاز کلکتے سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہگلی کے سری رام پور مشن میں 1774ء میں اور کلکتے میں 1780ء میں ہوا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ کلکتے میں دھان سے چاول الگ کرنے کی مشین 1825ء میں اور آٹا پیسنے کی مشین 1826ء میں نصب ہوئی جبکہ پریس 1774ء میں نصب ہوا یعنی اہل کلکتہ کو کھانے سے قبل پڑھنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ شہر کلکتہ میں جب مسٹر ہیکی اور مسٹر گلیڈ وین نے پہلی دفعہ پریس قائم کیا تو لوگ دور دور سے اس عجیب و غریب مشین کو دیکھنے کے لئے آئے۔ اس کے بعد فن طباعت کو نہایت تیزی کے ساتھ فروغ ہوا اور 1825_26ء تک کلکتے میں کئی درجن پریس قائم ہو گئے۔ جن میں دھرم تلہ اسٹریٹ میں واقع راجہ رام موہن رائے کا یونی ٹیرین پریس، منشی ہدایت اللہ کا محمدی پریس اور شفیع الدین کا سلیمان پریس شامل ہیں۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے کلکتے میں بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اس کے باوجود کتابوں کی دکان قائم نہیں ہوئی۔ کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اشیائے خورد و نوش کی طرح کتابوں کی دکان بھی قائم ہو سکتی ہے چنانچہ اس دور میں کتابیں

خوانچہ میں رکھ کر اور آوازیں لگا کر محلوں میں گشت کر کے فروخت کی جاتی تھیں۔ اس وقت تک کتاب کا پبلیشر معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ کتابیں براہ راست پریس سے یا پھر خوانچہ فروشوں کے ذریعے فروخت ہوتی تھیں، البتہ اس عہد کے بنگلہ اور انگریزی اخبارات میں اشتہار شائع ہوتا تھا کہ فلاں پریس نے فلاں موضوع پر کتاب شائع کی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ضرورت ہو تو فلاں پریس میں آکر کتابیں حاصل کریں۔

کالج اسٹریٹ کی یادگاروں میں ایک بڑی یادگار انڈیا کافی ہاوس ہے جو کالج اسکوائر کے نکڑ پر واقع ہے۔ میں کالج اسٹریٹ کی دکانوں کی سیر کرنے کے بعد انڈیا کافی ہاؤس میں داخل ہو گیا اور ایک خالی میز پا کر اس پر قابض ہو گیا۔ صبح دس بجے کا وقت تھا کافی ہاوس طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں اور دوسرے پیشے سے وابستہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے قطعی اتفاق سے خالی میز مل گئی تھی۔ دراصل اسی وقت طلبار کا ایک گروہ اٹھ کر گیا تھا چنانچہ میں نے میز پر قبضہ جما لیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں طلبار کا دوسرا گروہ کافی ہاوس میں داخل ہوا اور میری میز پر تین خالی کرسیاں دیکھ کر مجھ سے معذرت کر کے بیٹھ گیا۔ ان میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کالج یا یونیورسٹی سے نکل کر کافی پینے اور گپ لڑانے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ کالج اسٹریٹ صرف کتابوں کی نئی اور پرانی دکانوں کی وجہ سے نہیں بلکہ دانش گاہوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں یہاں نہ صرف کلکتہ یونیورسٹی اور کلکتہ میڈیکل کالج واقع ہیں بلکہ اس کے گرد و نواح میں ہیر اسکول پریسیڈنسی کالج، سریندر ناتھ بیز جی کالج اور سٹی کالج وغیرہ بھی واقع ہیں اس اعتبار سے اس علاقے کی حیثیت آکسفورڈ کی سی ہے جہاں تمام دانش گاہیں جمع ہیں۔

انڈیا کافی ہاؤس، کلکتے کا محض ایک کافی ہاوس نہیں، بلکہ ایک ثقافتی مرکز بھی ہے۔ جہاں شہر بھر کے طلبار، ادیب، شاعر، مصور، سیاسی ورکر، تاجر، وکلا اور دانشور تھوڑی دیر کے لئے آتے، کافی پیتے اور گپیں کرنے کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ نوجوان طلبار و طالبات کے رومانس کا بھی مرکز ہے۔ اس کے قرب و جوار میں واقع دانش گاہوں کے زیادہ تر طلبار و طالبات اپنے اپنے کالجوں کے کامن رومز کے بجائے کافی ہاوس میں بیٹھنا اور ملک کی سیاسیات حاضرہ پر بحث کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ کاروباری لوگوں اور نوجوان عاشقوں کے ملنے کی جگہ بھی ہے۔ وہ آپس میں وقت طے کر کے یہاں آتے ہیں اور پھر دوسری جگہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کافی ہاوس صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک لوگوں سے بھرا رہتا ہے اور لوگ قطاریں باندھے میز کرسیوں کے خالی ہونے

کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

میں ویٹر کو کافی اور سینڈ وچ کا آرڈر دے کر سوچتا رہا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں میں کلکتہ یونیورسٹی کے دوستوں سے ملنے کے لئے آیا کرتا تھا اور یہاں بیٹھ کر ان سے گھنٹوں گپیں کیا کرتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد آنے کی وجہ سے وہاں شناسا چہرہ ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے میں ماضی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کافی ہاوس بھی دور برطانیہ کی یادگار تھا۔ ایک ایسی یادگار جس کا کلکتہ کی ثقافتی سیاسی اور اقتصادی زندگی سے گہرا تعلق تھا۔ انڈیا کافی ہاوس یوں تو "انڈین کافی بورڈ" نے عوام میں کافی کو مقبول بنانے اور کافی نوشی کو فروغ دینے کے لئے قائم کیا تھا۔ لیکن کافی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے بعد چائے اور کافی کی کاشت شروع کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ چائے اور کافی خالص ہندوستانی مشروب ہیں اور صدیوں سے رائج ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ فرنگیوں نے اس کی بڑے پیمانے پر کاشت شروع کی اور اسے انگلینڈ میں متعارف و مروج کیا۔ کافی اور چائے کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی گئی کہ یہ ایک ایسا مشروب ہے۔ جسے پی کر شراب کی طرح نشہ نہیں آتا۔ اس کے برعکس سرور محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے ساتھ ہی انگلینڈ میں چائے اور کافی مقبول ترین مشروب میں شامل ہوئی۔ جسے انگلینڈ کے ارسٹوکریٹ طبقے نے خاص طور پر قبول کیا۔ رات کے کھانے کے بعد آتش دان کے گرد بیٹھ کر کافی نوش کرنا اس دور کے انگلینڈ کا مقبول عام فیشن بن گیا۔ اس دور میں صرف طبقہ اشرافیہ ہی اسے استعمال کرتا تھا البتہ کافی رفتہ رفتہ عوام الناس میں بھی مقبول ہوتی گئی اور لندن کے مختلف علاقوں میں کافی ہاوس قائم ہونے لگے۔ لندن میں پہلا کافی ہاوس 1652ء میں اور پیرس میں پہلا کافی ہاوس 1671ء میں قائم ہوا۔ مشہور برطانوی لغت نویس ڈاکٹر سموئیل جانسن کے عہد تک پہنچتے پہنچتے لندن میں لاتعداد کافی ہاوس قائم ہو گئے، جہاں ادیب و شاعر، مصور اور تاجر بڑی تعداد میں اکٹھا ہونے لگے۔ یہ جمہوریت کی نشوونما کا دور تھا۔ ان کافی ہاوسوں کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ صرف آرام کرنے کی جگہ نہیں، بلکہ ملک کے سیاسی، ادبی اور ثقافتی امور پر بحث مباحثے اور غور و فکر کی جگہ بھی تھی۔ برطانیہ میں اخبارات کے اجراء کے ساتھ ساتھ ان کافی ہاوسوں میں شہر کے تمام بڑے اخبارات و جرائد اور سیاسی کتابچے بھی رکھے جانے لگے۔ جہاں لوگ کافی پی کر اطمینان کے ساتھ اخبارات کا مطالعہ کرتے اور آپس میں تبادلہ خیالات کرتے تھے جانسن کے دور میں برطانیہ میں جو کافی ہاوس خاص طور پر مشہور تھے۔ ان میں ٹمپل بار، کووینٹ گارڈن، بیڈ

لارڈ کافی ہاوس اور رائل ایکسچینج کافی ہاوس مشہور ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سارے کافی ہاوس مختلف پیشوں سے وابستہ لوگوں کے لئے مخصوص تھے۔ مثلاً ٹمپل بار، کووینٹ گارڈن کافی ہاوس اور بیڈ فورڈ کافی ہاوس انگلینڈ کے مشہور ادیبوں، مثلاً فیلڈ نگ، ہوگارتھ، مرفی، کولمبن وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ جوناتھن، ٹامس اینڈ لائیڈ اور رائل ایکسچینج کافی ہاوس میں زیادہ تر تجار اور کاروباری لوگ بیٹھتے تھے۔ اسی طرح چیٹر کافی ہاوس ڈاکٹروں کے لئے، کافی چوکولیٹ ہاوس طبقہ امرا اور اشرافیہ کے لئے اور بیٹنس اینڈ ولسن کافی ہاوس ڈرائیڈن، ایڈیسن اور اسٹیبل جیسے دانشوروں کے لئے مشہور تھے۔

کلکتہ میں پہلا کافی ہاوس 1798 ء میں کونسل ہاوس اسٹریٹ میں قائم ہوا، جو اس دور میں فرنگیوں کا مشہور محلہ تھا۔ فرنگیوں نے اس قسم کے کافی ہاوس صرف کلکتہ میں ہی نہیں، مدراس اور بمبئی میں بھی قائم کئے، خصوصاً ان ساحلی شہروں میں جہاں ان کے جہاز تجارتی لین دین کی غرض سے لنگر انداز ہوتے تھے۔ کافی ہاوس کے مالکان خریداروں کو ترغیب دینے کے لئے نہ صرف اخبارات میں اشتہار شائع کرواتے تھے بلکہ یہ بھی اعلان کرتے تھے کہ "خریداروں کی دلچسپی کے لئے مقامی اخبارات کے علاوہ لندن کے دو مشہور اخبارات کا بھی خصوصی انتظام ہے، صرف اتنا ہی نہیں، بعض انتہائی اہم، پراسرار اور دلچسپ سیاسی پمفلٹوں کو بھی رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے" (یہ پمفلٹ زیادہ تر انقلاب فرانس کے بارے میں ہوتے تھے) اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قدیم کلکتہ کے کافی ہاوس، قدیم لندن کے کافی ہاوسوں کی طرح کافی شاپ کے علاوہ ایک قسم کے "دارالمطالعہ" بھی ہوتے تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ ایک عرصے تک کافی ہاوس قائم رہنے کے باوجود اس دور کے پڑھے لکھے انگریزی دان ہندوستانیوں میں اس سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی، لہذا وہاں صرف فرنگی ہی آتے تھے۔ ہندوستانیوں، خصوصاً امیر اور متموّل بنگالیوں میں کافی ہاوس سے عدم دلچسپی کی اصل وجہ ان کی اپنی روایت تھی، جس کے باعث اس دور میں بازار میں کھانا پینا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ ہر شخص، خواہ وہ امیر ہو یا متوسط طبقے کا فرد، گھر میں ایک "بیٹھک خانہ" (جسے دیوان خانہ بھی کہا جاتا ہے) ضرور ہوتا تھا۔ جو لوگ ملنے کی غرض سے آتے تھے وہ دیوان خانے میں ہی بیٹھتے، کھاتے پیتے اور خوش گپیاں کرتے تھے۔ اس وقت تک کلکتہ میں کوئی ہوٹل قائم نہیں ہوا تھا۔

کلکتہ میں پہلا ہوٹل 1805 ء میں ولیم ڈوری نامی ایک فرنگی نے قائم کیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک یعنی اٹھارویں صدی ختم ہونے کے ساتھ ساتھ کلکتے میں پنچ ہاوس punch house اور ٹیورن tavern کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ جدید ہوٹلوں نے لینا شروع کر دیا تھا۔ البتہ کافی ہاوس اپنی جگہ قائم تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں کلکتہ شہر نے تیزی کے ساتھ ترقی

کرنا شروع کر دیا کیونکہ تجارت و صنعت میں تیزی کے ساتھ ترقی ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ شہر کی آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا اور لوگ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے تجارت، تعلیم اور روزگار کی غرض سے کلکتہ آنے لگے، چنانچہ تجارت پیشہ فرنگیوں نے ہوٹل کے قیام کی ضرورت محسوس کرنی شروع کر دی اور 1830ء میں کلکتہ میں پہلی بار ایک عظیم الشان ہوٹل۔ اسپنسیس ہوٹل۔ کے نام سے قائم ہوا۔ اس کے مالک جون اسپنسیس تھے۔ ہوٹل اپنے دور کا انتہائی مہنگا ہوٹل تصور کیا جاتا تھا۔ جس کا یومیہ کرایہ اس زمانے میں سو روپے تھا۔ اس کے بعد 1835ء میں دوسرا بڑا ہوٹل "دی گریٹ ایسٹرن ہوٹل" (لمیٹڈ) قائم ہوا۔ جو آج بھی جوں کا توں ہے۔

جس طرح ایک زمانے میں کلکتے میں پنچ ہاؤس اور ٹیورن قائم ہوا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رواج ختم ہو گیا۔ اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ کافی ہاؤسوں کا بھی زوال شروع ہو گیا۔ کیوں کہ رفتہ رفتہ اس کے سرپرستوں کا وجود ختم ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحلیل کے بعد اس میں شامل مختلف کمپنیوں نے الگ الگ نام سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ چائے اور کافی کاشت کرنے والے لارڈ لپٹن اور لارڈ بروک بانڈ نے اپنی الگ کمپنیاں قائم کیں اور ہندوستانیوں میں چائے اور کافی کو مقبول کرنے کے لئے "انڈین ٹی بورڈ" اور "انڈین کافی بورڈ" کے نام سے ادارے قائم کئے۔ جس کا کام ہندوستانیوں میں مفت چائے اور کافی تقسیم کر کے انہیں اس کا عادی بنانا تھا چنانچہ اس مقصد کیلئے بڑے بڑے شہروں میں بورڈ کی طرف سے کافی ہاؤسوں کا جال بچھا دیا گیا اور بہت قلیل رقم میں چائے اور کافی فراہم کی جانے لگی۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ ہندوستانی عوام جب چائے اور کافی کے اچھی طرح عادی ہو گئے تو ان "اداروں" کا کام بھی ختم ہو گیا چنانچہ بورڈ نے ملک کے مختلف حصوں میں قائم کافی ہاؤسوں کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔

اس عرصے میں بنگالی عوام کافی ہاؤس میں بیٹھنے کے عادی ہو چکے تھے اور اب کافی ہاؤس نے ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی، چنانچہ جب کلکتے میں کافی ہاؤس بند کر دینے کا فیصلہ کیا گیا تو بنگالی دانش ور طبقے کی جانب سے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔ لوگوں نے اخبارات اور بورڈ کے ڈائریکٹروں کو سینکڑوں، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھ کر اس فیصلے پر نظرثانی کرنے کی درخواست کی۔ کلکتہ کے مشہور انگریزی اخبار "اسٹیٹس مین" نے کافی ہاؤس بند کرنے کے خلاف اداریہ لکھا۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ اسے زر تلافی کی بنیاد پر چلانے کے بجائے تجارتی بنیاد پر چلانے کی غرض سے پرائیویٹ فرموں کو فروخت کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور اس طرح کئی سو سال قبل قائم ہونے والا کافی ہاؤس بند ہونے سے بچ گیا۔

کلکتہ یونیورسٹی میں فیض سیمی نار

کلکتہ کے قیام کے دوران میرا جی چاہا کہ میں ایک دفعہ کلکتہ یونیورسٹی دیکھ آؤں۔ اس لئے کہ ایک دور تھا۔ جب میں کسی نہ کسی وجہ سے روز وہاں جاتا تھا۔ میں اگرچہ اس کا طالب علم نہ تھا، لیکن میرے تمام دوست اور کامریڈ اسی دانش گاہ کے طالب علم تھے اور ان کے سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وہاں روز کوئی نہ کوئی جلسہ یا تقریب ہوتی رہتی تھی۔ جس میں ہر پارٹی ورکر کی شرکت ضروری تھی۔

یونیورسٹی میری قیام گاہ سے زیادہ دور نہیں تھی، چنانچہ میں ایک روز یونیورسٹی روانہ ہو گیا۔ صبح کا وقت تھا اور یونیورسٹی کھلی ہوئی تھی، چنانچہ میں سیدھے دربھنگا ہال کی چوتھی منزل میں پہنچ گیا، معلوم ہوا کہ اردو کلاسیز دوپہر کو شروع ہوں گی اور طلبار اور اساتذہ بھی دوپہر کو آئیں گے، چنانچہ میں یونیورسٹی کے مختلف گوشوں میں آزادانہ طور پر گھومتا رہا اور کسی نے دریافت نہیں کیا کہ آپ کیوں آئے ہیں اور کس سے ملنا ہے؟۔ میں دل ہی دل میں کلکتہ یونیورسٹی سے کراچی یونیورسٹی کا موازنہ کرنے لگا۔ کراچی یونیورسٹی میں طلبا کی تنظیمیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی رہتی ہیں اور آئے دن یہاں خون خرابہ ہوتا رہتا ہے جبکہ کلکتہ یونیورسٹی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی حالانکہ یہاں بھی طلبار کی مختلف تنظیمیں قائم ہیں اور ان میں اختلافات بھی ہیں لیکن وہ آپس میں کبھی اس طرح ایک دوسرے کے خون نہیں بہاتے ہیں۔ نکسل باڑی تحریک جیسی بڑی تشدد تحریک شروع ہوئی اور ختم ہو گئی، لیکن طلبار نے ایک دوسرے کے خلاف اسلحہ نہیں اٹھایا۔

میں کلکتہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کی تاریخ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس جامعہ کو قائم

ہوئے سواسو سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ برصغیر میں جن قدیم جامعات نے نئے علوم و فنون کے چراغ روشن کئے، ان میں کلکتہ یونیورسٹی کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے بعد مدراس اور بمبئی یونیورسٹی کا نام آتا ہے۔ ان ساحلی شہروں میں فرنگیوں نے سب سے پہلے قدم رکھا اور نئی روشنی انہیں ساحلی شہروں سے ملک کے دوسرے علاقوں میں پھیلی، لیکن ان شہروں میں کلکتہ کو اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ انگریز سب سے پہلے بنگال کے حکمران بنے اور انہوں نے سب سے پہلے کلکتے میں ہی جدید تعلیمی ادارے قائم کئے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سن تاسیس 1857ء ہے، لیکن اس سے بہت قبل جس دانش گاہ کی بنیاد پڑی وہ ہندو کالج (موجودہ پریسیڈنسی کالج) ہے۔ یہ ہندوستان کا پہلا کالج ہے جہاں سے مغربی تعلیم کا آغاز ہوا۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل کا ذکر ہے کہ متمول ہندو زمین داروں نے محسوس کیا کہ اگر انگریزوں کی خوشنودی حاصل کر کے اعلیٰ سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر فائز ہونا مقصود ہے تو اعلیٰ مغربی تعلیم و تہذیب حاصل کئے بنا چارہ نہیں ہے انگریزوں کے طفیل لارڈ کارنولیس کے عہد میں ہی ہندو تاجر اور سود خور بنئے نئے زمینداری نظام کے تحت بڑی بڑی اراضی خرید کر زمیندار بن چکے تھے۔ چنانچہ اب انہیں ایسے تعلیمی اداروں کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں ان کی آئندہ نسلیں انگریزی پڑھ کر اور مغربی تہذیب اختیار کر کے نئے عہد کے تقاضے پورے کر سکیں، چنانچہ چیت پور روڈ کے متمول زمیندار گوراچاند بیساک کی قیام گاہ پر ہندو کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ اور 20 جنوری 1817ء سے تعلیمی سال کا آغاز ہوا۔ 1819ء میں ڈیوڈ ہیئر کو کالج کا پہلا "وزیٹر" مقرر کیا گیا اور ہندوستان میں فرانسیسی نوآبادی چندر نگر کے باشندے ڈی۔ آنسلیم دو سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر شعبہ انگریزی کے سربراہ مقرر ہوئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں بنگال میں جتنے بھی بڑے ہندو دانش ور پیدا ہوئے وہ اسی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ بنگال میں جن مشاہیر نے سماجی، اصلاحی اور تہذیبی تحریکیں شروع کیں۔ ان کا کسی نہ کسی طرح اس تعلیمی ادارے سے تعلق تھا۔ اس کے بعد جس درسگاہ کا نام آتا ہے۔ وہ سنسکرت کالج ہے یہ کالج بھی کالج اسٹریٹ میں گول دگھی (کالج اسکوائر) میں ہی واقع تھا۔ اس کالج میں یوں تو بہت پہلے درس و تدریس شروع ہو چکی تھی، لیکن اس کی عمارت 1824ء میں تعمیر ہوئی۔ سنسکرت کالج کو ہندو کالج کی توسیع اور کلکتہ یونیورسٹی کو سنسکرت کالج کی توسیع کہنا غلط نہیں ہے۔ کیوں کہ ان تمام کالجوں کو لے کر 1857ء میں کلکتہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ وہ تعلیمی ادارے ہیں جن کے قیام کے بعد ہندوستان میں باقاعدہ متوسط طبقہ پیدا ہونا شروع ہوا، جس نے آگے چل کر ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی میدان میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یوں تو ہندوؤں میں بہت پہلے سے بنگلہ اور سنسکرت کی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کا رواج شروع ہو چکا تھا، لیکن ان کالجوں اور یونیورسٹی کے قیام کے بعد اب زمینداری پر منحصر بنگالی اشرافیہ کے ساتھ ساتھ غریب طبقہ کے لوگوں کو بھی اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں حاصل ہو گئی تھیں۔ جس نے بنگال اور پھر سارے ہندوستان میں سماجی اور تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ اس میں برطانوی اور مغربی مستشرقین کی قدیم ہند کی تہذیبی روایات کی بازیافت نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ نئے دور نے ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے جیسے ریفارمر کے ساتھ ساتھ ایشور چند ودیا ساگر اور ویویکانندا جیسے ہندو احیا پرستوں کو بھی پیدا کیا، جن کی روایت کو بعد میں لوک مانیہ تلک، گاندھی اور اروبندو گھوش نے آگے بڑھایا۔

کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلروں میں بڑے بڑے لوگ شامل ہیں، ان کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن ان میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف حسن شاہد سہروردی واحد شخص ہیں، جنہیں یہ اعزاز حاصل ہے۔ حسن شاہد سہروردی آل انڈیا مسلم لیگ کے مشہور رہنما، متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسن شاہد سہروردی کے بڑے بھائی تھے، جن کی علمیت کا برصغیر میں نہ صرف مسلمان، بلکہ ہندو بھی قائل تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے اور بنگال صوبائی اسمبلی میں مسلمان ارکان کی اکثریت کے باوجود سوائے شاہد سہروردی کے کسی دوسرے مسلمان کو کلکتہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ تعلیمی میدان میں ہمیشہ ہندو ہی چھائے رہے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں ہندوستان کی دیگر جامعات کی طرح اردو کا بھی ایک علیحدہ شعبہ قائم ہے، جس سے اردو کے مشہور و معروف اساتذہ وابستہ رہ چکے ہیں، جن میں پروفیسر ہیرالال چوپڑہ، پروفیسر عبدالرحمان بیخود اور پرویز شاہدی وغیرہ شامل ہیں۔ پرویز شاہدی کے زمانے میں یونیورسٹی میں میری زیادہ آمدورفت تھی۔ میرے زیادہ تر دوست انہی کے دور میں یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور پھر بائیں بازو کی تحریک میں براہ راست شمولیت کی وجہ سے میرا کلکتہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ میں روز آنا جانا رہتا تھا۔

میرے پاکستان آنے کے بعد میرے بہت سارے دوست کلکتہ کے مختلف کالجوں سے وابستہ

ہو گئے تھے اور ساتھ ہی کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق بھی، چنانچہ مجھے جب معلوم ہوا کہ میرے کئی دوست باقاعدہ پروفیسر اور ایسوسی ایٹیڈ پروفیسر بن چکے ہیں تو میں ان سے ملنے کی خواہش دبائے نہ رکھ سکا اور ان سے ملنے کے لئے بیچین ہو گیا۔

میں نے دوسرے روز جاوید نہال کو پکڑا اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ "آج کلکتہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین" کی جانب سے آسوتوش ہال میں یک روزہ فیض احمد فیض سیمی نار اور مشاعرہ ہے۔ اگر تم چلنا چاہو تو چلو۔"

میں فوراً آمادہ ہو گیا۔ میں فیض احمد فیض کے سیمینار میں شرکت بھی کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی کلکتہ کے نئے شعرا کا کلام بھی سننے کا مشتاق تھا۔ اس بہانے اپنے دوستوں سے بھی ملاقات ہونے کی توقع تھی۔ میں وقت مقررہ سے کچھ قبل جاوید نہال کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تو سٹاف روم میں اپنے تمام اساتذہ دوستوں کو پایا، جن میں ظفر اوگانوی، عبدالمنان، مشتاق احمد اور شمیم انور وغیرہ شامل تھے۔ اس روز پروفیسر عبدالروف نہیں آئے تھے

ظفر اوگانوی اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناقد ہیں اور صفیر بلگرامی پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ جاوید نہال یوں تو مولانا آزاد کالج (سابق اسلامیہ کالج) کا استاد ہے، لیکن جزوقتی طور پر کلکتہ یونیورسٹی سے بھی وابستہ ہے۔ اس نے بتایا کہ اس وقت شعبہ اردو میں تقریباً پچاس طلبار زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے اٹھارہ پوسٹ گریجویٹ ہیں اور پچیس طلبار مختلف موضوعات پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی دیگر جامعات کی طرح کلکتہ یونیورسٹی میں بھی ڈاکٹریٹ کرنے والے طلبار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس وقت پانچ اساتذہ کل وقتی اور تین جزوقتی ہیں۔ کل وقتی اساتذہ میں ظفر اوگانوی، عبدالروف، عبدالمنان، مشتاق احمد اور شمیم انور شامل ہیں۔ جزوقتی اساتذہ میں شاہ مقبول احمد، جاوید نہال اور یوسف تقی شامل ہیں۔

میں جاوید نہال کے ساتھ جب آسوتوش ہال میں پہنچا تو مقررین میں سالک لکھنوی، ڈاکٹر ظفر اوگانوی، ڈاکٹر ایم این حسن ہاشمی، اور ہندی کے مشہور مصنف ڈاکٹر پربھاکر مچاوے پہنچ چکے تھے۔ شانتی رنجن بھٹیاریہ کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ میں جاوید نہال کے ساتھ سامعین کے درمیان بیٹھ گیا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کمپیئر ڈاکٹر عبدالمنان نے سالک لکھنوی کا نام صدارت کے لئے پکارنے کے بعد میرا نام بطور مہمان خصوصی پکارا۔ میں اس کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہ تھا۔ اس لئے میں اپنی نشست پر بیٹھا انکار کرتا رہا۔ لیکن جب صدر سالک لکھنوی اور

دوسرے احباب نے بہت اصرار کیا تو میں بادل نخواستہ مہمان خصوصی کا عہدہ سنبھالنے پر مجبور ہو گیا۔
کلکتہ یونیورسٹی جیسی عظیم دانش گاہ کے سیمینار میں مجھ جیسے ہیچ مندان کا مہمان خصوصی ہونا بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں اس سے قبل چونکہ دلی اردو اکیڈمی کے سیمینار میں مہمان خصوصی کا فرض انجام دے چکا تھا اور ساتھ ہی مختصر سی تقریر بھی کر چکا تھا اس لئے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی اور میں نے اپنی لکنت پر قابو پانے کا طریقہ جان لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دہلی کی طرح یہاں بھی دھیمی آواز میں رک رک کر بولوں گا۔ اس طرح سامعین کو میری لکنت کا علم نہیں ہو گا چنانچہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔
ڈاکٹر ظفر اوگانوی، ڈاکٹر حسن ہاشمی اور ڈاکٹر پربھاکر ماچوے کے بعد اور صدر سالک لکھنوی سے قبل مجھے جب تقریر کرنے کے لئے روسٹرم پر بلایا گیا تو میں بڑی خود اعتمادی کے ساتھ مائیکروفون کے سامنے گیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ تقریر کی۔ میں نے اس موقع پر فیض احمد فیض کے بارے میں جو کچھ کہا اس سے مقررین اور حاضرین کو بڑی حیرت اور مایوسی ہوئی اور بعض کو ناگوار بھی گزرا۔ میں نے کہا، "فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر ضرور تھے، لیکن مروجہ معنوں میں انہیں انقلابی شاعر کہنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری نہ انقلابی تھی اور نہ ان کا طرز زندگی انقلابیوں جیسا تھا۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ طبقہ کے افراد کے ہاں قیام کرتے تھے۔ اعلیٰ قسم کی شراب پیتے تھے اور عمدہ قسم کی غذا کھاتے تھے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے۔ ان کی شاعری بھی جوش، مخدوم یا سردار جعفری جیسی انقلابی نہیں ہے۔ وہ نرم لہجے کے روایت پسند شاعر تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ سماجی انقلاب کے خواہاں تھے اور اشتراکی انقلاب کے حامی تھے، لیکن ان کی شاعری تمام تر رومانی اور عشقیہ شاعری تھی۔ ان کے نزدیک انقلاب بھی ایک محبوبہ کی طرح تھا۔"
سیمینار کے ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر اوگانوی نے بڑی حیرت کے ساتھ کہا کہ آپ نے ترقی پسند ہوتے ہوئے فیض کے بارے میں ایسی باتیں کہیں۔ تعجب ہے۔"
ظفر اوگانوی اور ان جیسے فیض پرستوں کو میری تقریر سے اس لئے صدمہ پہنچا کہ بنگال کے ادیبوں کے ذہن میں فیض احمد فیض کا امیج ایک انقلابی شاعر کا ہے، جبکہ میں نے انہیں غیر انقلابی قرار دیا تھا۔ بعد میں ظفر اوگانوی نے "افکار" کے مدیر صہبا لکھنوی کو لکھا کہ "حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کے ادیب فیض کو غیر انقلابی تصور کرتے ہیں"

انیس رفیع

انیس رفیع کلکتہ کے نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ وہ 60ء کے عشرے میں منظر عام پر آئے۔ یعنی میرے کلکتہ چھوڑنے کے فوراً بعد چنانچہ ان سے ملاقات ہوئی تو ایک نئے افسانہ نگار سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے پرانے دوست شاہد جمیل کے چھوٹے بھائی ہیں۔ شاہد جمیل شاعر تھا اور کسی زمانے میں رپن کالج (سریندر ناتھ بینرجی کالج) میں پرویز شاہدی کا شاگرد تھا اس لئے لازمی طور پر ترقی پسند بھی تھا۔ بعد میں اس نے اپنے آبائی گاؤں حاجی پور (بہار) میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی۔

انیس رفیع کے نام سے میں پہلے ہی واقف تھا۔ ان کے افسانے، شاعر، شاہکار، عصری ادب، عصری آگہی، صبح نو، آہنگ، ادراک، کتاب، شب خون اور دوسرے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے، چنانچہ ان سے مل کر کلکتہ کے نئے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے بارے میں تفصیل معلوم ہوئی۔ وہ آزادی سے دو سال قبل 45ء میں پیدا ہوئے۔ 1965ء میں پولیٹکل سائنس میں بی اے اور 68ء میں پولیٹکل سائنس میں ہی ایم اے کیا۔ اس کے بعد 69ء میں ایل ایل بی کا امتحان دیا۔ اس کے بعد انہوں نے 74ء میں یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں شرکت کی اور کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد سے آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہیں۔ وہ اس وقت پروگرام ایگزیکٹو تھے۔ ابتدا میں وہ ڈراما اور طنزیہ مضامین لکھتے تھے پھر افسانہ لکھنے لگے۔ ان کا پہلا افسانہ "ہیر" بمبئی کے ماہنامہ "پائل" میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "اب وہ اترنے والا ہے" 84ء میں شائع ہوا۔ جس میں اٹھارہ کہانیاں شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "شب زار" زیر طبع ہے۔

انیس رفیع مجھے اپنے ساتھ کلکتہ ریڈیو سٹیشن لے گئے، تاکہ وہاں اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔ میں ریڈیو سٹیشن میں داخل ہونے سے قدرے ہچکچایا، کیوں کہ یہ ممنوعہ علاقہ تھا اور میں پاکستانی شہری تھا۔ اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کے لئے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے لیکن وہاں کسی قسم کا

پہرہ نہیں تھا اور لوگ بڑے اطمینان سے آجا رہے تھے۔

ریڈیو اسٹیشن ایڈن گارڈن کے احاطے میں رنجی اسٹیڈیم سے بالکل متصل تھا۔ یہ عمارت میرے رہتے ہوئے بہت دن قبل تعمیر ہوئی تھی، لیکن میں نے کبھی اس کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ کلکتہ اسٹیشن سے ہر روز ایک گھنٹے کے لئے "مزدور منڈی" کے نام سے ہندی اردو کا پروگرام نشر ہوتا تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ اردو نشریات کے وقت میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور اب وہاں اردو ادب اور ادیبوں سے متعلق پروگرام، خصوصاً مشاعرے وغیرہ بھی ہوتے رہتے ہیں۔

انیس مجھے لے کر تیسری منزل میں اپنے کمرے میں پہنچے اور چائے کا آرڈر دینے کے بعد بنگلہ زبان کی اناؤنسر پروتیما مکرجی سے میرا تعارف کرایا اور خود میٹنگ میں چلے گئے، میں چونکہ بنگلہ زبان سے واقف تھا اس لئے پروتیما "دی" سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ بنگلہ زبان میں "دی" دراصل "دیدی" (یعنی بہن) کا مخفف ہے اور لوگ عموماً معمر خاتون کے نام کے ساتھ احتراماً "دی" کا لفظ جوڑ دیتے ہیں۔ انیس بھی محترمہ پروتیما مکرجی کو پروتیمادی کہہ کر مخاطب کرتے تھے، چنانچہ میں نے بھی انہیں یہی کہہ کر مخاطب کیا۔ جس سے وہ بہت خوش ہوئیں۔

ادھیڑ عمر کی پروتیما مکرجی عمر میں مجھ سے زیادہ بڑی نہیں تھیں، لیکن میں نے جب انہیں "دی" کہہ کر مخاطب کیا تو وہ بالکل کھل گئیں، اور اس طرح گفتگو کرنے لگیں جیسے ان سے میری بہت پرانی شناسائی ہو۔ میں نے عورتوں کے باتونی ہونے کے بارے میں یوں تو بہت سن رکھا تھا لیکن زندگی میں پہلی بار عورتوں کے باتونی ہونے کا قائل ہو گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے پہلی ملاقات مین ایک اجنبی شخص سے نہ صرف اپنے بارے میں بلکہ اپنے شوہر، اپنے بچوں اپنی ساس، اپنے سسر، حتیٰ کہ اپنے پورے خاندان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے شوہر کا نام اتول کرشنا مکرجی ہے اور میرے خسر دیتندو ناتھ مکرجی آزادی کے بعد کلکتہ میٹرو پولیٹن کارپوریشن کے میئر رہ چکے ہیں۔ اور اس وقت صوبائی کانگرس کے اہم عہدیدار ہیں۔ وہ ملازمت اس لئے کرتی ہیں کہ اپنی آزادی اور معاشی خود مختاری قائم رکھ سکیں اور ساتھ ہی خاندان کی کفالت میں بھی مدد پہنچا سکیں، ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ دوسری شادی کے قابل ہو چکی ہے۔ لیکن اس وقت ایم اے فائنل میں ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد اس کے بھی ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں گے۔ دونوں بیٹے ابھی چھوٹے ہیں اور اسکول اور کالج میں زیر تعلیم ہیں۔

میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا "آپ کو ملازمت کرنے کی کیسے اجازت مل گئی، خانہ داری یا بچوں

کے سلسلے میں دشواری نہیں ہوئی؟،

انہوں نے تفصیل سے جواب دیا "ملازمت کرنے میں میرے شوہر کی رضامندی شامل ہے۔ دراصل میں نے ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھوں گی۔ اس پر وہ رضامند ہو گئے۔ ابتدا میں جب بچے چھوٹے چھوٹے تھے تو دفتر آنے میں قدرے دشواری پیدا ہوئی، لیکن میری ساس نے مجھ سے بڑا تعاون کیا۔ میں جب ڈیوٹی پر ہوتی تو میری ساس بچے کو سنبھالتیں اور ڈیوٹی سے آنے کے بعد میں بچے کو سنبھال لیتی۔"

پروتیمادی نے بتایا کہ "جب بچے بالکل چھوٹے تھے تو میں دفتر میں اپنے نوزائیدہ بچے کے لئے بہت پریشان اور فکر مند رہتی تھی اور دفتر سے بار بار فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھی اور دفتر سے سیدھے گھر روانہ ہو جاتی تھی۔ پھر میں عادی ہو گئی، کیوں کہ میری ساس نے مجھے بچوں کی جانب سے بے فکر کر دیا"

پروتیمادی اس لئے بھی مسلسل بول رہی تھیں کہ میں انیس کا مہمان تھا۔ وہ انیس کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتی تھیں۔ اس لئے وہ باتیں کر کے مجھے "انٹرٹین" کر رہی تھیں کہ ان کے چپ رہنے سے میں کہیں بور نہ ہو جاؤں۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آج کے ہندوستان کے عوام، خصوصاً عورتوں کی حالت کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کرتا رہا اور وہ میرے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیتی رہیں۔ ان سے گفتگو کر کے اندازہ ہوا کہ وہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی بڑی باشعور واقع ہوئی ہیں اور عام خانہ دار یا ملازمت پیشہ عورتوں کی طرح ملکی سیاسیات کے بارے میں محدود معلومات نہیں رکھتیں۔ انہوں نے نہ صرف بنگالی ہندو عورتوں، بلکہ بنگال کی مسلمان عورتوں کے بارے میں بھی اپنی وافر معلومات کا ثبوت دیا۔

انہوں نے بتایا کہ ایک مسلمان خاتون ڈاکٹر آمنہ گوسوامی آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے ہر اتوار کو صحت عامہ پر ٹاک دینے کے لئے آتی ہیں جو بانگور ہسپتال سے وابستہ ہیں۔ آمنہ کا پہلے آمنہ بیگم نام تھا اور وہ کٹر قدامت پسند مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں کلکتہ میڈیکل کالج میں تعلیم کے دوران ان کی سنیل گوسوامی نامی ایک ہم جماعت سے دوستی ہو گئی۔ میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آمنہ نے گھر والوں سے بغاوت کر کے سنیل سے شادی کر لی۔ ان دنوں ہندوستان میں متوسط طبقہ کے ہندو اور مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں شادی بیاہ کا رجحان تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اور گذشتہ چالیس سال کے دوران اس رجحان میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ آمنہ نے جب سنیل سے شادی

گرلی تو انہیں بالکل نئے ماحول سے دوچار ہونا پڑا۔ شوہر کا گھرانہ بہت ہی تعلیم یافتہ، کلچرڈ اور فارورڈ تھا اور سیاسی اعتبار سے بھی بڑا باشعور تھا۔ خاندان کے مختلف افراد مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ دوپہر یا رات کے کھانے کے وقت جب خاندان کے تمام لوگ یکجا ہوتے تو سیاسی محاذ جنگ کھل جاتا اور ایسا محسوس ہوتا جیسے منومینٹ میدان میں سیاسی جلسہ ہو رہا ہے۔ آمنہ جب نئی نویلی دلہن کی حیثیت سے پہلی بار کھانے کی میز پر آئیں تو انہیں یہ سب دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، کیوں کہ وہ جس ماحول سے آئی تھیں وہاں یہ سب ممکن نہ تھا۔ وہاں ماں باپ کے سامنے زبان کھولنا یا ان سے بحث و مباحثے کا تصور ناپید تھا۔ آمنہ گوسوامی کو ابتدا میں تو یہ سب عجیب سا لگا، لیکن بعد میں وہ اس کی عادی ہو گئیں اور انہوں نے خود کو نئے ماحول میں ڈھال لیا۔

پروتیمادی اس وقت تک باتیں کرتی رہیں، جب تک انیس واپس نہیں آگئے۔ انیس کے آتے ہی میں ان کے ساتھ کمرے سے نکل گیا اور ہم دونوں ریڈیو اسٹیشن کی کینٹین میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ڈاکٹر آمنہ گوسوامی کا پتہ حاصل کر لیا تھا۔ تاکہ بطور اخبار نویس ان سے انٹرویو کر کے ان کے اور مغربی بنگال کے بنگالی اور غیر بنگالی مسلمانوں میں رونما ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر لوں لیکن وقت نہ ملنے کے باعث میں ان سے نہ مل سکا۔

مغربی بنگال اسمبلی

انیس رفیع سے رخصت ہو کر میں آل انڈیا ریڈیو کلکتہ کی عمارت سے باہر نکل آیا اور مغربی بنگال اسمبلی کی جانب چل پڑا۔ میں دراصل اولڈ کورٹ ہاؤس اسٹریٹ سے ہوتا ہوا ڈلہوزی اسکوائر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ درمیان میں مجھے مغربی بنگال اسمبلی کی وہ تاریخی عمارت نظر آئی، جہاں میں نے کئی برس روزنامہ "آزاد ہند" کے نامہ نگار کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے تھے اور اب میرے لئے علاقہ ممنوعہ بن چکا تھا، کیوں کہ میں ایک پاکستانی شہری تھا اور مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، حالانکہ اسمبلی کے اندر داخل ہونے اور اسے اندر سے ایک بار پھر دیکھنے کو بڑا جی چاہ رہا تھا۔

میں اسمبلی کے احاطے کے باہر اونچی نیچی آہنی سلاخوں کے باہر سے اسمبلی کی عمارت اور اس کے خوبصورت لان کو حسرت سے دیکھتا رہا اور ماضی میں کھو گیا، یہ وہ عمارت تھی جہاں سے متحدہ بنگال کے مسلم زعما اور رہنمایان قوم نے ملک و قوم کی قیادت کی تھی۔ یہ عمارت یوں تو انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں اپنے نامزد کردہ ارکان کے ذریعے صوبائی نظم، نسق چلانے اور قانون سازی کی غرض سے تعمیر کی تھی لیکن جوں جوں ہندوستانی عوام کو ہوم رولز کے تحت دستوری مراعات حاصل ہوتی گئیں۔ یہ ان کی نمائندہ اسمبلی بنتی گئی اور جب 1935ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستانی عوام کو صوبائی خودمختاری حاصل ہوئی تو ان کے نمائندے منتخب ہو کر وہاں پہنچتے رہے اور اس طرح شیر بنگال فضل الحق، خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی وغرہ قائد ایوان کی حیثیت سے اسی اسمبلی میں پہنچے اور وزرائے اعلیٰ کے فرائض انجام دیئے۔

تحریک آزادی میں بنگال کا جو تاریخی کردار رہا ہے اس سے ساری دنیا واقف ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان میں بھی بنگال، خصوصاً کلکتہ کا کردار کسی اعتبار سے کم نہیں رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور تحریک پاکستان کا سب سے زیادہ

اور اسی صوبے کے دارالحکومت کلکتے میں تھا۔ بنگال میں جب بھی عام انتخابات منعقد ہوئے۔ مسلمان نمائندے اکثریت میں منتخب ہو کر اسی اسمبلی میں پہنچے اور انہوں نے بنگالی عوام کے حقوق اور تحریک پاکستان کے حق میں آواز بلند کی۔

اس اسمبلی نے بڑے بڑے تاریخی واقعات دیکھے ہیں، لیکن قیام پاکستان کے بعد صورتحال بالکل بدل گئی اور پوری اسمبلی میں صرف ایک مسلمان نمائندہ سید بدر الدجیٰ رہ گئے جو آزاد امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ میں "آزاد ہند" کے نمائندے کی حیثیت سے مغربی بنگال اسمبلی میں فرائض انجام دے رہا تھا، اس وقت کانگرس کی وزارت تھی اور پی سی سین صوبائی وزیراعلیٰ تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسمبلی میں اردو اخبارات کے فرف دو نمائندے تھے۔ ایک میں اور دوسرے روزنامہ "عصر جدید" کے ادریس الحق۔ وہ زیادہ تر اسمبلی کے اجلاس کی رپورٹنگ سے گریز کرتے تھے اور مجھ سے تفصیل معلوم کر کے کام چلا لیتے تھے۔ البتہ میں اجلاس کے دنوں میں روز چھے سے آٹھ گھنٹے پریس گیلری میں حاضر رہتا تھا۔ اور اسمبلی اور صوبائی کونسل کی کارروائیاں کور کرتا تھا۔ اس طرح کلکتہ کے انگریزی اور بنگلہ کے رپورٹروں سے میری اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ ہندی کے صرف ایک رپورٹر پانڈے ہوا کرتے تھے جو "وشومترا" کے نمائندے تھے۔ باقی ماندہ رپورٹر بنگلہ اور انگریزی اخبارات سے تعلق رکھتے تھے۔ میں چونکہ بنگلہ زبان سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے بنگالی رپورٹروں سے میری خوب گاڑی چھنتی تھی۔ ایک اردو دان رپورٹر کو بنگلہ صحافت اور بنگلہ ادب سے اتنی گہری دلچسپی لیتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور میری بڑی قدر کرتے تھے لیکن اسمبلی کی رپورٹنگ کے دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے مجھے اپنی اوقات کا شدت کے ساتھ احساس دلا دیا۔

اسمبلی کی رپورٹنگ کے دوران یوں تو کئی بڑے دلچسپ واقعات رونما ہوئے، لیکن ان میں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ ایک واقعہ حزب اختلاف کے رہنما مسٹر جیوتی باسو کے نام وارنٹ کا اجرا ہے۔ آج کے وزیراعلیٰ مغربی بنگال مسٹر جیوتی باسو ان دنوں متحدہ اپوزیشن کے رہنما ہوا کرتے تھے۔ اور کانگرسی حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ ایک دن پی سی سین کی حکومت نے انہیں گرفتار کرنے کے لئے وارنٹ جاری کر دیا۔ اسمبلی کے اجلاس کے دوران مسٹر باسو کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے اجلاس کے اختتام کے بعد اسمبلی کے احاطے میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ اسمبلی کے احاطے سے باہر نکلتے ہی انہیں گرفتار کر لیا جائے گا چنانچہ

انہوں نے اسمبلی کے اندر ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسمبلی کے اندر حزب اقتدار کی طرح حزب اختلاف کے ارکان کے لئے بھی کمرے مخصوص تھے، جن میں کانفرنس روم کے علاوہ ریٹائرنگ رومز بھی تھے چنانچہ جب تک اسمبلی یا کونسل کا اجلاس جاری رہتا، جیوتی باسو اسمبلی ہال میں حزب اختلاف کے لیڈر کے کمرے میں موجود رہتے اور جب اسمبلی کا اجلاس دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو جاتا تو اسمبلی کی لابی میں ان کے لئے بستر لگا دیا جاتا۔ جہاں مسٹر باسو اور ان کے رفقا ءکار استراحت فرماتے اور پارٹی کا کام سرانجام دیتے۔ ان کے لئے خاص طور پر باہر سے کھانا لایا جاتا۔

جمہوری روایت کے مطابق اسمبلی کے تقدس کے پیش نظر پولیس کو اسمبلی کے احاطے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح اخباری فوٹو گرافروں کو بھی اسمبلی کے اندر تصویریں بنانے کی اجازت نہ تھی۔ اسمبلی کے اندر نظم و نسق کے لئے اسمبلی کا اپنا عملہ ہوتا تھا۔ جس کے سربراہ کو سار جنٹ ان آرمز کہا جاتا تھا۔ جیوتی باسو کا گرفتاری سے بچنے کے لئے اسمبلی میں پناہ لینا اخبارات کے لئے بہت دلچسپ واقعہ تھا۔ اس طرح جیوتی باسو نے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ اسمبلی کے اندر گزار دیا تھا۔ جس سے عاجز آکر حکومت نے ان کا پروانہ گرفتاری واپس لے لیا تھا۔ اس پورے عرصے میں اخبار نویس جیوتی باسو کے پاس بیٹھ کر "خبریں" مہیا کرتے رہے۔ جن میں یہ ناچیز بھی شامل تھا۔

اسمبلی میں دوسرا ناخوشگوار واقعہ مجھ ناچیز کے ساتھ پیش آیا جو قطعیؑ نجی نوعیت کا ہونے کے باوجود سیاسی نوعیت کا بھی تھا۔ 1964ء میں مشرقی پاکستان میں ہندو مسلم فسادات کے باعث بنگالی ہندو بڑی تعداد میں بھاگ بھاگ کر مغربی بنگال خصوصاً کلکتے میں پناہ لے رہے تھے، جس کے باعث کلکتہ اور اس کے مضافات میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے تھے۔ ایک روز کلکتہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع بیل گرام میں ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا۔ جس میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ صوبائی حکومت نے اس واقعہ کی خبر کو تین روز تک دبائے رکھا۔ ایک روز میں جب وقت مقررہ پر اسمبلی ہال پہنچا تو وزیر اعلیٰ پی۔ سی۔ سین نے اجلاس شروع ہوتے ہی اعلان کیا کہ تین روز قبل بیل گرام میں ہندو مسلم فساد رونما ہونے کے باعث تین افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے ہیں۔ پی سی سین نے واضح طور پر اعلان کیا کہ مرنے والے تینوں مسلمان تھے اور زخمیوں میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ایک جوٹ مل سے جب شفٹ

ختم ہونے پر مزدور باہر نکل رہے تھے کہ بعض ہندو بلوائیوں نے مسلمان مزدوروں پر حملہ کر دیا تھا۔انہوں نے مرنے والوں کے سوگ میں تعظیماً دو منٹ خاموش کھڑے رہنے کی تجویز پیش کی جو (را منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد اسپیکر نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔

اسمبلی میں یہ اعلان دوپہر بارہ بجے کیا گیا اور ٹھیک ایک بجے ریڈیو پاکستان نے اس سانحے کی اطلاع نشر کر دی میں دوسرے روز جب اسمبلی کا اجلاس کور کرنے اسمبلی پہنچا تو بنگالی رپورٹروں نے شبہ ظاہر کیا کہ بیل گرام کے ہندو مسلم فساد کی خبر میں نے ہی پاکستان قونصل خانے کو پہنچائی ہے ورنہ پاکستان کو اس سانحے کی اطلاع اتنی جلد کیوں کر ملتی۔

میں ان متعصب اور ناسمجھ لوگوں کو کیسے بتاتا کہ پاکستان کو دوسرے ذرائع سے بھی یہ اطلاع مل سکتی ہے۔ اس کے لئے میری طرح فرد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بعد میں جب بھی پریس گیلری میں بیٹھا اجلاس کی کارروائی کا اردو میں نوٹس لے رہا ہوتا۔ ان کی جانب سے یہی سوال کیا جاتا کہ کیا میں پاکستان کو اطلاع بھیج رہا ہوں؟ ہندو رپورٹروں کی جانب سے جب ذہنی اذیت پہنچانے کا سلسلہ ناقابل برداشت ہو گیا تو میں نے اپنے ایڈیٹر سعید احمد ملیح آبادی کو اس کی اطلاع دی۔ وہ بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتے تھے۔

مارچ 1964ء میں کلکتہ کے ہندو مسلم فسادات کے بعد سے میں ہندوستان ترک کر دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کرنے میں پورا ایک سال لگا اور اس کے لئے جن اسباب نے مجھے ترک وطن کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کیا ان میں مغربی بنگال اسمبلی کا مذکورہ واقعہ بھی تھا۔ اب اکیس سال کے بعد میں اپنے آبائی شہر کلکتہ میں اسی صوبائی اسمبلی کے سامنے کھڑا تھا اور ماضی کے سارے واقعات میرے ذہن کے پردے پر متحرک فلم کی طرح گزر رہے تھے، جیسے یہ چند یوم قبل کے واقعات ہوں۔ اس اسمبلی سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں لیکن اب میں ایک اجنبی تھا۔ جس کا اس سے کوئی جذباتی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

کلکتہ پہنچنے کے دوسرے روز میں اپنے دیرینہ دوست شانتی رنجن بھٹاچاریہ سے ملنے کے لئے کیننگ اسٹریٹ اور سی، آئی، ٹی روڈ سے ہوتا ہوا سیدھے ڈلہوزی اسکوائر پہنچا، جو کلکتے کا آج بھی سب سے اہم، مصروف اور بڑا تجارتی مرکز ہے اور جس کی آج بھی وہی اہمیت ہے جو آج سے دو سو سال پہلے تھی۔ اس سے پہلے یہاں پر واقع سارے تجارتی دفاتر انگریزوں کی ملکیت تھے، کیوں کہ وہی ہندوستان کے اصل حکمران تھے اور وہی اصل تاجر، لیکن آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی اور انگریز مالکوں نے اپنے کار خانے، چائے کے باغات اور تجارتی کمپنیاں ہندوستانیوں کو فروخت کر دیں۔ اب اس علاقے پر صرف ہندوستانی سرمایہ داروں کا تسلط ہے اور وہ بھی مارواڑی اور راجستھانی تاجروں اور صنعت کاروں کا۔ یہاں پر واقع دفاتر سے مغربی بنگال، بلکہ پورے ہندوستان کی معیشت پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔

ڈلہوزی اسکوائر کلکتہ کے ان علاقوں میں سے ہے، جسے انگریزوں نے سب سے پہلے آباد کیا۔ دراصل یہ علاقہ دریائے بھاگیرتی (دریائے ہگلی) کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمرشل ایجنٹ جوب چارنگ نے 1697ء میں تیسری اور آخری دفعہ پڑاؤ ڈالا تھا اور پہلی تجارتی کوٹھی تعمیر کی تھی۔ ابتدا میں انگریزوں نے جب اس شہر کو بسایا تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک "ٹاون کلکتہ" اور دوسرا "بازار کلکتہ"۔ شہر کلکتہ کی ایک خاص بات "بازار" ہے، یعنی کلکتہ کے بڑے بڑے محلوں کے نام کے ساتھ کسی نہ کسی بازار کا نام ضرور جڑا ہوا ہے، جیسے بہو بازار، لال بازار، شام بازار، رادھا بازار اور سوا بازار وغیرہ۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ سارے بازار پہلے کھیت تھے اور ان کے مالکان بڑے بڑے ہندو زمیندار تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ انگریزوں نے اپنی مستقل بستیاں آباد کر لی ہیں تو انہوں نے اپنی اپنی زمینوں پر بازار قائم کر لئے، تاکہ مستقل آمدنی کا ذریعہ نکل آئے، انگریزوں نے ان بازاروں (منڈیوں) کو دیکھتے ہوئے شہر کو دو

حصوں میں تقسیم کر دیا، یعنی "ٹاون کلکتہ" اور "بازار کلکتہ"۔ مشرقی بہو بازار سے لے کر مغربی لال دگھی اور بڑابازار تک، یعنی شمالی ہیرسن روڈ سے جنوبی دھرم تلہ اسٹریٹ تک ٹاون کلکتہ تھااور مشرقی حصہ "بازار کلکتہ"

ڈلہوزی کاموجودہ علاقہ ٹاون کلکتے کا حصہ تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے، جہاں سے انگریز سارے شہر، بلکہ سارے ملک پر حکومت کرتے تھے۔ اسی لئے اس علاقے کو "ٹاون کلکتہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ڈلہوزی ہی وہ علاقہ ہے جو تین چھوٹے چھوٹے گمنام گاوں، کلکتہ گوبند پور اور سوتانٹی کے درمیان رفتہ رفتہ نئے دور کے "ٹاون" کی حیثیت سے ابھرا۔ ابتدامیں اس علاقے میں بہت کم لوگ آباد تھے۔ اس علاقے کے آٹھ حصوں میں سے صرف ایک حصے میں لوگ آباد تھے اور باقی ماندہ حصوں میں دھان کی کاشت ہوتی تھی۔

شمالی کلکتہ، جس میں چیت پور کا علاقہ شامل ہے سوتانٹی گاوں میں واقع تھا۔ سوتانٹی میں بھی بہت کم آبادی تھی۔ ایک ہزار سات سو بیگھہ اراضی میں سے صرف ڈیڑھ سو بیگھہ میں لوگ آباد تھے۔ باقی ماندہ حصے میں یا تو کاشت ہوتی تھی یا وہاں باغات اور جنگلات واقع تھے۔ یہ تھا اٹھارویں صدی کا کلکتہ۔ اس وقت "شہر" (سٹی) نام کی کوئی شے وجود میں نہیں آئی تھی۔ البتہ ایک چھوٹا سا "ٹاون" ظہور میں آرہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمرشل ایجنٹ جوب چار نک نے ڈلہوزی کے علاقے میں ہی "قدیم قلعہ" (اولڈ فورٹ) تعمیر کیا تھا، تاکہ "دشمن" کی طرف سے کوئی ممکنہ حملہ ہو تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کی حفاظت کی جاسکے۔ یہ قلعہ اس مقام پر واقع تھا، جہاں اس وقت جنرل پوسٹ آفس قائم ہے اور قلعے کی سرحد لال دگھی یعنی موجودہ ڈلہوزی اسکوائر تک تھی۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس قلعے کو پنج گوشہ (pentgonal) طرز پر تعمیر کرنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ قلعہ جب مکمل ہوا تو اس کے اندر "گورنمنٹ ہاوس" قائم کر دیا گیا۔ انگریزوں نے اسٹرینڈ روڈ پر واقع موجودہ کسٹم ہاوس کے قریب دریا کے کنارے ایک قطار میں مکانات تعمیر کئے تھے انگریزوں کو ابتدا سے بنگال کے حکمران، نواب سراج الدولہ کی جانب سے خدشہ تھا۔ اسی لئے انگریز فوجی افسران جنگی نقطہ نظر سے قلعے کے گرد ونواح میں اونچی عمارتیں تعمیر کرنے کے حق میں نہ تھے۔ انہیں اندیشہ تھاکہ کہیں دشمن ان اونچی عمارتوں کی چھت پر توپ نصب کر کے قلعے پر حملہ آور نہ ہو۔ اس دور میں سوائے دوچار اونچی عمارتوں کے، بہت کم بلند عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جنگ پلاسی سے ایک سال قبل جب نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال

باہر کرنے کے لئے کلکتے پر حملہ کیا تو انہوں نے سب سے پہلے پرانے قلعے کو تباہ کرنے کے لئے ڈلہوزی کے ارد گرد واقع اونچی عمارتوں پر ہی توپیں نصب کیں اور گولے برسا کر پرانے فورٹ ولیم کو منہدم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں اور افسروں نے بھاگ کر اپنے بحری جہازوں میں پناہ لی اور کلکتے سے بھاگ کر بحیرہ بنگال میں اپنے جہازوں کو لنگر انداز کر دیا اور حالات کے ان کے حق میں پلٹا کھانے کا انتظار کرنے لگے۔ آج کے دور کے ڈلہوزی کے علاقے کو دیکھئے اور اٹھارویں صدی کے اس علاقے کے بارے میں سوچئے تو واقعی حیرت ہوتی ہے کہ یہ علاقہ کس طرح ایک بالکل نئے اور جدید شہر کی صورت میں ابھرا۔

میں ڈلہوزی اسکوائر میں پہنچ کر کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور قدیم کلکتے کے اس علاقے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک زمانہ تھا، جب یہ علاقہ، خصوصاً لال دگھی شہر کے خوبصورت ترین اور صاف ستھرے علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ کانگرسی وزارت میں 1965 تک یہ علاقہ بہت کشادہ اور خوبصورت تھا، لیکن اب نہ صرف اسکوائر کے ایک حصے میں بس ٹرمینس قائم کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کی خوبصورتی اور صفائی بھی ختم ہو چکی ہے۔ تالاب کی صفائی نہ ہونے کے باعث اس میں بڑی بڑی آبی گھانس اگ آئی ہے۔ جس کی وجہ سے تالاب جوہڑ میں بدلتا جا رہا ہے۔ میں اس کے ماضی کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے رائٹرز بلڈنگ کی عظیم الشان عمارت کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ حکومت مغربی بنگال کے اس سکریٹریٹ کا (جو 1911 تک برطانوی ہند کا سکریٹریٹ بھی تھا اور جہاں سے سارے ہندوستان پر کنٹرول کیا جاتا تھا) رائٹرز بلڈنگ نام کیوں رکھا گیا؟ میں نے جہاں تک کلکتہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں منشی اور محرر کو رائٹر کہا جاتا تھا، یعنی لکھنے والا۔ لفظ "کلرک" بہت بعد میں ہندوستانی متوسط طبقے کے پیدا ہونے کے بعد استعمال میں آیا۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے تین درجے ہوتے تھے۔ بالکل نچلی سطح پر کام کرنے والے کو رائٹر (writer)۔ اس سے اوپری سطح کے ملازم کو فیکٹر (factor) اس سے اوپر کی سطح پر جونیئر مرچنٹ اور سب سے اعلیٰ سطح کے ملازم کو مرچنٹ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں پہلی بار آنے والے برطانوی تاجر جوب چارنگ بھی مرچنٹ اور ہیسٹنگز بھی پہلے فیکٹر اور پھر ترقی کر کے مرچنٹ بنا اور بالآخر گورنر جنرل بننے میں کامیاب ہوا۔ ان فرنگی ملازموں کو اس وقت کیا مشاہرہ ملتا تھا؟ اس بارے میں اگر آج کے دور کے لوگوں کو بتایا جائے تو انہیں بمشکل یقین آئے گا۔ لارڈ

کلائیو کے عہد میں رائٹر کی تنخواہ پانچ پاونڈ اور سینئر مرچنٹ کی تنخواہ چالیس پاونڈ ہوتی تھی۔ اس کے باوجود کمپنی کا ہر ملازم اس دور میں شاہانہ اور پر تعیش زندگی گزارتا تھا۔ اتنی قلیل تنخواہ میں اتنی آرام دہ زندگی گزارنا کیوں کر ممکن تھا؟ اس کی وجہ کمپنی کے ملازمین کا نجی کاروبار اور رشوت ستانی تھی سرکاری ملازموں میں رشوت کی لعنت آج کے دور کی خصوصیت نہیں ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے وقت سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی، چنانچہ بنگال کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ 1757ء میں جنگ پلاسی کے بعد جب نواب سراج الدولہ کی جگہ میر جعفر کو، 1760ء میں میر جعفر کی جگہ میر قاسم کو اور 65_1764ء میں میر قاسم کی جگہ نظام الدولہ کو بنگال کا نواب بنایا گیا تو اس کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بادشاہ گروں نے ان سے خطیر رقوم بطور رشوت وصول کیں۔ اس طرح انگریز بہادر کے سرکاری ملازمین کا رشوت وصول کرنا طریقہ حکمرانی بن گیا اور پھر جب لارڈ کارنولیس کے زمانے میں بنگال میں زمینداری نظام رائج ہوا تو بھی انگریز حکمرانوں نے رشوت کی صورت میں دونوں ہاتھوں سے خوب دولت بٹوری۔ آج اگر افلاس زدہ بنگالی بابو یا کوئی بھی سرکاری ملازم رشوت وصول کرتا ہے تو کیا غلط کرتا ہے۔

میں خیالات کی رو میں بہک کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

"تو ہاں، اس وقت سے اس سرکاری سکریٹریٹ کا نام جو رائٹرز بلڈ نگ پڑا تو ہمیشہ کے لئے یہ نام رائج ہو گیا۔ اس دوران دنیا بدل گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی جگہ ہندوستان میں سرکار برطانیہ کی براہ راست حکومت قائم ہوئی، لیکن اس کا نام رائٹرز بلڈ نگ ہی رہا۔ البتہ اس دوران رائٹر کا نام بدل کر کلرک ہو گیا۔ پھر لوور ڈویژن کلرک اور اپر ڈویژن کلرک، لیکن رائٹرز بلڈ نگ کا نام بدلنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی، حتیٰ کہ آزاد ہندوستان میں بھی نہیں، جبکہ بہت سی سڑکوں اور شاہراہوں کا نام تبدیل کر دیا گیا ہے۔

میں بنچ پر بیٹھا رائٹرز بلڈ نگ کی گوتھک طرز کی سرخ عمارت کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ وہی عمارت ہے جہاں میں برسوں رپورٹر کی حیثیت سے آیا جایا کرتا تھا۔ میں روز اس عمارت کی تیسری منزل پر واقع پریس کارنر میں ٹھیک تین بجے پہنچ جاتا تھا اور وزیر اعلیٰ مغربی بنگال پی سی سین سے ملنے کا منتظر رہتا تھا۔ دراصل وزیر اعلیٰ نے اخبار نویسوں سے ملاقات کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس لئے تین بجے سینئر رپورٹروں کی معیت میں ہم وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنے کے لئے جاتے تھے اور وزیر اعلیٰ اخبار نویسوں کو اپنی حکومت کے تعمیری اور فلاحی منصوبوں یا دیگر امور کے

بارے میں بریفنگ کرتے تھے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ وزیراعلیٰ کی طرف سے اخبار نویسوں کو روز چائے ضرور پلائی جاتی تھی۔ وزیراعلیٰ اور اخبار نویسوں کے درمیان اتنے گہرے اور خوشگوار تعلقات تھے کہ آج کے تناظر میں اس بارے میں تصور کرنا تک مشکل ہے۔ ان دنوں سابق مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات جاری تھے اور بنگلہ زبان کے ہندو اخبارات، خصوصاً "جوگنتر" اور "آنند بازار پتریکا" نہایت اشتعال انگیز خبریں چھاپ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے ان اخبارات میں ایک روز بہت ہی مبالغہ آمیز خبر شائع ہوئی۔ جس میں بتایا گیا کہ ڈھاکہ میں ایک تالاب ہندوؤں کی لاشوں سے بھر چکا ہے۔ وزیراعلیٰ پی سی سین نے اسی ملاقات میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ انہوں نے اپنے "ذرائع" سے بعض لوگوں کو ڈھاکہ بھیج کر معلومات حاصل کی ہیں اخبارات میں شائع ہونے والی مذکورہ خبر قطعی بے بنیاد ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے روز سوائے میرے اخبار "آزاد ہند" کے کسی بھی زبان کے اخبارات میں یہ خبر شائع نہیں ہوئی، جبکہ تمام اخبارات کے رپورٹر وہاں موجود تھے۔

رائٹرز بلڈنگ اگرچہ حکومت مغربی بنگال کا سکریٹریٹ تھا، لیکن وہاں آمدورفت میں کوئی رکاوٹ یا ممانعت نہیں تھی، خصوصاً اخبار نویسوں کو۔ میں نے اتنے عرصے تک اجازت نامے یا شناخت نامے کے بغیر کام کیا، لیکن آنے جانے میں کبھی کسی نے نہیں روکا۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس سارجنٹ یا کانسٹیبل تمام اخبار نویسوں کو صورت سے پہچانتا تھا اگر کوئی نیا کانسٹیبل کسی اخبار نویس کو روکتا بھی تو صرف لفظ اخبار نویس" کہہ دینا کافی ہوتا تھا۔ صحافی حضرات وزیراعلیٰ کے علاوہ بھی مختلف محکموں کے سکریٹریوں اور اعلیٰ سرکاری حکام سے بلا روک ٹوٹ ملتے اور ان سے خبریں حاصل کرتے تھے۔ سرکاری افسران نہ صرف صحافیوں کا احترام کرتے تھے۔ بلکہ ان سے مکمل تعاون بھی کرتے تھے۔ خواہ وہ کسی بھی زبان کا اخبار نویس کیوں نہ ہو، لیکن بعض افسران عدم تعاون کا بھی مظاہرہ کرتے تھے۔ اس ضمن میں محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر ایس کے ماتھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میرے اخبار "آزاد ہند" نے میرے لئے حکومت کے ایکری ڈیٹنشل کارڈ کے لئے عرصہ ہوا درخواست دے رکھی تھی۔ اس ضمن میں پولیس انکوائری بھی ہو چکی تھی، لیکن مسٹر ماتھر مجھے سرکاری شناختی کارڈ دینے کے حق میں نہیں تھے، کیوں کہ ان کے خیال میں میرا کردار "مشتبہ" تھا۔ میں جب تک ہندوستان میں رہا۔ مجھے اس شخص نے شناختی کارڈ جاری نہیں کیا۔

میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن رائٹرز بلڈنگ میں داخل ہونے سے

قدرے ہچکچا رہا تھا۔ حالانکہ میں یہاں کئی بار آچکا تھا اور یہاں کے ہر گوشے سے اچھی طرح واقف تھا لیکن یہ ماضی کی باتیں تھیں اس وقت میں ہندوستانی تھا، لیکن اب میں پاکستانی شہری تھا اور رائٹرز بلڈنگ کو نکسل باڑی تحریک کے بعد سیکورٹی زون قرار دیا جا چکا تھا۔ چنانچہ میں سب سے پہلے دفتر استقبالیہ پہنچا اور وہاں داخلے کے لئے پاس بنوایا اور شانتی رنجن سے ملنے کے لئے محکمہ اطلاعات کے دفتر میں پہنچا جہاں وہ ملازم تھا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ میرا بڑا گہرا دوست تھا اور ہم دونوں ہفتے میں کم از کم پانچ روز ضرور ملتے تھے۔ کبھی امجدیہ ہوٹل میں، کبھی صابر ریسٹوران میں، کبھی کسی ادبی نشست میں، کبھی مشترکہ دوست اصغر حسین کے چارمنگ پریس میں اور کبھی اس کے دفتر واقع رائٹرز بلڈنگ میں۔ شانتی کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ نیا نیا حیدر آباد سے کلکتہ آیا تھا اور ادبی حلقوں میں بحیثیت افسانہ نگار متعارف ہوا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ بنگالی ہوتے ہوئے وہ اردو کا افسانہ نگار کیسے ہے۔ اس سے قبل میں اردو کے صرف ایک بنگالی افسانہ نگار کو جانتا تھا۔ وہ تھا بسنت کمار چٹرجی۔ جو تھا تو بنگالی، لیکن لکھنؤ میں پیدا ہونے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اردو سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے لڑکپن سے ہندی اور انگریزی کے ساتھ اردو بھی سیکھ لی تھی اور آگے چل کر وہ اردو صحافت سے وابستہ ہو گیا تھا اور گاہے گاہے افسانے بھی لکھتا تھا۔ شانتی رنجن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کے والد بوئے کنٹھو بھٹاچاریہ نظام اسٹیٹ ریلوے میں گارڈ تھے۔ چنانچہ اس کی پیدائش بھی حیدر آباد (دکن) میں ہوئی تھی۔ اس نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ لڑکپن اور جوانی اردو ماحول میں گزاری، افسانہ نویسی حیدر آباد میں شروع کی اور ان کے والد جب ریٹائر ہو کر کلکتہ آگئے تو وہ بھی ان کے ساتھ یہاں آگیا۔ شانتی اس وقت تک افسانہ نگار بن چکا تھا۔

شانتی سے میری اکیس سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں بہت تپاک سے ملے اور بہت دیر تک ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے اور مشترکہ دوستوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے میں نے شانتی سے کہا کہ وہ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتائے تاکہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ اردو کے بنگالی مصنف کی حیثیت سے اس کے ادبی، علمی اور تحقیقی کاموں کے بارے میں لکھنا مجھ پر فرض ہے۔

شانتی نے بتایا "میں 1930ء میں فرید پور (موجودہ بنگلہ دیش) کے گاؤں بھوجیشور میں پیدا ہوا۔ میرے والد ملازمت کے سلسلے میں ریاست حیدر آباد منتقل ہو گئے، جہاں میں نے 1948ء میں میٹرک

کیا۔ اس کے بعد محبوب کالج میں داخلہ لیا۔ میں نے ادبی کیریر کا آغاز 46 ء میں کیا۔ ابتدا میں افسانے لکھتا رہا۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران میں نے مختلف اوقات میں روزنامہ "پیام" اور روزنامہ "سیاست" میں کام کیا۔ اس کے علاوہ مسلم ضیائی کینگرانی میں ان کے رسالے "ستارے" سے بھی وابستہ رہا۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "راہ کا کانٹا" 46 ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد۔ طویل افسانہ "شاعر کی شادی" اس کے بعد میں نے عبدالغفار خاں کی سوانح عمری لکھی۔ میری سب سے اہم کتاب "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" 66_65 ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے "بنگال میں اردو زبان، ادب" اقبال، ٹیگور اور نذرلاسلام "(تین شاعر۔ ایک مطالعہ)" غالب اور بنگال" "اردو ادب اور بنگالی" "مختصر تاریخ بنگلہ ادب" وغیرہ۔ میری بیس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں"۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور بنگال میں اردو زبان و ادب اور صحافت کے بارے میں بنیادی نوعیت کی جو تحقیقات کی ہیں، وہ بڑی گراں قدر ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے اسے ردبندر ناتھ ٹیگور انعام کے علاوہ حکومت ہند اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال کی اکادمیوں کی جانب سے متعدد انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔ اسے 1967 ء میں اورنٹیل کالج بمبئی کی جانب سے بنگال میں انیسویں صدی تک اردو میں شائع ہونے والی کتابوں پر تحقیقی کام کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل ہو چکی ہے۔ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس نے اسے برصغیر کے اردو ادب میں منفرد مقام پر فائز کر دیا ہے۔ شانتی کا ایک اہم کارنامہ ہندوستان کے معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی اور شوکمار سین کی بنگلہ تصانیف کا اردو میں ترجمہ اور راجندر سنگھ بیدی کے ناول "ایک چادر میلی سی" کا بنگلہ میں ترجمہ ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بتایا کہ وہ ایک کام کے سلسلے میں ایشیاٹک سوسائٹی جا رہا ہے۔ اگر میں وہاں جانا چاہوں تو اس کے ساتھ جا سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی برصغیر کے اس عظیم اور تاریخی ادارے کو دیکھنے کا مشتاق تھا، چنانچہ میں فور چلنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور ہم دونوں بس پر پارک اسٹریٹ پہنچ گئے۔

کلکتہ سے روانہ ہونے سے قبل میں ایک دفعہ پھر شانتی سے ملنے رائٹرز بلڈنگ گیا۔ وہاں اتفاق سے بنگلہ دیش کے مشہور افسانہ نگار شام پارک پوری بھی موجود تھے۔ میں شام سے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے وقت سے واقف تھا، چنانچہ ہم تینوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش

ہوئے۔ ہم تینوں برصغیر کے تین آزاد اور خود مختار ممالک سے تعلق رکھتے تھے، یعنی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے۔ شام ہندوستان کی سیاحت کے لئے آیا ہوا تھا اور ابھی ابھی کشمیر کی سیاحت سے واپس لوٹا تھا۔ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مابین اچھے تعلقات ہونے کے باعث دونوں ملکوں کے شہریوں کو پولیس رپورٹ نہیں کرنی پڑتی تھی۔ صرف ویزا سے کام چل جاتا تھا اور بنگلہ دیش اور ہندوستان کے شہری ایک دوسرے کے ملک میں کہیں بھی بلا روک ٹوک جاسکتے تھے اسی لئے شام بڑی آزادی سے جموں اور کشمیر کی سیر کر آیا تھا، جبکہ پاکستان اور ہندوستان کے شہریوں کو یہ آزادی حاصل نہیں تھی۔ پاکستانیوں کا کشمیر میں داخلہ قطعی ممنوع تھا اور ہندوستان میں بھی صرف چار جگہوں پر جانے کی اجازت تھی اور وہ بھی پہنچتے ہی 48 گھنٹے کے اندر قریب ترین پولیس سٹیشن میں اپنی آمد کی اطلاع دینی ضروری تھی۔

شام کے پاس کیمرہ تھا اور وہ ہم لوگوں کی تصویر لینے کے لئے بے چین تھا، لیکن رائٹرز بلڈ نگ کے اندر تصور اتارنے پر پابندی تھی، چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم تینوں ڈلہوزی اسکوائر میں جا کر تصویریں بنائیں گے، لہذا ہم تینوں روانہ ہو گئے اور جنرل پوسٹ آفس کے پس منظر میں متعدد یادگار تصاویر بنوائیں۔

ظفر اوگانوی

پاکستان سے روانہ ہونے سے قبل میں نے کلکتہ میں جن لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان میں ظفر اوگانوی بھی شامل تھے۔ میں ظفر اوگانوی سے بحیثیت افسانہ نگار تو واقف تھا، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد بھی ہیں۔ اس کی اطلاع مجھے علی حیدر ملک نے دی جو ان کے بڑے گہرے دوست تھے اور انہوں نے پٹنہ میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی چنانچہ میں ستیہ جیت رائے سے ملنے کے بعد ٹیکسی پر سیدھے ان کے مکان واقع شمس الہدیٰ روڈ پہنچا، جو ہوٹل ہندوستان انٹرنیشنل سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ میں نے روانگی سے قبل ان سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھے، چنانچہ میں نے ان کی اہلیہ کو اطلاع دے دی تھی کہ میں ان سے ملنے کے لئے آرہا ہوں۔

میں جب ان کے ہاں پہنچا تو وہ اتفاق سے موجود تھے۔ شمس الہدیٰ روڈ، کلکتہ کے مسلمانوں کا قدیم محلہ ہے۔ ظفر اوگانوی ایک کثیرالمنزلہ عمارت کی نچلی منزل میں رہتے تھے۔ دستک دیتے ہی ایک باریش نوجوان نے دروازہ کھولا۔ وہ لنگی اور قمیض میں ملبوس تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے فوراً پہچان لیا اور اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئے۔ گھر کلکتہ کے متوسط طبقہ کے مکانوں کی طرح قدیم طرز کے سازوسامان سے آراستہ تھا۔

ظفر اوگانوی کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ وہ اتنے معمر نہیں ہیں۔ جتنے داڑھی کی وجہ سے نظر آرہے ہیں۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور پھر ان کے ہاتھ میں ان کے دیرینہ دوست علی حیدر ملک کا وہ خط تھما دیا جو میں پاکستان سے ان کے نام لایا تھا۔ پھر ان سے بہت ساری ادبی اور غیر ادبی باتیں ہوئیں۔ میں نے انہیں اپنی کتاب "جدید اردو افسانہ" پیش کی۔ اس کے عوض انہوں نے مجھے اپنی کئی کتابیں دیں جن میں ان کی ڈاکٹریٹ کی تھیس، "صفیر بلگرامی حیات اور کارنامے" پیش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو کتابیں دیں ان میں صفیر بلگرامی۔ بحیثیت غزل گو" اور رموز اقبال" شامل

ہیں۔

ظفر اوگانوی کا شمار اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ 1960ء کی دہائی میں جن لوگوں نے نئے طرز کی افسانہ نگاری شروع کی ان میں وہ بھی شامل ہیں۔ وہ بہار کے ان جدید افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے بہت کم مدت میں اپنا مقام بنایا۔ نئے دور کے رسالوں میں "اقدار" پٹنہ ایک اہم رسالہ تھا۔ یہ رسالہ "شب خون" الہ آباد کے ساتھ نکلنا شروع ہوا جب جدیدیت کی آندھی نے اردو ادب، خصوصاً اردو افسانے کی دنیا میں حشر برپا کر رکھا تھا اور ہر جانب جدیدیت کی مخالفت میں کمٹ و مباحثہ جاری تھا۔ ظفر اوگانوی بھی اس رسالہ کے نکالنے والوں میں شامل تھے۔ اس دور میں انہوں نے جو افسانے لکھے۔ وہ ان کے افسانوں کے مجموعے "بیچ کا ورق" میں شامل ہیں۔ یہ ان کی طالب علمی کا آخری زمانہ تھا۔ اس کے بعد وہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت استاد شامل ہو گئے۔ جس کے بعد وہ پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت تنقید و تحقیق کی جانب مائل ہو گئے اس طرح وہ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ناقد اور محقق تو بن گئے لیکن افسانہ نگاری چھوٹ گئی۔ اب وہ بہت کم افسانے لکھتے ہیں۔

ش۔ مظفر پوری

کلکتہ پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے بزرگ افسانہ نگارش مظفر پوری کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ تو سنا تھا کہ وہ کلکتے کے کسی شام کے اخبار سے وابستہ ہیں، لیکن کس اخبار سے وابستہ ہیں، معلوم نہ تھا۔ میں نے کلکتہ کے صحافتی حلقوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ پٹنہ گئے ہوئے ہیں پٹنہ میں احمد یوسف اور دوسرے لوگوں سے معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ گئے ہوئے ہیں ۔ مجھے ان سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دن وہ رات نو بجے میرا پتہ پوچھتے ہوئے میری قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ میں بہت خوش ہوا اور ساتھ ہی شرمندہ بھی دراصل مجھے خود ان کے پاس جانا چاہئے تھا لیکن یہ ان کا خلوص تھا جو انہیں میرے گھر پر لے آیا۔

ان سے مل کر اور ان کے خلوص کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ وہ میرے بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا شمار 37ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دور میں افسانہ نگاری شروع کی جب آج کے دور کے بہت سے سینئر افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری شروع نہیں کی تھی، لیکن ان کا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے ثقہ ادبی رسالوں میں کبھی نہیں لکھا اور لکھا بھی تو زیادہ تر دوسرے اور تیسرے درجے کے ادبی جریدوں میں۔ انہوں نے روپے کی خاطر فلم لائٹ، شمع اور بیسویں صدی جیسے خالص کمرشیل رسالوں میں لکھنا پسند کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ادبی حلقوں نے ان کی افسانہ نگاری کی جانب توجہ دی اور نہ ناقدروں نے اور پھر ادبی مرکز سے دور رہنے اور ادبی گروہ بندیوں سے گریز کرنے کے باعث بھی انہیں ثقہ ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل نہیں ہوئی، وہ پیشے کے اعتبار سے اخبار نویس ہیں۔ وہ نوجوانی سے ہی اخبارات سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں انہوں نے متعدد ناول لکھے، لیکن ان کے تمام ناول "رومانی دنیا" جیسے گھٹیا درجہ کے غیر ادبی ناشروں نے بہت ہی خراب شائع کئے۔

میں نے ان کے متعدد افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کی بنیادی خوبی یہ تھی کہ انہیں کہانی بیان کرنے کا فن آتا تھا۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا اور وہ انسانی نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی ایک خوبی کردار نگاری بھی تھی اور وہ سماجی شعور بھی رکھتے تھے۔ ان میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ اس کے باوجود وہ ثقہ ادبی حلقوں میں زیادہ مشہور نہ ہوئے تو اس کی پہلی اور واحد وجہ خالص ادبی رسالوں میں عدم اشاعت ہے ان کی ادبی زندگی چار ادوار پر مشتمل ہے پہلا دور 37ء سے 41ء تک ہے۔ یہ ان کی ریاضت کا زمانہ ہے۔ ان کا دوسرا دور 42ء سے 47ء تک پر محیط ہے اس دور میں وہ کلکتہ کے اخبارات سے وابستہ ہو کر مقامی رسالوں میں لکھتے رہے اس دوران انہوں نے آزادی کی جدوجہد میں بھی حصہ لیا۔ ان کا تیسرا دور 48ء سے شروع ہو کر 58ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس دوران انہوں نے تقسیم ملک اور فسادات سے متاثر ہو کر کئی عمدہ افسانے لکھے۔ ان کا چوتھا دور 55ء سے لے کر 74ء تک پر محیط ہے۔ انہوں نے اس دور میں چار ناول اور 125 سے زیادہ افسانے لکھے۔

ان کا پہلا ناول 48ء میں "فرحت" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا ناول "چاند کا داغ"، 56ء میں رومانی دنیا (الہ آباد) میں، تیسرا ناول "ہزار داستانیں" 56ء میں، چوتھا ناول "کھوٹا سکہ" 61ء میں ماہنامہ "صنم" پٹنہ نے شائع کیا۔ ان کا ایک ناول "گرم راکھ" ابھی تک غیر مطبوعہ ہے جو انہوں نے مینا کماری کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ ابھی تک ان کے افسانوں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 76ء میں "حلالہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کے دیگر مجموعے "آوارہ گرد کے خطوط" "کڑوے گھونٹ، لڑکی جوان ہو گئی، دکھتی رگیں، دوسری بدنامی، اور نشی ڈرائنگ کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے افسانوں کی مجموعی تعداد ایک سو پچیس سے زیادہ ہے۔ وہ ابھی تک نہیں تھکے اور آج بھی افسانے اور ناول لکھ رہے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو کے ثقہ نقادوں نے اگرچہ انہیں قابل اعتنا تصور نہیں کیا۔ لیکن ان کے افسانے چار سال تک میتھلا یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل رہے۔ ان پر رانچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر احمد سجاد کی نگرانی میں حسن رضا "ش، مظفرپوری۔ حیات اور افسانے" اور مصطفیٰ کمال متھیلا یونیورسٹی سے "ش، مظفرپوری کے ناول" کے عنوان سے، ڈاکٹریٹ کے مقالات لکھ چکے ہیں۔ بہار اردو اکیڈمی ان کے 16 افسانوں کا انتخاب "واردات" کے عنوان سے شائع کر رہی ہے۔ ان کے ہم عصر لکھنے والوں میں یونس احمر، افسر ماہ پوری اور شہدا امام شامل ہیں۔

ش مظفر پوری بھائی سے میں نے زیادہ تر ان کے بارے ہی میں باتیں کیں تاکہ میں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکوں، میں حیران تھا کہ پچاس سال تک مسلسل افسانے اور ناول لکھنے کے باوجود یہ شخص اتنا مشہور کیوں نہیں ہے جتنا ان سے دس گنا کم صلاحیت رکھنے والے افسانہ نگار محض اس لئے مشہور ہیں کہ وہ ادبی رسالوں میں لکھتے ہیں اور ادبی حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں. مشہور ادیبوں، نقادوں اور مدیران جرائد سے خط و کتابت کرتے ہیں اور ان سے دوستیاں گانٹھتے پھرتے ہیں۔ ش بھائی حقیقی معنوں میں درویش صفت ہیں اور صلہ کی خواہش اور ستائش کی تمنا سے دور رہ کر لکھنے پڑھنے والے ہیں انہوں نے آج کے دور کے ادیبوں کی طرح نہ اپنے اوپر مضامین لکھوائے اور نہ جھوٹی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

وہ بہت دیر تک میرے اور ان کے پرانے دوستوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میرے ہندوستان جانے سے قبل وہ بہار اردو اکیڈمی کے سہ ماہی جریدہ "زبان و ادب" کے مدیر تھے، لیکن کلیم الدین احمد کے بہار اردو اکیڈمی کی باگ ڈور سنبھالتے ہی انہیں برطرف کر دیا گیا لیکن ان کے انتقال کے بعد انہیں پھر "زبان و ادب اور مدیر بنا دیا گیا تھا۔

اشک امرت سری

میں اس دفعہ کلکتہ گیا تو ذکریا اسٹریٹ میں واقع اس بستی کو بھی دیکھنے کے لیے گیا جہاں کسی زمانے میں کلکتے کی اصطلاح میں "کھولا باڑی" ہوا کرتی تھی، یعنی کھپریل کے بنے ہوئے کچے مکانات۔ یہاں کلکتہ کے غریب غربا رہتے تھے۔ اسی جگہ مشہور شاعر اشک امرت سری کا مطب ہوا کرتا تھا اور یہاں ہر روز شام کے وقت ان کے ادیب دوست و احباب اکٹھا ہوا کرتے تھے، جن میں، یعقوب عارف (ہوشیار پوری) فاتح فرخ اور احسان دربھنگوی وغیرہ شامل ہیں۔ اشک امرت سری کا تعلق یوں تو امرت سر سے تھا، لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں گزرا۔ اسحاق امرت سری ان کے بڑے بھائی تھے۔ وہ بھی شاعر وادیب تھے اور اختر حسین رائے پوری کے دوست اور ہم عصر تھے۔ اشک امرت سری یوں تو ایک عرصے سے شاعری کر رہے تھے، لیکن انہیں عوام الناس سے متعارف کرانے کا سہرا انجمن ترقی پسند مصنفین کلکتہ کے سر بندھتا ہے۔

اشک امرت سری صحیح معنوں میں عوامی شاعر تھے۔ وہ عوام میں سے ابھرے اور وہ اپنی شاعری میں عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے رہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے کوئیک تھے، جسے ہم عام اصطلاح میں نث پتھیہ معالج یا سڑکی حکیم کہتے ہیں۔ وہ لڑکپن میں گھر سے فرار ہوئے اور مختلف قسم کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد حکمت کا پیشہ اختیار کر لیا اور جڑی بوٹیوں کے ذریعے غریبوں کا علاج کرنے لگے۔ وہ سند یافتہ حکیم یا طبیب نہ تھے، لیکن اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ انہوں نے ذکریا اسٹریٹ کی اسی "کھولا باڑی" میں اپنا ایک چھوٹا سا مطب قائم کر لیا تھا۔ شاعری، لڑکپن سے ان کی جان کے ساتھ لگی ہوئی تھی، چنانچہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں پختگی آتی گئی اور وہ نظیر اکبر آبادی کے رنگ میں عوامی موضوعات پر بہت عمدہ نظمیں کہنے لگے۔

کلکتہ میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا شہرہ ہوا تو وہ بھی انجمن کی نشستوں میں باقاعدگی سے آنے

لگے اور ان کی پہلی نظم نے ہی پرویز شاہدی، مظہر امام، مظہر انصاری، سالک لکھنوی، عارف ہوشیار پوری وغیرہ کا دل موہ لیا اور ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ کلکتہ کے ترقی پسند مصنفین نے ان کی اس لیے بھی دل کھول کر پذیرائی کی کہ انہیں ان کی پسند کا شاعر مل گیا تھا جو عوامی لب و لہجے میں عوام سے باتیں کرتا تھا۔ دوسرے ترقی پسند ادبا، شعراء کا تعلق متوسط طبقے کے پڑھے لکھے گھرانے سے تھا اور وہ عوام کی سطح پر اتر کر ان کے لب و لہجے میں شاعری کرنے سے قاصر تھے، جبکہ اشک امرت سری قطعی عوامی شاعر تھے، چنانچہ کلکتہ کے ترقی پسندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ انجمن کی نشستوں کے علاوہ ٹریڈ یونینوں اور عوامی جلسوں میں بھی نظمیں پڑھنے لگے۔ انہوں نے رکشا مزدوروں، فٹ پاتھ پر دکان لگانے والوں اور کارخانے کے مزدوروں کی زندگی پر کئی بہت دل آویز نظمیں کہیں اور انہوں نے جب صنعتی مزدوروں کے علاقوں میں منعقدہ عوامی مشاعروں میں ہزاروں کے اجتماع میں یہ نظمیں سنائیں تو ان کی مقبولیت میں دن دوگنا اور رات چوگنا اضافہ ہو گیا اور وہ کلکتہ کے نہایت مقبول عام شاعر شمار کئے جانے لگے۔ وہ انگریزی سے زیادہ واقف نہیں تھے، لیکن وہ اردو، عربی اور فارسی میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور انہوں نے یہ صلاحیت مطالعے کے ذریعے حاصل کی تھی۔ انہیں اس عہد کا نظیر کہا جا سکتا تھا۔ افسوس، انہیں کوئی بڑا اور اہم نقاد نہیں ملا جو انہیں ادبی حلقوں سے متعارف کراتا۔ دلی، لکھنو اور لاہور جیسے اہم ادبی مراکز سے دور رہنے اور مؤقر ادبی رسائل میں کم چھپنے کی وجہ سے بھی انہیں ادب میں وہ مقام نہیں ملا۔ جس کے وہ مستحق تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کی چند نظمیں "شاہراہ (دہلی)"۔ "تہذیب" (پٹنہ) اور ہفت روزہ "اجالا" (کلکتہ) میں شائع ہوئیں۔ وہ بھی ان کے عقیدت مندوں کی کوششوں سے۔ عین اس وقت جب ان کی شاعری نقطۂ عروج پر تھی۔ سرطان کے موذی مرض نے انہیں آن دبوچا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ان کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اخبارات میں جب ان کی علالت کی خبر شائع ہوئی۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اخبارات نے ان کے علاج کے لیے عطیات دینے کی اپیل کی ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے چند ہفتوں میں ہزاروں روپے جمع ہو گئے۔ عطیات دینے والوں میں زندگی کے ہر شعبہ کے لوگ شامل تھے۔ ان میں سب سے بڑی رقم "رکشا مزدور یونین" نے دی تھی۔ کیوں کہ اشک امرت سری (مرحوم) نے رکشا چلانے والوں کی زندگی پر، "ٹن۔ ٹن۔ ٹن" کے عنوان سے ایک بہت ہی عمدہ اور دل گداز نظم لکھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ہفت روزہ "اجالا" نے ان کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ان کی بستی کب کی اجڑ چکی ہے۔ اس کی جگہ نئے اور فلک بوس مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔ کاش کوئی ان کی یاد میں یادگار قائم کرتا، لیکن کون کرتا؟ وہ کوئی بہت دولت مند اور صاحب ثروت شخص نہیں تھے۔ جن کی یاد میں سڑکوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ وہ بہت ہی غریب اور گمنام شاعر تھے۔ جن کے نام سے کلکتہ کے ادیبوں اور شاعروں کی نئی نسل بھی واقف نہیں ہے۔

میں خاموشی سے سر جھکا کر لوٹ آیا اور دل ہی دل میں انہیں ہدیہ عقیدت پیش کیا۔

سالک لکھنوی

کلکتہ کی ادبی دنیا میں سالک لکھنوی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ لوگ ان کی شخصیت کو پسند کریں یا نہ کریں اور ان کے ادبی اور سیاسی نظریات سے اتفاق کریں یا اختلاف۔ انہیں کسی اعتبار سے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ میں اس دفعہ جب کلکتہ گیا تو ان سے ملنا ضروری تصور کیا، لیکن ان کا شام کا اخبار "آبشار" بند ہو جانے کی وجہ سے ان سے دفتر میں نہ مل سکا اور ان کے نئے پتے سے واقف نہ ہونے کے باعث میں ان کے گھر حاضر نہ ہو سکا۔ ان سے میری ملاقات کلکتہ یونیورسٹی کے اس سیمی نار میں ہوئی جو فیض احمد فیض کے بارے میں تھا اور جس میں میں مہمان خصوصی اور وہ صدر تھے۔

ان سے مل کر میں بہت خوش ہوا اور میری دلی مراد بر آئی۔ میں نے ان سے فوراً ان کے نئے مکان کا پتہ لے لیا اور دوسرے روز حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ سالک لکھنوی اگرچہ روزنامہ "آبشار" اور ہفت روزہ "آثار" کے ایڈیٹر اور مالک رہ چکے تھے، لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور وہ بھی غزل گو۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ نثر بھی لکھتے تھے اور طنز و مزاح بھی، لیکن انہیں شاعری سے عشق تھا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "بے سرو پا" شائع ہو چکا ہے۔ انہیں مشاہیر شعراء کے اشعار کی تشریح و تفسیر سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے میر، غالب، سودا، مومن، حالی، حسرت، اقبال اور فانی سے لے کر مظہر امام۔ اعزاز افضل اور شاہین بدر تک کے اشعار کی بڑی خوب صورت تشریح لکھی ہے جو "دس شعر" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے 60ء کی دہائی میں ان کے روزنامہ "آبشار" اور ہفت روزہ "آثار" میں ابراہیم ہوش کی نگرانی میں کئی سال کام کیا تھا اور وہ ایک اعتبار سے میرے باس بھی تھے، لیکن ان میں اس قدر عجز و انکساری تھی کہ میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی انہیں باس تصور نہیں کیا۔ وہ

ہر ایک سے محبت اور عجز کے ساتھ ملتے تھے اور اس کے دل پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے تھے۔ ان کا کلیر نگ اینڈ فارورڈ نگ کا کاروبار تھا اور وہ مصیبت میں گرفتار اپنے دوست ادیبوں اور شاعروں کی خاموشی کے ساتھ مدد کرتے رہتے تھے، لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ وہی دوست واحباب ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے۔

وہ تقریباً 57 سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی پہلی نظم 1932 ء میں رسالہ "آئینہ" کلکتہ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کا پہلا افسانہ 1933 ء کے ماہنامہ "ندیم" گیا میں شائع ہوا۔ صرف اسی سے ان کی ادبی عمر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ادیب، عالمگیر، نیر نگ خیال، ہمایوں، ادبی دنیا، خیام، کلیم، ساقی، پنچ، ریاست اور ندیم وغیرہ میں لکھتے رہے، لیکن بے قاعدگی سے اور بہت زیادہ وقفے سے لکھنے کی وجہ سے وہ قارئین کے ذہن پر کوئی نقش نہ چھوڑ سکے۔ اس کی ایک وجہ بیک وقت کئی میدانوں میں طبع آزمائی بھی ہے۔ اس وقت اگرچہ ان کی عمر 77 کے لگ بھگ ہے۔ ان کا سن پیدائش 16 نومبر 1913 ء ہے لیکن وہ بہت ہی صحت مند اور چاک و چوبند ہیں۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔ وسیم ریاض (مصور) سلیم ریاض (فوٹو گرافر) شمیم ریاض اور کلیم ریاض۔ ان کے سارے صاحبزادے اپنے نام کے ساتھ کپور کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کو ایک ماہر مجسمہ ساز کی طرح اپنے ہاتھوں سے گڑھا ہے۔ وہ ان کے کام اور صلاحیت سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

میں جب ان سے ملنے کے لیے سو تارکن اسٹریٹ میں واقع ان کے مکان پر گیا تو اتفاق سے وہ اتوار کا دن تھا اور وہ گھر پر موجود تھے۔ میں پہلے تو بہت حیران ہوا کہ یہ تو پنجاب کلب کا دفتر تھا، جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفت روزہ نشستیں ہوتی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس فلیٹ کو رہائش کی غرض سے لے لیا ہے اور اب وہ وہیں رہائش پذیر ہیں۔ ان کا ملازم مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا (جو ڈرائنگ روم سے زیادہ کانفرنس روم لگ رہا تھا۔ کیوں کہ وہاں صرف کرسیاں اور میز تھی) تھوڑی دیر میں وہ تشریف لائے اور حسب عادت بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی۔ پرانے دنوں کی خوب باتیں ہوئیں۔ پرانے دوست واحباب کا تذکرہ رہا۔ پھر پرویز شاہدی، مظہر امام اور ابراہیم ہوش کا ذکر نکل آیا۔ پھر انہوں نے اپنے بچوں کے بارے میں نہایت فخر کے ساتھ بتایا کہ ان کا بڑا بیٹا وسیم ریاض مصور ہے اور ان کا ایک بیٹا سلیم ریاض پروفیشنل فوٹو گرافر۔

میں نے ان کے مصور بیٹے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اجازت لے کر اندر گئے اور وسیم کو اپنے ساتھ لے کر حاضر ہوئے۔ میں نے ان کے تمام بچوں کو لڑکپن میں دیکھا تھا، لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ

یہ تمام بچے اتنے بڑے ہو چکے ہوں گے۔ واقعی! وقت کی رفتار کتنی تیز ہے! سالک لکھنوی اور وسیم ریاض مجھے اندر کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں دیواروں پر وسیم کی بڑی بڑی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وسیم بلاشبہ ایک ذہین مصور تھے اور ان کی تصویروں کی انفرادی نمائش ہو چی منہ سرنی (ہیرینگٹن اسٹریٹ) میں ہو چکی تھی۔ وہ 1951ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ انڈین کالج آف آرٹس اینڈ ڈرافٹ مین شپ سے فائن آرٹس میں فرسٹ کلاس ڈپلوما حاصل کیا اور کلکتہ کے مصوروں کی سوسائٹی میں شامل ہو کر بڑا نام پیدا کیا۔ 70-1969 اور 1974ء میں ان کی تصویروں کی انفرادی نمائش ہوئی۔ علاوہ ازیں انہوں نے 1971ء میں کلکتہ میں تین مصوروں کی اور 83-82ء میں سوئیڈین میں چار مصوروں کی اجتماعی نمائش میں بھی حصہ لیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی تصاویر للت کلا اکیڈیمی (نئی دہلی) برلا اکیڈیمی مغربی بنگال اسمبلی ہاؤس اور ایران سوسائٹی (کلکتہ) اور دیگر تجارتی اداروں کی تصاویر کے کلیکشن میں شامل کی گئیں۔ علاوہ ازیں سوئیڈن، سوئٹزرلینڈ۔ فرانس۔ مغربی جرمنی۔ پولینڈ۔ روس۔ برطانیہ۔ امریکہ۔ ایران۔ بنگلہ دیش اور جاپان کی تصاویر کی کلیکشن میں بھی شامل کی گئیں۔ اس ہونہار نوجوان مسلمان آرٹسٹ سے مل کر بلاشبہ خوشی ہوئی۔ ہندوستان میں ایم۔ ایچ۔ حسین کے بعد ہی وسیم ریاض کپور نے اتنا نام پیدا کیا ہے ورنہ فن کے اس شعبے میں مسلمان تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔

نشاط الایمان

کلکتہ پہنچتے ہی میں اپنے جس دوست سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا، وہ نشاط الایمان تھا۔ نشاط الایمان ایک خاموش طبع، کم سخن، شریف النفس اور گوشہ نشین افسانہ نگار ہے اور میں اس کی شرافت، انکساری اور خلوص کی وجہ سے اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ قیام پاکستان سے بہت پہلے تقریباً 1945ء سے افسانہ لکھ رہا ہے۔ جب کلکتہ کی ادبی دنیا پر ش مظفر پوری، افسر ماہ پوری، یونس احمر اور شیدا کیوری (شیدا امام) جیسے افسانہ نگار اور پرویز شاہدی جیسے شاعر چھائے ہوئے تھے اور ہفت روزہ "نقاش" کے مدیر اور مالک یونس نظری ان افسانہ نگاروں اور شاعروں کو اپنے جریدے میں مسلسل اور باقاعدگی سے شائع کر رہے تھے۔ افسانہ نگاروں کے اس گروہ میں نشاط الایمان سب سے نوعمر افسانہ نگار تھا اور اپنے چند افسانوں سے سنجیدہ ادبی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے جس افسانے نے قارئین سے بے حد خراج تحسین وصول کیا وہ "یوں بھی جیتے ہیں" ہے۔ اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے کئی بہت اچھے افسانے لکھے، جن میں "بدرو" "چھینال" "ایکٹرس" "دھارے" اور "ہنگامہ" شامل ہیں۔ ابتدا میں وہ نشاط مظفر پوری کے نام سے افسانہ لکھ رہا تھا۔ اس کی افسانہ نگاری کی ترویج میں یونس احمر اور اس دور کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ یونس احمر اس کے بڑے اچھے اور گہرے دوست تھے اور احمر، نشاط اور ضیار عظیم آبادی نے مل کر سب سے پہلے انجمن آزاد مصنفین کی داغ بیل ڈالی تھی جسے بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں بدل دیا گیا۔

نشاط مظفر پوری، یونس احمر اور خلیل الرحمن لکھنوی نے آپس میں مل کر 1946ء میں اپنے پانچ پانچ افسانوں کا مجموعہ "سنگریزے" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد جب یونس احمر نے دو ماہی جریدہ "نئے دھارے" نکالا تو اس میں بھی نشاط کا تعاون حاصل رہا۔ یہ اس کی افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ

تھا۔ اس زمانے میں اس نے بڑے اچھے افسانے لکھے اور احمد سعدی کے اشتراک سے پہلے ماہنامہ "ارمغاں" اور پھر ماہنامہ "کہانی" جاری کیا۔ جس کے چار یا پانچ شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد نہ معلوم کیوں اسے اپنا قلمی نام (نشاط مظفرپوری) بدلنے کا شوق پیدا ہوا اور اس نے اپنا نام بدل کر پہلے "قیصر نشاط" اور پھر "نشاط الایمان" رکھ لیا۔ اس کے اس فیصلے سے اس کے ادبی کیریئر کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور اس نے ابتدا میں نشاط مظفرپوری کے نام سے جو شہرت حاصل کی تھی وہ ضائع ہو گئی اس نے نشاط الایمان کے نام سے بھی افسانے لکھے لیکن گوشہ نشینی اور ادبی حلقوں سے لاتعلقی اور پی۔ آر۔ شپ سے قطعی نابلد ہونے کی وجہ سے اسے خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ وہ عام ادیبوں کی طرح شہرت طلبی کے مرض میں مبتلا نہیں ہے اور نہ ادبی سیاست بازی اور داؤ پیچ سے واقف ہے۔ وہ عام ادبی محفلوں میں بھی نہیں جاتا ہے اور نہ ادیبوں اور مدیروں سے غیر ضروری خط و کتابت کرتا ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ افسانے لکھتا ہے اور رسالے میں بھیج کر خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ ایڈیٹر نے اگر افسانہ شائع کر دیا تو ٹھیک ہے ورنہ وہ نہ شکوہ کرتا ہے اور نہ بار بار خط لکھ کر ایڈیٹر کو یاد دہانی کراتا ہے۔ اگر کوئی بڑا یا مشہور افسانہ نگار شہر میں آتا ہے تو وہ اس سے ملنے کے لیے بھی نہیں جاتا۔ ایسی صورت میں اگر لوگ اسے نظرانداز کر دیتے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

نشاط الایمان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں برصغیر کی آزادی کے بعد 47 ء میں شانتاہار (مشرقی بنگال) سے کلکتہ آیا اور اسلامیہ ہائی اسکول (بنیاپوکھر) میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفت روزہ تنقیدی نشست میں شرکت کی غرض سے گیا۔ نشاط سے چند ملاقاتوں میں ہی اس سے گہری دوستی ہو گئی اور میں اس کے باسا یعنی (ایک کمرے کے گھر) میں باقاعدگی سے جانے لگا۔ اس وقت میں نے باقاعدہ لکھنا شروع نہیں کیا تھا، البتہ ایک آدھ افسانہ شائع ہو چکا تھا۔ میں نشاط سے مل کر اس کے افسانوں اور اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور اس نے میری ذہنی تربیت اور ادبی ذوق کی تشکیل میں غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر حصہ لینا شروع کیا۔ میں اردو کے جن ادیبوں کو اپنا ذہنی معمار تصور کرتا ہوں، ان میں ایک پرکاش فکری (ظہیرالحق) اور دوسرا نشاط الایمان ہے۔ ان دونوں نے مجھے ذہنی طور پر بڑا متاثر کیا اور ان کے طفیل ہی میں ادب کی جانب آیا۔

میں کلکتہ پہنچتے ہی سیدھے بس پر سوار ہو کر ملک بازار پہنچا، جو لور سرکلر روڈ اور پارک اسٹریٹ کے نکڑ پر واقع ہے اور جہاں وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا ہے۔ وہ اکیس سال قبل بھی اسی کمرے میں رہتا تھا اور میں جب دو عشرے کے بعد وہاں پہنچا تو اسے اسی کمرے میں پایا۔ اس عرصے میں

کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، البتہ اس کے کمرے کے دروازے پر "ساتھی اکیڈیمی" کے نام کی تختی بہت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ وہ حسب معمول اپنے کمرے میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سینے سے لگالیا اور بچوں کو فوراً رخصت کر دیا۔ وہ بیس سال قبل بھی اسکول ٹیچر تھا اور آج بھی اسکول میں ہی پڑھا رہا تھا۔ اس عرصے میں اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، البتہ وہ پہلے کی بہ نسبت بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال سفید ہو چکے تھے اور وہ پہلے سے زیادہ اونچا سننے لگا تھا۔ ہم دونوں بہت دیر تک ماضی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کلکتے سے روانگی سے قبل میں ایک بار پھر اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اسکول گیا ہوا ہے۔ اسکول گیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر واپس جا چکا ہے۔ میں دوبارہ اس کے کمرے میں واپس نہ آسکا۔ اس طرح اکیس سال کی جدائی کے بعد اس سے صرف ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔

مائیکل مدھو دن دت کے مقبرے پر

میں ملک بازار میں نشاط الایمان سے ملنے کے بعد سیدھے عیسائیوں کے قبرستان پہنچا جو ٹھیک ملک بازار کے سامنے لور سرکلر روڈ پر واقع ہے اور جہاں بنگلہ زبان کا عظیم المرتبت شاعر مائیکل مدھوسودن دت اپنی محبوب رفیقہ حیات ہینریٹا کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محو خواب ہے۔ بنگالی شاعروں میں مائیکل میرا نہایت محبوب شاعر رہا ہے اور میں اس کا بڑا معتقد ہوں۔ اس کی وجہ صرف اس کی شاعری نہیں، اس کی انقلابی شخصیت، اس کی ترقی پسندی، روشن خیالی اور انسان دوستی ہے۔ مائیکل مدھوسودن سے میرا تعارف سب سے پہلے میرے افسانہ نگار دوست محمد طیب نے کرایا تھا۔ جب میں بنگلہ زبان سے واقف بھی نہ تھا۔ محمد طیب اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں کا بڑا ہی وسیع المطالعہ مصنف تھا۔ اس نے مجھے جب مائیکل کی زندگی اور شاعری کے بارے میں بتایا تو مجھ میں بنگلہ زبان سیکھنے اور مائیکل اور ٹیگلور کو ان کی اپنی زبان میں پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور اس طرح میں بنگلہ زبان سیکھنے پر مائل ہو گیا۔

مائیکل مدھوسودن دت کی جب بھی برسی ہوتی ہے تو بنگلہ زبان کے اخبارات خصوصی ضمیمہ شائع کرتے ہیں اور کلکتہ میٹروپولیٹن کارپوریشن کی جانب سے میئر اس عظیم المرتبت شاعر کے مقبرے پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اس روز بنگالی اور دیگر زبانوں کے ادیب بھی اس کے مقبرے پر حاضر ہو کر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ میں بھی طیب کے ساتھ بارہا اس کے مقبرے پر جا چکا تھا۔ میں اس دفعہ جب کلکتے گیا اور عیسائیوں کے اس قبرستان کے سامنے سے گزرا تو میں نے مائیکل کے مقبرے پر حاضر ہونا ضروری تصور کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں اکیس سال کے بعد کلکتہ آیا ہوں۔ کیوں نہ اس کے مقبرے پر حاضری دوں۔ یہ سوچ کر میں قبرستان میں داخل ہو گیا۔

عیسائیوں کا قبرستان دیکھ کر نہ معلوم کیوں مجھے اس کے قبرستان نہ ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کہ قبریں بڑے سلیقے سے ایک قطار میں بنی ہوتی ہیں اور پھر پھولوں کی کیاریاں اتنی

اب صورتی سے سجی ہوئی ہوتی ہیں، اور مختلف قسم کے پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں کہ قبرستان، قبرستان سے زیادہ باغ محسوس ہوتا ہے۔ قبرستان میں داخل ہونے کے بعد مائیکل کا مقبرہ تلاش کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ میں اس سے قبل کئی بار یہاں آچکا تھا۔ اس کے مقبرے پر ایک بڑا سا کتبہ نصب تھا اور اس پر اس کا بیسٹ (مجسمہ) دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔

مائیکل سے میری عقیدت کی کئی وجوہ تھیں۔ اول یہ کہ وہ نہایت روشن خیال اور غیر متعصب شخص تھا اور صحیح معنوں میں جدید تہذیب کا پروردہ تھا۔ اس نے اسکول کے زمانے میں نہ صرف بنگلہ اور انگریزی کی، بلکہ فارسی زبان کی بھی تعلیم حاصل کی تھی اور وہ بنگلہ اور انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب پر بھی غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی بڑی ڈرامائی گزری تھی۔ اس لیے بھی اس کی شخصیت اور شاعری بڑی کشش کا باعث تھی۔ اسے صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے بنگال کی تحریک نشاۃ الثانیہ کی بہترین علامت قرار دیا جاسکتا ہے۔

مائیکل کے مقبرے کے سامنے کھڑے کھڑے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں انیسویں صدی کے کلکتے میں پہنچ گیا ہوں۔ جب ہندوستان ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ برٹش امپیریل ازم کے قدم پوری طرح جم چکے تھے۔ اسے کوئی چیلنج کرنے والا نہ تھا اور پورا ہندوستان خصوصاً بنگال اتباع مغرب میں ہی اپنی نجات محسوس کر رہا تھا۔ مائیکل کا تعلق سابق مشرقی پاکستان کے ضلع جیسور کے گاؤں ساگر دانری سے تھا، جہاں وہ 25 جنوری 1824ء کو دت گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے والد راج نرائن دت، کلکتہ میں وکیل تھے۔ اس کی ماں ایک متمول زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مدھو سودن نے زندگی میں کبھی غربت نہیں دیکھی۔ اس کے دو بھائی تھے، جو چھوٹی عمر میں چل بسے۔ مدھو سودن نے گاؤں کے اسکول میں مولوی صاحب سے ریاضی، بنگلہ، سنسکرت کے علاوہ فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس کے گھرانے میں فارسی زبان کا باقاعدہ چلن تھا۔ اس لیے کہ اس وقت تک فارسی عدالت کی زبان تھی اور وہ بنگالی ہندو اور مسلمان، جو عدالت سے وابستہ تھے، فارسی بہت اچھی جانتے تھے (خیال اغلب ہے کہ وہ اردو سے بھی ضرور واقف ہوں گے)۔ مدھو سودن کے والد اور چچا فارسی سے اچھی طرح واقف تھے۔ مدھو سودن جب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے کلکتہ کی مشہور دانش گاہ، "ہندو کالج" میں داخل ہوا تو وہ نہ صرف فارسی پڑھ سکتا تھا، بلکہ لکھ بھی سکتا تھا۔ اس کے کالج کے رفقا کا بیان ہے کہ وہ کالج کے زمانے میں اکثر انہیں فارسی غزلیں گا کر سنایا کرتا تھا۔ بعد میں وہ جب بشپس کالج میں داخل ہوا تو اس نے فارسی کی کئی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ (افسوس! مدھو سودن کی کوئی فارسی تحریر یا فارسی

سے انگریزی میں ترجمہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا)۔

مائیکل کو بچپن سے ہی بہت اچھی تعلیم حاصل ہوئی۔ اس کی تعلیم گاؤں کے اسکول سے شروع ہوئی، جہاں اس نے ابتدا میں بنگلہ، سنسکرت اور فارسی پڑھی۔ پھر اس کی والدہ نے (جو بہت ہی مذہبی خاتون تھیں) اسے چھوٹی عمر سے روز راماین اور مہابھارت جیسی کلاسیکی کتابیں پڑھ کر سنانی شروع کیں، جس کا معصوم مدھوسودن کے دل و دماغ پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ اس کے والد راج نرائن کا کلکتے میں بہت اچھا پریکٹس تھا۔ جس کے باعث انہوں نے بڑی دولت کمائی اور خضر پور میں ایک عظیم الشان مکان تعمیر کیا۔ مدھوسودن جب تعلیم کی غرض سے کلکتہ پہنچا تو خضر پور کے اسی مکان میں رہائش اختیار کی۔ کلکتہ پہنچتے ہی اس کو ایک انگلش گرائمر اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں اس نے انگریزی کے علاوہ لاطینی اور عبرانی زبانیں بھی سیکھیں۔ گرائمر اسکول میں پانچ سال پڑھنے کے بعد اس کو 1837ء میں "ہندو کالج" میں داخل کر دیا گیا۔

کلکتے کا "ہندو کالج" انگریزوں کی نگرانی میں قائم ہونے والا نہ صرف پہلا جدید کالج ہے، بلکہ وہ ایک ایسی دانش گاہ بھی ہے، جہاں سے ہندوستان میں جدید تعلیم و تہذیب کی کرنیں پھوٹیں۔ یہ وہ دانش گاہ ہے، جس کے جنوری 1817ء میں قیام کے ساتھ ہی بنگال میں تحریک نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا اور جس نے سارے ہندوستان کو فکری اعتبار سے متاثر کیا اور جس کے نتیجے میں برصغیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزی زبان کا چرچا عام ہو چکا تھا اور نجی درس گاہوں میں انگریزی تعلیم و تربیت عام تھی۔ اس دور کے تعلیم یافتہ ہندو متوسط طبقے میں یہ خیال عام تھا کہ اگر زندگی میں ترقی کرنی ہے تو انگریزی تعلیم خصوصاً مغربی آرٹس اور سائنس کی تعلیم ضروری ہے۔ اس کے بغیر معاشرے میں اعلیٰ مقام کا حصول ممکن نہیں ہے۔ "ہندو کالج" ہی وہ کالج تھا، جہاں یورپی سائنس اور فنون و لطیفہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس کے بہت دنوں کے بعد یکے بعد دیگرے کئی نئے کالج قائم ہوئے، جہاں جدید تعلیم کا انتظام ہوا۔

ہندو کالج کے جن اساتذہ نے نئے ہندو دانشور طبقے کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ان میں سب سے اہم نام ہینری لیوئس ویوین ڈیروزیو (ڈے روزیو) ہے۔ جو انگریزی کا بہت ہی ذہین شاعر اور غیر معمولی استاد تھا، جس نے اپنی تدریس کے ذریعے نئی نسل کے فکر و نظر کو بدل کر رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں نئے بنگالی دانشور طبقے میں صدیوں پرانے فرسودہ عقائد سے انحراف شروع ہوا۔

ڈیروزیو کی عقلیت پسندی، روشن خیالی اور عقلی فلسفہ کے تعلیم کا نتیجہ تھا کہ نوجوان بنگالیوں کا

ایک ایسا باغی گروہ پیدا ہو گیا جس نے بت پرستی ذات پات کے نظام خدا کے وجود کا اقرار لیکن وحی سے انکار، الحاد، قضا و قدر، تقدیر پرستی اور وطن پرستی کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے تھے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض نوجوانوں نے ہندو مت پر سے اعتبار کھو دیا اور ہندو مت اور سماجی روایات کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔ ان نوجوانوں میں مدھو سودن پیش پیش تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے قدامت پسند ہندوؤں میں کہرام مچ گیا اور معزز شہریوں نے کالج کے حکام کے خلاف حکومت وقت سے شکایتیں کیں۔ اس دور کے ایک مشہور انگریز ڈاکٹر ہورس ہائے مین ولسن نے ڈیروزیو سے اس بارے میں جواب طلبی کی۔ ڈیروزیو نے اس کے جواب میں اپنا استعفیٰ نامہ پیش کر دیا اور اس واقعہ کے چند مہینے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ جدید دور کے جو نظریے اس دور کے بنگالی نوجوانوں کے ذہن کو جلا دے چکے تھے، وہ ڈیروزیو کے انتقال کے بعد بھی ختم نہیں ہوئے، بلکہ مزید پختہ ہوتے گئے۔ ڈیروزیو کے انتقال کے فوراً بعد ایک اور انگریز دانشور اور استاد کیپٹن ڈیوڈ لسٹر رچرڈسن نے ریروزیو کی جگہ سنبھال لی۔ دراصل زمانے کی ہوا کے خلاف ہر قسم کے توہمات اور فرسودہ عقائد اور رسومات اور روایات کی دیواریں گرنا شروع ہو چکی تھیں اور ڈیروزیو نے عقلیت اور روشن خیالی کی جو شمع روشن کی تھی۔ اس کے نتیجے میں قوم پرستانہ رجحانات، ادبی اور تعلیمی سرگرمیاں، سماجی اور مذہبی اصلاحات اور ساتھ ہی عیسائیت قبول کرنے کا رجحان تیزی کے ساتھ عام ہوتا گیا۔ ریروزیو کے انتقال کے بعد بھی مدھو سودن ان ہندوستانی اسکالروں کا اثر قبول کرتا رہا جو جنت ارضی، یعنی انگلینڈ کا دورہ کر آئے تھے۔ وہ نہ صرف ان کی شخصیت کے سحر سے، بلکہ مغربی رہن سہن، سماجی اطوار، غذائی عادات، فلسفہ، مذہب اور ادبیات سے بھی متاثر ہوتا رہا۔

رچرڈسن صرف استاد ہی نہ تھا، مدھو سودن کا ذہنی معمار اور راہبر بھی تھا اور اس کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ہی مدھو دن نے انگریزی میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی اور اس دور کے ہندوستان سے شائع ہونے والے مقبول عام ادبی جریدوں، مثلاً دی بنگال اسپیکٹیٹر (The Bengal spectator) لٹریری گلینر (Literary Glener) کلکتہ لٹریری گزٹ، لٹریری بلو زوم اور کومیٹ میں اس کی نظمیں شائع ہونے لگی تھیں۔ یہ قطعی اتفاق کی بات ہے کہ ڈیروزو کے بعد مدھو سودن دوسرا ہندوستانی شاعر تھا، جس نے انگریزی میں سانیٹ کہی۔ مدھو سودن کی انگریزی نظم گوئی کا زمانہ 1841 سے 1842 رہا۔ یہی اس کے کالج کا زمانہ بھی تھا۔ اس دور میں اس نے شیکسپیئر کے علاوہ پوپ اور اٹھارویں صدی کے اواخر کے انگریزی شاعروں کے علاوہ چند رومانوی شاعروں کا بھی

مطالعہ کیا۔ وہ ورڈس ورتھ، برنس، کولرج، شیلی، ٹامس موراور لارڈ بائرن کا بڑا مداخ تھا۔ مدھو سودن اپنے دور کا نہایت فیشن ایبل اور خوش لباس شخص تھا۔ اسے مغربی لباس بہت پسند تھا۔ اس کی خوش لباسی کا یہ عالم تھا کہ وہ دن بھر میں پانچ دفعہ لباس تبدیل کرتا تھا۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ وہ پہلا ہندوستانی تھا جس نے سگریٹ نوشی شروع کی۔

مدھو سودن کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ فروری 1840ء کے پہلے ہفتے پیش آیا۔ جب وہ کالج کے اوقات میں اچانک لاپتہ ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ فورٹ ولیم میں روپوش ہے، جہاں اس کے والد اور دوستوں کی رسائی ممکن نہیں۔ چند دنوں کے بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ اس نے اولڈ مشن چرچ میں عیسائیت قبول کر لی ہے اور اس کا عیسائی نام مائیکل رکھا گیا ہے۔ اس کی تبدیلی مذہب کی اطلاع کلکتے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور اس واقعے کو لے کر کلکتہ کے ہندوؤں اور عیسائیوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہو گئی۔

مدھو سودن کے عیسائیت قبول کرنے کے بارے میں مختلف کہانیاں گڑھی گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے تبدیلی مذہب کی اصل وجہ ہندو مت کی خرابیاں اور عیسائی مذہب کی کشش ہے۔ مدھو سودن کا خیال تھا کہ ہندو مت ایک فرسودہ اور زوال آمادہ مذہب ہے اور ہندو فرقہ صرف اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب وہ عیسائیت اختیار کر کے مغربی طرز زندگی اختیار کرے۔ مدھو سودن نے اپنے ان خیالات کا اپنے کئی مضامین میں اظہار کیا ہے۔

مدھو سودن نے عیسائیت قبول کرنے کے فوراً بعد اس نے مغرب کا دورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مالی حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو عدالت کی زبان قرار دینے سے اس کے والد کی پریکٹس کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے والد انگریزی اس قدر نہیں جانتے تھے، جس قدر فارسی۔ چنانچہ ان کی آمدنی اچانک گھٹ گئی۔ مدھو سودن کے عیسائیت قبول کرنے کے باوجود اس کے والد راج نرائن دت اور اس کی والدہ نے اسے قبول کر لیا۔ اس لیے کہ مائیکل ہی ان کا واحد بیٹا رہ گیا تھا۔

مدھو سودن نے عیسائیت قبول کرنے کے بعد اپنی کفالت خود کرنے کی غرض سے مدراس کا دورہ کیا اور وہاں ایک عیسائی یتیم خانے میں استاد کا عہدہ سنبھال لیا۔ مدھو سودن میں زبانیں سیکھنے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت تھی، چنانچہ اس نے مدراس کے قیام کے دوران تلیگو اور ملیالم زبانیں سیکھ لیں، جن سے آگے چل کر اس کی بنگلہ شاعری میں بڑی مدد ملی۔ وہاں اس کی ملاقات ایک عیسائی لڑکی

ربیکا میک ٹیوش سے ہوئی اور دونوں نے شادی کر لی۔ جس سے اس کے چار بچے ہوئے۔ محدود آمدنی کے باوجود دونوں خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ مدراس کے قیام کے دوران اس کی شاعری جاری رہی اور وہ "دی مدراس سرکلیٹر" سے گہرے طور پر وابستہ ہو گیا۔ اس دوران اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ The Captive Ladie شائع ہو کر ہندوستان اور انگلستان میں بہت مقبول ہوا۔ اس نے مدراس کے قیام کے دوران "رضیہ، دی امپریس آف انڈیا" کے نام سے ایک منظوم ڈراما بھی لکھا۔ انگریزی میں شاعری کرنے والے کسی ہندوستانی شاعر کا یہ پہلا منظوم ڈراما تھا، جو ایک مسلمان ملکہ کے بارے میں تھا۔ صرف اس واقعے سے مائیکل مدھو سودن دت کے سیکولر رویے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہندوستان کے مسلمان سلاطین اور ان کے کلچر سے کتنی دلچسپی تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مائیکل نے جب کلکتہ واپس آنے کے بعد پائیک پاڑہ کے راجہ کی سرپرستی میں ایک بار پھر رضیہ سلطانہ کی زندگی پر بنگلہ زبان میں ڈراما لکھنے کی کوشش کی تو راجہ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور انہوں نے ڈرامے میں مسلم کردار کی وجہ سے اس کی مالی امداد کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ اسی راجہ نے اس سے قبل اس کے بنگلہ ڈرامے کو اسٹیج کرنے کے لیے دل کھول کر مدد کی تھی۔ اس واقعہ سے اس دور کے تنگ نظر اور فرقہ پرست عناصر کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ 16 جنوری 1855ء کو مائیکل کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مدراس کے قیام کے دوران ہی مائیکل کی پہلی بیوی ربیکا سے اس کی طلاق ہو گئی اور اس نے کلکتہ میں ایک دوسری عیسائی لڑکی ہینریٹا سے شادی کر لی، جس سے اس کی ایک لڑکی سرمستا پیدا ہوئی۔

انگریزی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہونے اور انگریزی میں شاعری کر کے انگریزی داں طبقے میں شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے باوجود مدھو سودن کو اس کا احساس تھا کہ اس کی شاعری کا بنگالی عوام اور معاشرے پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے چنانچہ اس نے اپنی مادری زبان میں شاعری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے بنگالی اور سنسکرت زبان سے پہلے ہی گہری واقفیت تھی اور اس نے جنوبی ہند کی زبانوں کے مطالعے کے ذریعے پہلے ہی ہندوستان کے قدیم کلاسیکی لٹریچر کا مطالعہ کر رکھا تھا، چنانچہ اسے بنگلہ میں شاعری کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بنگلہ شاعری میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ طویل نظم "میگھ ناد بدھ کاویہ" ہے، جسے بنگلہ زبان میں کلاسیک کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نظم راماین کے مشہور کردار رام اور راون کی جنگ کے بارے میں ہے، لیکن اس میں مائیکل نے راون کو باوقار انداز میں پیش کیا ہے، جبکہ اس سے قبل راون کو ہمیشہ ذلت آمیز کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ مائیکل

نے اس نظم میں راون کو ہیرو بنا کر قدامت پسند ہندوؤں کی ناراضگی مول لی تھی۔ ادبیات عالم میں ایپک (رزمیہ نظم) لکھنے کی روایت بہت دن قبل ختم ہو چکی ہے، لیکن مائیکل نے انیسویں صدی کے وسط یعنی 1861ء میں ہندوستان کی زبانوں میں پہلی دفعہ بنگلہ زبان میں ایپک طرز کی نظم لکھ کر نئی مثال قائم کی۔ مائیکل ایپک طرز کی نظم لکھنے میں صرف اس لیے کامیاب ہوا کہ اس نے یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی کے کلاسیکی ادب کا پہلے ہی مطالعہ کر رکھا تھا۔

کلاسیکی ادب سے کردار لے کر اسے عصر حاضر کے سیاق و سباق میں پیش کرنا اور اس میں نئی معنویت پیدا کرنا آج کے دور میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گوئٹے، مارلو اور یوجین اونیل سے لے کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ژاں کاکتو، سارترا اور کاموتک نے یہ تجربہ کیا ہے، لیکن آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل، یعنی 1861ء میں مائیکل کی جانب سے والمیکی کے کردار کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ ہندو دیو مالا کے نہایت نفرت انگیز کردار راون سے مائیکل کی ہمدردی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دور کا بہت بڑا باغی تھا۔ انیسویں صدی کا یہ عظیم المرتبت شاعر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہا۔ پر تعیش زندگی گزارنے کی عادت نے اسے بہت جلد مالی اعتبار سے تباہ کر دیا۔ قرض میں ڈوب جانے کے باعث اس کی موروثی جائیدادیں بہت جلد بک گئیں۔ اسی کے ساتھ اس کی صحت بھی خراب رہنے لگی۔ اس کی رفیقہ حیات ہینریٹا 26 جون 1873ء کو فوت ہو گئی۔ اس کے صرف تین دنوں کے بعد 29 جون 1873ء کو مائیکل مدھو سودن دت بھی انتقال کر گیا۔ سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے انتقال کے بعد عیسائیوں کے اس مشہور و معروف قبرستان میں اس کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں قضیہ پیدا ہو گیا۔ کلکتہ کے بعض پادریوں اور مشنریوں نے اعتراض کیا کہ مائیکل نے عیسائیت اختیار کرنے کے بعد ایک دفعہ بھی چرچ کا رخ نہیں کیا اور نہ اسے اتوار کے روز عبادت کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس لیے وہ عیسائی مذہب سے بہت دن قبل پھر چکا ہے۔ ایسی صورت میں اسے عیسائیوں کے قبرستان میں کس طرح دفن کیا جا سکتا ہے؟ لیکن بعض سنجیدہ اور سمجھ دار عیسائی پیشواؤں کی مداخلت سے یہ قضیہ جلد ختم ہو گیا اور اسے سرکلر روڈ کے اس تاریخی قبرستان میں اس کی محبوب رفیقہ حیات ہینریٹا کے بغل میں دفن کر دیا گیا۔ آخری رسم ریورینڈ پیٹر جون جیریو نے انجام دی۔ اس کی تدفین کے وقت اس کے چار سو سے زیادہ عقیدت مند موجود تھے۔ مائیکل کل 49 سال زندہ رہا اور اس نے رہتی دنیا تک اپنا نام تاریخ میں محفوظ کر لیا۔

میں اس کے مقبرے کے سامنے کھڑا اس کی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا اور اس کی زندگی کے

سارے واقعات میری نظروں کے سامنے گھومتے رہے۔ میں نے مدھو سودن دت کی زندگی پر بہت دن قبل ایک بنگلہ فلم بھی دیکھی تھی، جس میں اتپل دت نے بڑی فن کاری سے مائیکل کا کردار ادا کیا تھا۔ میں غور کرتا رہا کہ بلاشبہ اس کی زندگی ایسی ہے کہ جس پر ایک کامیاب ناول لکھا جاسکتا ہے۔ مائیکل وہ شخص تھا، جس نے تاریخ اسلام کا بھی مطالعہ کیا تھا اور جس کا خیال تھا کہ سانحہ کربلا اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اس پر ایپک طرز کی نظم لکھی جاسکتی ہے، لیکن اس کے لیے بڑا شاعر ہونا شرط ہے۔ میر انیس اور دبیر نے سانحہ کربلا پر عظیم الشان مرثیے کہے ہیں۔ لیکن کیا ہم انہیں ایپک یا اس کے برابر درجہ دینے کے لیے تیار ہیں؟

شب پور کے ادیب و شاعر

ترقی پسند ادبی تحریک کا خواہ کوئی بڑا کارنامہ ہو یا نہ ہو۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب کو عوام الناس تک پہنچایا اور محنت کش طبقے کو اظہار کے لیے زبان عطا کی۔ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں کلکتہ کے سفر کے دوران مزدوروں کی نواحی بستی شب پور (ہوڑہ) کی ایک ادبی نشست میں شریک ہوا جو میرے اعزاز میں ایک چھوٹے سے اسکول میں منعقد ہوا تھا۔ جس کا اہتمام میرے دوست اور کلکتہ کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار قیصر شمیم نے رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے کیا تھا اور جس میں زیادہ تر جوٹ ملز کے مزدور اور متوسط طبقہ کے ملازمت پیشہ ادیبوں نے شرکت کی تھی۔

شب پور، دریائے ہگلی کے کنارے گارڈن ریچ اور مٹیا برج کے مقابل دریا کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ یہ علاقہ اپنے تاریخی بوٹانکل گارڈن کی وجہ سے بھی مشہور ہے جو دس ہزار نو سو ستائیس ہیکڑ خط پر محیط ہے اور جسے انگریزوں نے 1786ء میں قائم کیا تھا اور جہاں واجد علی شاہ شام کے وقت چہل قدمی کے لیے آیا کرتے تھے، لیکن میں جس علاقے کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ بادشاہ کی سیر گاہ نہیں، خالص مل مزدوروں کی بستی ہے اور جہاں آبادی کی اکثریت غیر بنگالیوں اور ہندی و اردو بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے عوام میں شعر و ادب سے گہری دلچسپی پائی جاتی ہے اور مشاعرے اور ادبی نشستیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اس علاقے میں شاعروں اور ادیبوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ یہ شاعر و ادیب نہ تو مشہور ہیں اور نہ رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی بس واجبی سی ہے۔ وہ عموماً کسی نہ کسی کارخانے سے بحیثیت مزدور یا کلرک وابستہ ہوتے ہیں، البتہ ماہانہ ادبی نشستوں میں (جو عموماً

اتوار کے روز کسی اسکول میں منعقد ہوتی ہیں) اپنے افسانے، مضامین، غزلیں اور نظمیں سناتے اور داد وصول کرتے ہیں۔ جب ان کی مقامی ادبی تنظیم رائٹرز ایسوسی ایشن قائم نہیں ہوئی تھی اور جب تک انجمن ترقی پسند مصنفین (کلکتہ) فعال تھی، وہ انجمن کی نشستوں میں بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے، جن میں قیصر شمیم، شارق بلیاوی، ناصر بلیاوی، حشمت فتح پوری اور مرحوم شمس صابری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انجمن کی باقاعدہ نشستوں میں سب سے زیادہ حاضری شب پور کے ادیبوں کی ہوتی تھی۔

اس علاقے کے عوام الناس کی شعر و ادب سے گہری دلچسپی کا ذکر سجاد ظہیر نے اپنی یادداشت "روشنائی" میں بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس جب دسمبر 1938ء میں کلکتہ میں ہوئی تو اجلاس کے بعد رات کو ایک بڑا ادبی اجتماع شب پور کے اسی مزدور علاقے میں ہوا تھا۔ اس موقع پر منعقدہ عوامی مشاعرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں سردار جعفری، اسرارالحق مجاز اور دوسرے ترقی پسند شعراء نے اپنا کلام سنایا تھا۔ ان مزدور ادیبوں نے نہ صرف ترقی پسند مصنفین کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا، بلکہ کانفرنس کو کامیاب بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا تھا۔ جس سے سجاد ظہیر بہت متاثر ہوئے تھے اور ان باذوق مزدوروں کا اپنی مذکورہ یادداشت میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تھا۔

یہ مزدور ادیب ان لوگوں کی اولاد تھے جو کسی زمانے میں مشرقی ہندوستان کے دیہات میں چھوٹے کسان یا دست کار تھے۔ اس وقت دیہی معیشت خود کفیل تھی۔ اس لیے یہ لوگ دیہات میں خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے، لیکن سترھویں صدی سے انگریز حکمرانوں نے ایسی معاشی حکمت عملی اختیار کی جس کے نتیجے میں دیہی معیشت تباہ ہونا شروع ہو گئی، خصوصاً نئے زمین داری نظام اور صنعت کاری کے باعث گاؤں کی معیشت بری طرح متاثر ہوئی اور دہاں کے چھوٹے کسان سود خور بنیوں کے ہاتھوں اپنی اراضی گنوا کر کھیت مزدور بننے پر مجبور ہو گئے اور یہی کھیت مزدور وقت کے ساتھ ساتھ تلاش روزگار میں شہروں کی جانب منتقل ہونے لگے اور آگے چل کر صنعتی مزدور بن گئے۔ اربنائزیشن کا یہ سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے لے کر آج تک جاری ہے۔ بہار، اڑیسہ، مشرقی یو۔ پی اور بنگال کے دیہی علاقوں سے جو لوگ ایک بار اکھڑ کر کلکتہ آئے وہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کبھی کھیت مزدور تھے اور کھیتوں میں اجرت پر کام کرتے تھے اس کے باوجود دو وقت کی روکھی سوکھی روٹیاں نہیں کھا سکتے تھے۔ کلکتہ کی حیثیت اس ماں جیسی تھی جس کی آغوش اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے، چنانچہ لوگ دیہات سے اکھڑ اکھڑ کر کلکتہ آتے رہے اور کلکتے کی آبادی میں

تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔

اٹھارویں صدی کی ابتدا میں کلکتے کی آبادی صرف دس ہزار تھی۔ 1831 ء میں دو لاکھ انیس ہزار تین سو پینتیس ہو گئی۔ 1931 ء میں آبادی بڑھ کر چودہ لاکھ ہو گئی۔ 1971 ء میں کلکتے کی آبادی 83 لاکھ تھی اس وقت اس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ اس وقت مغربی بنگال میں اردو بولنے والوں کی آبادی اٹھارہ لاکھ ہے۔ صرف کلکتہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ ہے۔ ان میں سے اکثریت کا مزدور طبقے سے تعلق ہے۔ کلکتے میں غیر بنگالی صنعتی مزدوروں کی کل تعداد آٹھ لاکھ اسی ہزار تین سو ہے جن کی مادری زبان یا تو ہندی ہے یا اردو۔ وہ زیادہ تر بہار یا مشرقی یو۔ پی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مزدوروں میں سے بہت بڑا حصہ صرف شب پور میں آباد ہے۔

اردو بولنے والی اتنی بڑی آبادی میں اگر چند سو مزدور ادیب و شاعر ہوں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ میں جب کلکتے میں رہتا تھا تو اس وقت بھی شب پور کی ادبی نشستوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا اور اب اکیس سال کے بعد کلکتہ گیا تو میں نے شب پور کے ادیب دوستوں سے ملنا اپنا فرض تصور کیا۔

میرے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں ادیبوں اور شاعروں کی تعداد دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ان کی کل تعداد ستائیس تھی۔ جن میں قیصر شمیم، ناصر بلیاوی، مطرب بلیاوی، ڈاکٹر نور بھارتی، خالق حیدر، نور پیکر، جاوید انور صابری، ایم۔ کے۔ اثر، شمس الحق، ڈاکٹر سید الابرار، ولی محمد ولی، ابوذر ہاشمی، حامی گورکھ پوری، بشیر آروی، خالق عبداللہ غازی، نور قریشی، شفیع شاداں، عنبر شمیم، کلیم حاذق، فیروز اختر، حیدر صفت، شاہد فروغی، اشہر ہاشمی، عاطف راہی، عرفان بنارسی، حسیب ہاشمی، اختر جاوید اور حشمت فتح پوری شامل تھے۔

نشست میں شرکا ایک گھنٹے تک پاکستان اور ہندوستان کے ادب اور ادبی مسائل کے بارے میں سوالات کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا۔ اگر رات بہت زیادہ نہ ہو جاتی تو شاید نشست طول کھینچتی، لیکن قیصر شمیم نے اسے جبراً ختم کر دیا۔ قیصر شمیم کا تعلق بھی مزدور طبقے سے ہے۔ وہ اگرچہ اسکول ٹیچر ہے، لیکن اس کے والد جوٹ مل کے مزدور تھے۔ انہوں نے قیصر شمیم کو بی۔ اے تک پڑھایا۔ جس کے بعد اس نے مل میں کلرکی کرنے کے بجائے اسکول میں معلم بنتا زیادہ پسند کیا۔ اس نے اردو ادب ے کیا۔ جس کے بعد وہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گیا۔ ایک مزدور کا بیٹا کس کا پروفیسر بن گیا۔ یہ اپنی جگہ خود حیرت کی بات ہے۔

ف شاعر ہے بلکہ اچھا خاصا ناقد بھی ہے۔ اس کا شعری مجموعہ "ساعتوں کا سمندر

کسی نہ ...

1971ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس نے اپنے مرحوم افسانہ نگار دوست شمس صابری پر ایک کتاب مرتب کی۔ وہ اس وقت مغربی بنگال بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کا رکن ہے اور ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لیے اردو، بنگلہ اور انگریزی کی درسی کتب مرتب کر چکا ہے۔ وہ اس وقت مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کی جانب سے چالیس ہزار الفاظ پر مشتمل اردو بنگلہ لغت مرتب کرنے میں مصروف ہے۔

اکیس سال گزر جانے کے باد جود میں شب پور کے مزدور ادیب شمس صابری کو فراموش نہ کر سکا اور جب تک شب پور میں رہا۔ اسے یاد کرتا رہا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند مزدور ادیب تھا۔ اس کی ترقی پسندی نے انسان دوستی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ جس کا اظہار اس کے افسانوں میں جابجا ہوا ہے۔ اس نے جس زندگی کے بارے میں افسانے لکھے، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یا کسی آئیوری ٹاور سے تخیل کے سہارے دیکھی ہوئی زندگی نہیں تھی۔ وہ اس کی اپنی زندگی کی کہانی تھی، جس کے دکھ سکھ کا ایک ایک لمحہ اس کی روح کی گہرائیوں سے ہو کر گزرا تھا۔

شمس صابری سے میری پہلی ملاقات 1953ء یا 1954ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کلکتہ کی ہفت روزہ نشست میں ہوئی تھی۔ اس نے افسانہ "انار کلی" سنایا اور پہلے افسانے سے ہی سامعین کو حیرت زدہ کر دیا۔ شمس صابری ادب کی دنیا میں بالکل نو وارد تھا۔ اسے کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ اس کا کوئی افسانہ کہیں شائع ہوا تھا۔ اس کے باد جود اس کے افسانے میں اتنی پختگی تھی اور مشاہدہ اس قدر گہرا تھا کہ حیرت ہو رہی تھی کہ ایک نوخیز نوجوان نے مزدوروں کی زندگی کے بارے میں اتنا عمدہ اور متاثر کرنے والا افسانہ کیسے لکھا! جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میں اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف جوٹ مل میں ایک مزدور ہے بلکہ کمیونسٹ پارٹی کا نہایت مخلص ورکر بھی ہے۔ وہ مغربی بنگال کا واحد افسانہ نگار تھا جس نے اپنے افسانوں میں مزدوروں کی زندگی کی سچی عکاسی کی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس نے مزدوروں کی زندگی، خاص طور پر پس ماندہ بستیوں اور sulm life کے ایک ایک رخ کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی سلم ایریا کا فرد تھا۔ وہ اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا، جو جوٹ ملوں اور چھوٹی بڑی فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بستی تھی۔ اس کے خاندان کے کئی افراد کے کسب معاش کا ذریعہ جوٹ مل کی ملازمت ہی تھی۔ خود شمس نے 29.30 سال کی مختصر سی زندگی کے پورے بارہ سال فورٹ ولیم جوٹ ملز میں گزارے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہونے کے بعد اس نے آخری دم تک جس محاذ پر سب سے زیادہ سرگرم عمل رہنا پسند کیا وہ مزدوروں کی ٹریڈ یونین تھی۔ اپنی سیاسی اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے باعث اسے 1958

میں کئی ماہ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

ٹریڈ یونین کے علاوہ وہ فلاحی اداروں سے بھی وابستہ تھا۔ ان میں ایک، شب پور ویلفیر سوسائٹی اور دوسرا، شب پور بستی فری پرائمری گرلز اسکول تھا۔ یہ لڑکیوں کا پہلا اسکول تھا جو اس علاقے میں قائم ہوا تھا۔ شمس ان سرگرمیوں کے ذریعے بستی کے عوام کی زندگی میں تبدیلی لانے کا خواہش مند تھا۔ افسوس! اسے اس کا موقع نہیں ملا اور وہ وقت سے بہت قبل ہرنیا کے آپریشن کے بعد 29 جون 1960ء کو اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے انتقال کے تیرہ سال بعد اس کے افسانوں کا مجموعہ "دھند اور کرن" اس کے دوست قیصر شمیم نے شائع کیا اور دوستی کا حق ادا کیا۔ میں نے جب اس کے افسانے پڑھے تو اس کی ادبی صلاحیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کاش اس کے افسانے مشہور اور مؤقر ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہوتے اور ناقدین نے توجہ دی ہوتی۔ اس کے انتقال کے 26 سال بعد میں جب کلکتہ گیا اور اس کے افسانوں کا از سر نو مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر یہ شخص وقت سے قبل اللہ کو پیارا نہ ہوتا اور معیاری ادبی رسائل میں مسلسل افسانے لکھتا رہتا تو نہ صرف ادبی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا بلکہ افسانوی ادب میں اپنا مقام بھی متعین کر لیتا۔ افسوس! ایسا نہیں ہوا۔

کشمیر ریستوراں

کلکتہ پہنچنے کے تیسرے روز میں سیدھے اپنے ادیب دوستوں کی تلاش میں ویلسلی اسٹریٹ (رفیع احمد قدوائی اسٹریٹ) پر واقع کشمیر ریستوراں پہنچ گیا، جہاں کلکتہ کے زیادہ تر ادیب و شاعر اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ اس کی حیثیت لاہور کے پاک ٹی ہاؤس جیسی تھی۔ معلوم ہوا کہ اب اس کا نام بدل کر ڈائمنڈ ریستوراں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ریستوراں ایسے علاقے میں واقع ہے، جسے کلکتہ کے اردو داں طبقے اور اردو کلچر کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔ ایک جانب تاریخی کلکتہ مدرسہ عالیہ واقع ہے۔ دوسری جانب مسلم انسٹی ٹیوٹ۔ اس کے سامنے بیکر ہوسٹل ہے اور اسی کے ساتھ ایلیٹ ہوسٹل۔ اس سے کچھ فاصلے پر اسلامیہ کالج (مولانا ابو الکلام آزاد کالج) ہے۔ یہ علاقہ قدیم کلکتہ کے محلہ کالنگا اور تالتلہ کے درمیان واقع ہے اور مسلمانوں کا قدیم محلہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی شہرت اس علاقہ میں واقع قادریہ سلسلہ کے خانقاہ کی وجہ سے بھی ہے۔ کشمیر ریستوراں کو اس لیے بھی اہمیت حاصل تھی کہ یہاں کلکتہ کے ادیب شاعر اور صحافی دن کے کسی نہ کسی وقت ایک دفعہ ضرور آتے تھے اور چائے پینے، ناشتہ یا کھانا کھانے اور تھوڑی دیر دوستوں سے گپ شپ کرنے کے بعد رخصت ہو جاتے تھے۔ یہ ہوٹل ان کے ملنے کی جگہ بھی تھی یعنی وقت مقررہ پر آنے اور مل بیٹھنے کی جگہ۔ اس سے قبل یہ اہمیت اس کے بغل میں واقع مالا بار ہوٹل کو حاصل تھی، جہاں مرحوم تاباں القادری صبح گیارہ بجے سے رات نو دس بجے تک مسلسل بیٹھے رہتے تھے۔ مالا بار ہوٹل تاباں القادری کا مستقل اڈہ تھا اور ان کے دوست و احباب ان سے ملنے اور شعر و شاعری کرنے کے لیے یہیں آتے تھے، جن میں ناظر الحسینی، جبار لطیفی، وفا راشدی اور صادق القادری وغیرہ شامل ہیں۔

میں نے چائے اور پیسٹری کا آرڈر دیا اور کسی شناسا ادیب، شاعر اور صحافی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

اکیس سال کے دوران نہ صرف ہوٹل کا نام اور مالک بدل چکا تھا، بلکہ اس کا ماحول اور سجاوٹ بھی بدل چکی تھی۔ میں ماضی میں کھو گیا اور اپنے مرحوم دوست تاماں القادری کو یاد کرنے لگا۔ تاباں بھی بڑا عجیب و غریب شخص تھا۔ وہ شاعر خواہ جیسا بھی ہو، انسان بہت عمدہ تھا۔ یہ دبلا پتلا جاں مرنجاں اور انتہائی منکسر المزاج شخص پہلی ملاقات میں ہی لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا تھا۔ تاباں اس قدر مہمان نواز تھا کہ اس سے ملنے کے لیے جو شخص بھی آتا تھا۔ وہ اس کی نہ صرف چائے اور ناشتے سے، بلکہ کھانے سے بھی تواضع کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا، چنانچہ بہت سے لوگ اس سے اس لیے بھی ملنے کے لیے آتے تھے کہ دوپہر یا رات کے کھانے کا بندوبست ہو جائے۔ تاباں بڑا یار باش اور دریا دل انسان تھا۔ اس کا تعلق چونکہ خانقاہ شریف سے تھا اس لیے اسے روپے پیسے کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی چنانچہ وہ جب رات کو گھر لوٹتا تو اسے ہوٹل کے دن بھر کا بل ادا کرنے میں کچھ بار نہیں گزرتا۔ تاباں اور اس کے احباب کا تعلق شاعری کے روایتی اسکول سے تھا، لیکن اس سے ملنے کے لیے جدید اور ترقی پسند شاعر و ادیب بھی آتے تھے اور اس سے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی، ترقی پسندی، حصول آزادی اور مارکسزم اور سوشلزم کی بحث میں الجھ جاتے تھے۔ وہ دوسروں کی باتیں نہایت اطمینان اور تحمل کے ساتھ سنتا اور اپنی فہم و ادراک کے مطابق جواب بھی دیتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کبھی کسی سے الجھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے اس سے بارہا ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک کے بارے میں بحث کی اور اس سے الجھ بھی پڑا لیکن اس نے کبھی برا نہیں مانا۔

میں ہوٹل میں تنہا بیٹھا ہوٹل اور ادیب کے رشتے پر غور کرتا رہا۔ ادیب اور ہوٹل کا رشتہ بہت قدیم تھا۔ اس ریستوراں کو ہی لیجیے۔ یہ اگرچہ ایک چھوٹا موٹا غیر معروف ریستوراں تھا، لیکن وہ ایک طرح سے ادبی اور ثقافتی مرکز بھی تھا۔ کلکتے کا ادبی مرکز۔ جدید ہوٹل، ریستوراں اور کافی ہاؤس کا ظہور عمرانی اصطلاح میں "ڈیموکرائزیشن آف کلچر" کا نتیجہ ہے۔ ایک دور تھا جب بڑے بڑے فیوڈل لارڈز اور لینڈیڈ ارسٹوکریٹ، عظیم الشان محل نما حویلیوں میں رقص و موسیقی اور شعر و شاعری کی محفلیں سجایا کرتے تھے، جن میں وہ بعض نامور ادیبوں اور شاعروں کو ان کی عزت افزائی کی غرض سے مدعو کر لیتے تھے۔ یہ ادیب شاعر باادب باملاحظہ ہو کر بیٹھے رہتے تھے اور اسی وقت ہم کلام ہوتے تھے جب ان سے کچھ پوچھا جاتا تھا یا ان سے کچھ کہنے یا سنانے کے لیے کہا جاتا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کی محفلوں کا ذکر اٹھارویں صدی کے فرانس کی مشہور و معروف ادیب نواز مادام استیل کے تذکروں میں ملتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں غالب، سودا، داغ اور سائل کے زمانے میں بھی اس قسم کی مخصوص شعری محفلوں کا ذکر ملتا

ہے، لیکن بادشاہت اور اس کے ساتھ درباری تہذیب اور جاگیردارانہ نظام کے ختم ہونے، خصوصاً نئی تہذیب کے ظہور میں آنے کے بعد اس قسم کی محفلوں کا رواج ختم ہوگیا اور نئے دور کی علامت کے طور پر کلب، کافی ہاؤس، ہوٹل اور ریستوراں وجود میں آ گئے، بقول شخصے اس طرح کلچر کو "جمہوریا" دیا گیا یعنی کلچر امراء و شرفاء کی محفلوں سے نکل کر متوسط اور محنت کش طبقے تک پہنچ گیا اور اس طرح تہذیب و ثقافت پر طبقہ اشرافیہ کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور نئے کلچر کے علم بردار ادیب، شاعر، صحافی، مصور اور مغنی درباروں سے نکل کر ہوٹلوں، اور ریستورانوں میں آ کر بیٹھنے لگے۔ اگر کوئی ماہر عمرانیات یا ادبی مورخ کلچر کے ڈیموکرائزیشن کے عمل کا عہد بہ عہد جائزہ لے تو بڑے دلچسپ نتائج بر آمد ہوں گے۔

میں سوچتا رہا کہ ادیبوں، شاعروں اور مصوروں کا ہوٹلوں میں بیٹھنا صرف آج کے دور کا رواج نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں بھی پیرس کے وہ ادیب، شاعر اور مصور، جن کی فرانس کے اعلیٰ طبقے کے "سیلون" میں رسائی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی طرح غریبوں کے محلوں میں واقع گندے، تاریک اور غیر معروف ریستورانوں میں بیٹھتے تھے شعر و ادب اور مصوری کے مسائل پر بحث کرتے، شعر کہتے، افسانے اور ناول لکھتے اور تصویریں بناتے تھے۔ ان میں ہنیری تولوس نوترک، پال گوگیں، وان گاگ، سیزاں، مودی گلینی، مانے اور دوسرے بہت سارے امپریشنسٹ اسکول کے مصور شامل ہیں۔ یہ وہ مصور ہیں جن کی تصاویر کو سرکاری سیلوں (آرٹ گیلری) میں نمائش کے لیے جگہ نہیں ملی اور انہوں نے سرکاری حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی تصاویر کی انہی ہوٹلوں میں نمائش کی اور مصوری کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اٹھارویں صدی کے فرانس کے ژولا اور بالزاک سے لے کر بودلیر، ملارمے، ریں بو وغیرہ تک مخصوص اوقات میں ان ریستورانوں میں بیٹھتے تھے۔ دور جدید میں اس روایت کو ژاں پال سارتر اور آلبیر کامو نے برقرار رکھا تھا۔ سارتر سے فیض احمد فیض اور قیوم نظر کی ملاقات اسی مخصوص ریستوراں میں ہوئی تھی۔ سارتر جس ریستوراں میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس کے مالک نے ان کے لیے ایک علیحدہ میز مخصوص کر دی تھی جس پر کسی دوسرے کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ پاکستان میں اس روایت کو لاہور کے پاک ٹی ہاؤس نے بہت حد تک برقرار رکھا اور اس کی وجہ اس کے مالک کی ادب اور ادیب نوازی ہے۔

مجھے ہوٹل میں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں میں کئی پیالیاں چائے پی چکا تھا، لیکن اس دوران کوئی شناسا چہرہ ہوٹل میں داخل نہیں ہوا، حالانکہ یہی وہ وقت تھا جب کلکتہ کے ادیب و شاعر یہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا اور میں پھر کلکتہ میں اپنے زمانہ

قیام کے ادبی ماحول، شعری محفلوں، ادبی مباحثوں اور تنقیدی نشستوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

ہر شہر کی طرح کلکتے میں بھی مختلف ادبی مسالک اور مکاتب فکر کے اوبار رہتے تھے اور ان کے اپنے اپنے مخصوص حلقے تھے۔ میں جس دور (1947ء سے 1956ء) کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس دور میں حضرت وحشت اور حضرت طاہر علی شاکر کے حلقے بڑے مشہور تھے۔ حضرت وحشت کے حلقے کا کوئی نام نہیں تھا، البتہ حضرت شاکر کے حلقے کا نام "بزم شاکر" تھا۔ آرزو لکھنوی جب تک کلکتہ میں رہے ان کے حلقے کا نام "دبستان آرزو" رہا۔ آرزو کے پاکستان چلے آنے کے بعد جرم محمد آبادی اس دبستان کی سربراہی کرتے رہے، لیکن اس میں وہ بات نہیں رہی جو حضرت آرزو کے دور میں تھی۔ یوں تو علامہ ناطق لکھنوی بھی گذشتہ تیس سال سے کلکتے میں مقیم تھے اور ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ بھی بہت بڑا تھا، لیکن انہوں نے اپنے نام سے کوئی مخصوص حلقہ قائم نہیں کیا۔ اگرچہ وہ اصلاح سخن کا کام باقاعدگی سے کرتے رہے۔ میں نے انہیں ہمیشہ کنائی سیل اسٹریٹ میں واقع ان کے مطب میں مریضوں کے درمیان گھرا ہوا یا فرصت کے اوقات میں دوائیں تیار کرتے ہوئے پایا (وہ دوائیں تیار کرنے کا کام خود انجام دیتے تھے) ان کا مطب کنائی سیل اسٹریٹ کے ایک گیراج نما کمرے میں تھا۔ میں دن میں دو تین بار ان کے مطب کے سامنے سے گزرتا اور انہیں ہمیشہ مصروف پاتا۔

علامہ رضا علی وحشت کو کلکتہ کے ادبی حلقوں میں وہی حیثیت حاصل تھی جو دلی کے شعری حلقوں میں علامہ سائل اور بیخود دہلوی کو۔ وہ بھی اسی قدیم شعری روایت کے پروردہ تھے جس کے اول الذکر دونوں شعراء۔ فرق صرف یہ تھا کہ سائل اور بیخود کا تعلق اردو شاعری کے سب سے بڑے مرکز دلی سے تھا اور وحشت کا تعلق اصل ادبی مرکز سے بہت دور کلکتہ سے۔ وحشت کے جد امجد حکیم غالب علی مرحوم کا آبائی وطن گرچہ دہلی تھا لیکن دلی کی تباہی کے بعد وہ بنگال کے ساحلی شہر ہگلی میں آکر آباد ہو گئے اور آگے چل کر ان کی اولادیں بنگالی نژاد کہلائیں۔ وحشت کے دادا حکیم غالب علی بھی شاعر تھے، لیکن ان کے بزرگوار مولوی شمشاد علی کو شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔

حضرت وحشت 18 نومبر 1881ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ 1908ء میں کلکتہ مدرسہ سے انٹر پاس کیا اور امپیریل ڈیپارٹمنٹ کے شعبہ فارسی میں چیف مولوی کے عہدے پر 1926ء تک فائز رہے۔ انہوں نے اگرچہ یونیورسٹی سے اعلیٰ سند حاصل نہیں کی تھی، لیکن ذاتی شوق اور مطالعے کے باعث انگریزی زبان و ادب پر خاصی دسترس حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ ملازمت کے دوران وہ اس دور کے اعلیٰ انگریز افسروں کو اردو اور فارسی

پڑھاتے تھے چنانچہ جب اسلامیہ کالج کلکتہ معرض وجود میں آیا تو انہیں ایم۔اے پاس نہ ہونے کے باوجود کالج میں اردو اور فارسی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 1936ء میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ 42ء سے 47ء تک لیڈی بریبورن کالج میں پڑھاتے رہے۔ وہ 1950ء میں ڈھاکہ چلے گئے جہاں جولائی 1956ء کو 75 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

علامہ وحشت غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔اس کا اندازہ ان کی شاعری کے علاوہ اس عہد کے مؤقر ادبی اور علمی جرائد میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین سے بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے نہایت اعلیٰ پائے کے جرائد، مثلاً مخزن، نگار، نقاد، دکن ریویو، اور اردوئے معلیٰ میں مرزا غالب، مولانا حالی، ولی دکنی، داغ دہلوی، عبدالغفور نساخ، غنیمت، شیخ علی حزیں، صادق خاں اختر اور سید محمود آزاد پر تحقیقی مضامین لکھ کر اہل نظر سے داد و تحسین وصول کی۔ وہ علامہ اقبال، حسرت موہانی، سیماب، جوش ملیح آبادی، بیخود دہلوی اور اثر لکھنوی کے ہم عصر تھے اور ان سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1910ء میں "دیوان وحشت" کے نام سے شائع ہوا تو حالی، شبلی، اقبال، اکبر الہ آبادی، حسرت، شرر، نظم طباطبائی، شاد عظیم آبادی، وفا رام پوری، ظہیر دہلوی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، صفی لکھنوی اور آزاد عظیم آبادی جیسے ماہرین فن اور نقادان سخن نے ان کے نام تحسین آمیز خطوط لکھے۔

وحشت، عبدالغفور نساخ کے شاگرد ابوالقاسم محمد مظہرالحق شمس کے شاگرد تھے اور انہوں نے 1896ء میں پندرہ سال کی عمر سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ 1905ء میں جب شمس نے رحلت فرمائی اس وقت ان کی عمر 24 سال تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا اور انہوں نے اپنے استاد کی روش کو چھوڑ کر غالب کا انداز بیان اختیار کیا اور تتبع غالب میں نام کمایا اور لوگوں نے انہیں غالب ثانی کا خطاب دیا جو میرے خیال میں ان کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ شدت کے ساتھ غالب کی تقلید کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اپنی کوئی انفرادیت پیدا نہیں ہوئی اور وہ غالب کی چھاپ بن کر رہ گئے۔ ان کے بعض انفرادی اشعار غضب کے ہیں، لیکن تقلید غالب نے آنے والے زمانے میں انہیں سرخرو کرنے سے زیادہ رسوا کیا۔ تقلید اور تتبع اس دور کا وتیرہ تھا۔ کسی بڑے شاعر کے رنگ میں شعر کہنا بہت بڑی بات تصور کیا جاتا تھا، لیکن انہیں کیا معلوم کہ وقت کس طرح اپنا رنگ بدل لیتا ہے اور اسی کے ساتھ شعر و ادب کا معیار بدل جاتا ہے۔ جو شاعر و ادیب وقت کے ساتھ خود کو بدل لیتے ہیں اور زمانے کا ساتھ دیتے ہیں وہ نام پیدا کرتے ہیں اور جو ایسا نہیں کرتے وقت انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ علامہ وحشت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اردو شاعری کے اساتذہ کی

مقام سیماب، آرزو، سائل اور بیخود کی صف میں محفوظ ہے۔

علامہ وحشت پرانے زمانے کے ہونے کے باوجود بڑے لبرل، روشن خیال اور منکسر المزاج تھے اس کا اندازہ مجھے 1949ء میں اس وقت ہوا جب انجمن ترقی پسند مصنفین (کلکتہ) کی طرف سے یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ میں آل انڈیا ہندی اردو مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کے چیف آرگنائزر پرویز شاہدی تھے اور جس میں میں محض ایک ورکر کی حیثیت سے شریک تھا۔ اس مشاعرے میں فراق گورکھپوری، اسرارالحق مجاز، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے انتہا پسندی کا دور شروع ہو چکا تھا، چنانچہ اسی مشاعرے میں مجروح نے وہ مشہور غزل پڑھی جس کے ایک شعر میں ارض ماسکو کو سرخ سلام بھیجا گیا تھا۔ نیاز حیدر نے بھی بڑی انقلابی نظم سنائی تھی اور پرویز شاہدی نے "یانگ سی کو سلام" والی نظم پڑھی تھی۔ مجاز اور ساحر کی نظمیں قدرے نرم لہجے کی تھیں، لیکن کیفی اور جعفری کی نظمیں بڑی گرم تھیں۔

حضرت وحشت سے پرویز شاہدی کے بڑے نیاز مندانہ مراسم تھے۔ پرویز شاہدی کی خواہش تھی کہ اس کل ہند مشاعرے کا افتتاح کسی بزرگ ہستی سے کرایا جائے اور یہ بزرگ ہستی علامہ وحشت کے سوا اور کوئی نہ تھی، چنانچہ پرویز شاہدی نے جب ان سے درخواست کی تو وہ آمادہ ہو گئے۔ ذرا سوچیے! کہاں علامہ وحشت جیسے قدیم اسکول کے شاعر اور کہاں ترقی پسند تحریک (اور وہ بھی 50ء کے عشرے کی انتہا پسندانہ ترقی پسندی) لیکن یہ حضرت وحشت کی رواداری اور آزاد خیالی تھی کہ انہوں نے اس "خطرناک" مشاعرے کا نہ صرف افتتاح کیا بلکہ اس میں انہوں نے اپنی غزل بھی سنائی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس مشاعرے میں ان کے ساتھ دبستان آرزو کے نہایت مشہور اور معتبر شاعر جرم محمد آبادی بھی تشریف لائے تھے۔

اس مشاعرے میں جس قسم کی انقلابی نظمیں پڑھی گئیں اور جس طرح بار بار اسٹالن اور ماؤ کو سرخ سلام پیش کیا گیا وہ کلکتہ کے معاصر اخبار "اسٹیٹس مین" سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اس کے خلاف ایک اداریتی نوٹ لکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے ہی روز پرویز شاہدی کے خلاف پروانہ گرفتاری جاری ہو گیا۔ مہمان شعراء کے رخصت ہوتے ہی پرویز شاہدی روپوش ہو گئے۔ ان دنوں وہ رپن کالج میں لکچرر تھے۔ وہ چند روز روپوش رہنے کے بعد ایک مقامی شاعر اقبال کلکتوی کی مخبری پر گرفتار کر لیے گئے۔

حضرت وحشت کا پہلا شعری مجموعہ "دیوان وحشت" 1909ء میں ستارہ ہند پریس، کلکتہ سے

شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعہ "ترانہ وحشت" 1951ء میں مکتبہ جدید (لاہور) سے شائع ہوا۔ جس میں ان کا "دیوان وحشت" بھی شامل تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "مضامین وحشت" کے نام سے مغربی بنگال اردو اکیڈیمی نے شائع کیا۔ حضرت وحشت کے لاتعداد شاگرد تھے لیکن جن شاگردوں نے بعد میں شہرت حاصل کی ان میں جمیل مظہری، سلیم اللہ فہمی (آئی۔ سی۔ ایس) طاہر علی شاکر، احمد احسن اشک، ڈاکٹر طاہر رضوی، پروفیسر عباس علی بیخود، تاباں القادری، کیپٹن قمر صدیقی، رشید الزمان خلش، منشی مسیح الدین تمنا، عبدالرحمن آصف اور میجر مرزا جعفر کشفی وغیرہ شامل ہیں۔

کلکتہ کے بزرگ اور معروف شاعروں میں آرزو لکھنوی کا نام بہت نمایاں تھا۔ انہوں نے خالص اردو میں شاعری کرنے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ان کا وطن یوں تو لکھنو تھا، لیکن کلکتہ میں طویل قیام کے باعث انہیں کلکتے کا باشندہ کہنا غلط نہیں ہے۔ جیسے میر اور غالب کو دہلوی کہنا غلط نہیں، اگرچہ ان کا وطن مولود آگرہ تھا۔ حضرت آرزو کا اصل نام انور حسین اور تخلص آرزو تھا۔ ابتدا میں وہ امید تخلص کرتے تھے۔ وہ 18 فروری 1873ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ذاکر حسین بھی اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے اور یاس تخلص کرتے تھے۔ آرزو نے جب شاعری شروع کی تو شفیق باپ نے انہیں اپنے استاد جلال کے حلقہ تلامذہ میں شامل کر دیا۔ حضرت جلال اپنے وقت کے مسلم الثبوت صاحب فن تھے۔ آرزو نے بھی فن شعر کی طرف پوری توجہ دی اور امام فن و مجتہد زمان مانے گئے۔ انہوں نے شعر گوئی کے علاوہ کئی فنی رسالے بھی لکھے جن میں نظام اردو اور میزان الحروف بہت مشہور ہیں۔

آرزو محض شاعر نہیں تھے، ڈراما نویس بھی تھے، چنانچہ ان کے پانچ ڈرامے کلکتہ کے پارسی تھیٹریکل کمپنی، کارنتھین تھیٹریکل کمپنی اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج کئے۔ ان کی شاعری کی شہرت سے متاثر ہو کر کلکتہ کی مشہور فلم ساز کمپنی، نیو تھیٹر نے (جس نے اپنی عمدہ، معیاری اور مہذب فلموں کی وجہ سے صنعت فلم سازی میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا) 1936ء میں ان کی خدمات حاصل کیں اور وہ اس کے لیے فلمی گانے لکھنے لگے۔ اس دور میں جن مشہور فن کاروں اور موسیقاروں نے ان کی غزلیں اور نغمے گائے ان میں کے۔ ایل۔ سہگل۔ پنکج ملک۔ کے سی ڈے۔ پہاڑی سانیال اور کانن دیوی شامل ہیں۔ ان کے نغمے ترتیب دینے والوں میں آر۔ سی۔ بورال اور پنکج ملک بہت مشہور ہیں۔ وہ 1936ء سے 1942ء تک کلکتہ میں رہے۔ اس کے بعد وہ 42ء میں بمبئی کی مشہور، نیشنل فلم کمپنی کے بلاوے پر بمبئی چلے گئے اور 1951ء تک وہاں قیام کیا۔

آرزو لکھنوی کا کلکتے کا قیام اگرچہ صرف چھ سال پر مشتمل تھا، لیکن ان کا ورود مسعود کلکتہ کے اہل سخن کے لیے مفید اور بابرکت ثابت ہوا اور انہوں نے ان کی شاعرانہ صلاحیت سے بھرپور استفادہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شاعروں کی بہت بڑی تعداد نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر دیا۔ ان کے جن شاگردوں نے آگے چل کر نام پیدا کیا ان میں (ابوالحسن) جرم محمد آبادی، (شہادت حسین) نازش سکندر پوری (عبدالحق) سوز (سراج احمد) سراج (سید محمد) ناوک لکھنوی، منیر لکھنوی (آرزو لکھنوی کے خلف اصغر) (شہنشاہ حسین) ارم، لائق دہلوی اور (سید اظہر حسین نقوی) پرتو شامل ہیں۔

میں ہوٹل میں بیٹھا کلکتہ کے ادبی ماحول اور ان ادیبوں اور شاعروں کو یاد کرتا رہا، جن کو میں نے قریب سے دیکھا تھا یا جن کی سرپرستی میں میری ادبی اور ذہنی تربیت ہوئی تھی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ دوسری جنگ عظیم کا ابتدائی دور تھا یعنی 40ء کا عشرہ۔ اس وقت جن اخبارات و جرائد سے روشناس ہوا۔ ان میں روزنامہ "ہند" اور "عصر جدید" ماہنامہ "عالمگیر" (لاہور) خیام (لاہور) چونچ (کلکتہ) ماہنامہ "جدید اردو" (کلکتہ) اور نقاش (کلکتہ) یاد ہیں۔ میرے بڑے بھائی کو رسائل و اخبارات کے مطالعے کا بڑا شوق تھا اور وہ مذکورہ بالا اخبارات و جرائد باقاعدگی سے گھر پر لاتے تھے، چنانچہ میں نے ہوش سنبھالتے اور اردو سیکھتے ہیں جن جرائد کا مطالعہ شروع کیا۔ ان میں مذکورہ بالا رسائل شامل ہیں۔ ان رسائل کے مندرجات سے لطف اٹھانا تو مشکل تھا، البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھ میں مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا۔

اس دور میں میں جن جرائد کا بہت انہماک اور باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرتا تھا ان میں ہفت روزہ "خیام" (لاہور) اور ہفت روزہ "نقاش" (کلکتہ) اور "جدید اردو" (کلکتہ) شامل ہیں۔ اس دور میں جن ادبا کے نام سے واقف ہوا ان میں عبدالرحیم شبلی بی۔ کام، احسان بی۔ اے، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، یونس نظیری (ایڈیٹر نقاش) ش مظفرپوری، افسر ماہ پوری، یونس احمر اور شیدا کوروی (شیدا امام) احسن احمد اشک، شمیم پھلواروی اور پرویز شاہدی وغیرہ شامل ہیں۔ بعد کے دور میں ش مظفرپوری، یونس احمر اور پرویز شاہدی سے کلکتے میں اور افسر ماہ پوری سے ڈھاکہ میں متعارف ہوا اور ان کی مشفقانہ سرپرستی میں شعر و ادب کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ اس کے فوراً بعد جن ادبا کے نام سے واقف ہوا۔ ان میں اختر پیامی، انور عظیم، نشاط مظفرپوری (نشاط الایمان) ادیب سہیل اور یوسف امام شامل ہیں۔ ان سے واقفیت کی اصل وجہ ترقی پسند تحریک سے میری دلچسپی تھی۔ یہ تمام شعرا و ادبا ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے۔

کلکتہ میں یوں تو کئی ادبی انجمنیں قائم تھیں، مثلاً "بزم ادب" "اردو مجلس" "دبستان آرزو" "بزم شاکری" "مسلم لٹریری سوسائٹی" اور انجمن ترقی اردو وغیرہ، لیکن ان میں صرف دو چار انجمنیں ایسی تھیں، جو فعال تھیں۔ باقی ماندہ انجمنیں سال میں ایک دو بار مشاعرے یا یوم اقبال اور یوم حالی منعقد کرنے تک محدود تھیں، البتہ بزم شاکری اور دبستان آرزو کی شعری نشستیں اور مشاعرے باقاعدگی سے ہوتے تھے، لیکن کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام بہت بڑا اور انقلابی واقعہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ انجمن چند ترقی پسند اور انقلابی نوجوان ادیبوں نے ہی قائم کی تھی، جن میں یونس احمر، نشاط الایمان اور ضیار آبادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ 1947ء میں اس وقت ترقی پسند تحریک برصغیر کی سب سے بڑی، موثر اور فعال تحریک بن کر ابھری تھی اور زمانہ جنگ اور قحط بنگال کے دوران اس نے ہندوستان کے نوجوان طبقے کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا تھا، چنانچہ آزادی سے کچھ پہلے یونس احمر اور نشاط الایمان نے انجمن آزاد مصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی جانب سے ایک رسالہ "نئے دھارے" بھی جاری ہوا۔ جس کے صرف دو شمارے شائع ہوئے۔ اس کے مدیر یونس احمر اور مہدی رضوی تھے۔ اس کی چند نشستیں ہوئی تھیں کہ سجاد ظہیر کے مشورے سے اس کا نام بدل کر انجمن ترقی پسند مصنفین رکھ دیا گیا۔

کلکتہ کا ادبی ماحول بڑا روایت پسند تھا اور یہاں کے زیادہ تر شعرار روایتی طرز کی رسمی شاعری کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس دور کے تین روایت پسند شعرا وحشت، آرزو اور ناطق لکھنوی تھے۔ یہی تینوں اس دور کے کلکتے کے بڑے شعرار شمار کئے جاتے تھے۔ اردو ادب میں اگرچہ ترقی پسند رجحانات عام ہو رہے تھے اور لاہور، دہلی، لکھنو اور حیدرآباد میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریک نہایت تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی، لیکن کلکتہ کے قدامت پسند شعرا ملک کے عام ادبی دھارے سے کٹ کر روایت کے اندھے کنوئیں میں بسر کر رہے تھے۔ کلکتہ میں اس وقت تک جدید عہد کی کوئی ایسی قد آور شخصیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو نئی نسل کے جواں سال ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کرتی۔ ایسی صورت میں 47-1946ء میں پرویز شاہدی کا کلکتہ میں ورود ہوا۔ یہ کلکتے کی ادبی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ پرویز شاہدی اگرچہ پٹنہ سٹی کے محلہ لوری کٹرہ میں 1911ء میں پیدا ہوئے، لیکن میٹرک کلکتہ سے، اردو اور فارسی میں ایم۔اے پٹنہ سے اور پھر بی۔ٹی 1938ء میں کلکتہ سے کیا تھا۔ ان کی زندگی کا بیشتر عرصہ کلکتے میں گزرا۔ وہ کلکتہ کے مؤقر ادبی جریدہ "جدید اردو" کی دس سال تک مسلسل ادارت کرتے رہے۔ یہ رسالہ فروری 1938ء میں نکلا اور جون 1947ء میں بند ہو گیا۔ پرویز شاہدی ابتدار میں خالص رومانی شاعر تھے، لیکن وہ کلکتہ کے پہلے شاعر تھے، جنہوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کا اثر قبول کیا اور

وہ روایتی شاعری ترک کر کے انقلابی شاعری کرنے لگے۔ مدنا پور (مغربی بنگال) میں قیام کے دوران انہوں نے مارکسزم کا مطالعہ کیا اور وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور بہت جلد کلکتہ کے نئے اور جواں سال ادیبوں اور شاعروں کے ہیرو بن گئے۔ پرویز شاہدی پہلے ہی کلکتہ کے ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ ترقی پسندی کی لہر نے پہلی بار کلکتہ کے نوجوان شاعروں کو روایتی شاعری کی ڈگر سے ہٹا کر نئے طرز کی شاعری سے متعارف کرایا اور وہ پرویز شاہدی کے گرد جمع ہو گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پہلے ہی قائم ہو چکی تھی، اس میں پرویز شاہدی کی شمولیت سے مزید جان پڑ گئی۔ پھر اس انجمن میں اختر پیامی، ادیب سہیل، مہدی رضوی، یوسف امام، انور شاہد، حسن نعیم، مظہر امام، سالک لکھنوی، انور جمال، ابراہیم ہوش، یعقوب عارف (ہوشیار پوری) مظہر انصاری، اشک امرت سری فاتح فرخ، قیصر شمیم، شمس صابری، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، جاوید نہال، ناظر الحسینی، احسان دربھنگوی، رونق نعیم، ظہیر غازی پوری، اویس احمد دوراں، مضطر حیدری، ابوالخیر محمد فاروق اور بے شمار دوسرے نئے ادیب و شاعر شامل ہو گئے۔ انجمن کی نشستوں میں جن مقتدر ہستیوں نے شرکت کی۔ ان میں جگر مراد آبادی، راجندر سنگھ بیدی اور پروفیسر ممتاز حسین شامل ہیں۔ جرم محمد آبادی جیسے روایت پسند لیکن لبرل مزاج شاعر بھی گاہے گاہے شرکت کرتے رہے۔ 50-1949ء میں پرویز شاہدی گرفتار کر کے نظربند کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد وہ سی۔ ایم۔ او اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ نومبر 1955ء میں سخاوت میموریل گرلز اسکول کی فضیلت النساء بیگم سے ان کی شادی ہو گئی۔ وہ 1956ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ 1957ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "رقص حیات" شائع ہوا اور وہ 5 مئی 1968ء میں 58 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد اسی سال ان کا دوسرا شعری مجموعہ "تثلیث حیات" شائع ہوا۔ پرویز شاہدی نے اپنے طلباء کو فکری اعتبار سے بہت متاثر کیا اور ان کے زیادہ تر طلباء آگے چل کر بہت اچھے شاعر اور ادیب ثابت ہوئے جن میں اعزاز افضل اور اسد الزماں اسد وغیرہ شامل ہیں۔

ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی جب کوئی شناسا چہرہ ہوٹل میں داخل نہیں ہوا تو میں نے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ آخر میں کب تک یہاں بیٹھا نامعلوم شخص کا انتظار کرتا؟ کلکتے کی ادبی محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ اکیس سال کے دوران میرے سارے شاعر و ادیب دوست یا تو کلکتہ چھوڑ چکے تھے (جیسے مظہر امام، رونق نعیم، اویس احمد دوراں، ظہیر غازی پوری اور ابوالخیر محمد فاروق وغیرہ) یا پھر ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ جیسے ناظر الحسینی، محمد طیب اور مضطر حیدری وغیرہ۔

مضطر حیدری کی یاد آتے ہی ان کا چہرہ نظروں کے سامنے پھر گیا۔ وہ اسی ہوٹل کے اوپر والی منزل ں اپنی بہن کے ساتھ رہتے تھے جو اپنے دور کی مشہور مغنیہ تھیں۔ ان کا تعلق اہل نشاط سے تھا اسی لیے ں میں شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی گہرا شعور تھا۔ وہ بھی تاباں القادری کی طرح صبح سے شام، بلکہ ات تک اسی ریستوراں میں بیٹھے رہتے تھے اور چائے پر چائے نوش کرتے رہتے تھے۔ ان میں شاعری ی بے پناہ صلاحیت تھی اور شعر بھی اچھا کہتے اور پڑھتے تھے، لیکن نشر و اشاعت خصوصاً رسائل میں لام چھپوانے سے بہت گھبراتے تھے۔ اس لیے ان کا بہت کم کلام محفوظ رہا ہے۔ وہ چونکہ انگریزی ے زیادہ واقف نہیں تھے۔ اس لیے کہیں ملازمت بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن وہ گفتگو کے آداب سے اقف تھے۔ ایک دفعہ ان کی کرشن چندر سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں مبئی بلا لیا اور وعدہ کیا کہ وہ انہیں بمبئی میں کسی فلم ساز سے کہہ کر گانا لکھنے کی ملازمت دلوا دیں گے، چنانچہ مضطر کے بمبئی پہنچتے ہی وہ انہیں اپنے ساتھ ایک فلم ساز دوست کے پاس لے گئے اور انہیں ایک ہزار روپے ماہوار کی ملازمت دلوا دی، لیکن مضطر فلمی دنیا کے ماحول میں زیادہ دن تک نہ ٹک سکے اور کلکتہ بھاگ آئے۔ انہوں نے کلکتہ آکر بتایا کہ فلمی دنیا میں ساحر مجروح شکیل، حسرت جےپوری اور شیلندر وغیرہ کی اجارہ داری ہے وہاں کسی نئے اور گمنام شاعر کے لیے نغمہ نگار کی حیثیت سے گنجائش نہیں نکل سکتی، البتہ گھوسٹ رائٹنگ" کے لیے آمادہ ہوں، تو اس کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گھوسٹ رائٹنگ اسے کہتے ہیں کہ گانا کوئی دوسرا شخص لکھے اور وہ فلم میں کسی دوسرے کے نام سے شامل ہو۔ اس کے عوض ہزار پانچ سو روپے مل جائیں۔ مضطر اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے اور انہیں مجبوراً کلکتہ واپس آنا پڑا۔

میرے پاکستان آنے کے بعد معلوم ہوا کہ مضطر سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے اپنی بیماری سے تنگ آکر ویلسلی اسکوائر کے تالاب میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ خودکشی کرنے سے قبل انہوں نے علاقے کے تھانہ انچارج کو خط لکھا کہ ان کی موت کے لیے ان کے سوا کوئی دوسرا شخص ذمہ دار نہیں ہے۔

میں نے سوچا کہ اگر مرحوم مضطر حیدری زندہ رہتے تو مجھے آج اتنی دیر تک کسی کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ ان سے میری ضرور ملاقات ہو جاتی۔

میں اسی خیال میں کھویا ہوا تھا کہ جاوید نہال کا چہرا نظر آیا اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔ خدا خدا کر کے کوئی تو شناسا چہرہ نظر آیا۔ جاوید نہال سے ملاقات ہونے پر میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ جاوید نہال

میرا بہت پرانا دوست تھا اور ہم نے اخبارات میں عرصے تک ساتھ کام کیا تھا۔ وہ اگرچہ پیشے کے اعتبار سے لیکچرر تھا لیکن وہ اخبارات میں بھی جز وقتی مترجم اور رپورٹر تھا۔ وہ "آزاد ہند" میں اسپورٹس رپورٹر تھا اور میں "عصر جدید" میں رپورٹر۔ وہ افسانے بھی لکھتا تھا اور ادبی مضامین بھی۔ اس نے ایک دن اردو ادب میں ڈاکٹریٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے "انیسویں صدی میں بنگال میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کا موضوع منتخب کیا اور میرے پاکستان آنے کے بعد اپنا یہ مقالہ یونیورسٹی میں داخل کیا اور ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر لی۔ اب وہ نہ صرف اسلامیہ کالج (مولانا آزاد کالج) سے وابستہ ہے، بلکہ کلکتہ یونیورسٹی میں بھی جز وقتی لیکچرر ہے۔ اس نے افسانہ نگاری ترک کر کے تنقید نگاری شروع کر دی ہے اور اس میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اب اس کا بیٹا بھی کسی کالج میں لیکچرر ہے۔

وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا اور اپنے بچوں سے تعارف کرای۔ ہم دونوں کو جدا ہوئے عرصہ بیت چکا تھا۔ اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس لیے ہم زیادہ تر ماضی کے سنہرے دنوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

مدرسہ عالیہ

کلکتہ کے قیام کے دوران میں ایک روز مدرسہ عالیہ بھی گیا، تاکہ "نساخ سے وحشت تک" کے مصنف اور محقق سید لطیف الرحمن سے مل سکوں۔ وہ اسی مدرسے میں معلم تھے اور نہایت انہماک اور لگن کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں شہرت اور تشہیر کی قطعی طلب نہیں تھی اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔ اکیس سال کے دوران دنیا بدل چکی تھی۔ مدرسے کے عملے میں سارے لوگ نئے تھے۔ میرے تمام شناسا یا تو ریٹائر ہو چکے تھے یا اللہ کو پیارے۔ نئے اسٹاف میں میری کسی سے بھی روشناسی نہیں تھی، حالاں کہ ایک دور میں سعید احمد اکبر آبادی، رضا مظہری اور وکیل اختر اس مدرسے کے پرنسپل رہ چکے تھے اور ان تینوں سے میری یاد اللہ تھی۔ وکیل اختر سے تو میری گہری دوستی بھی تھی۔ وہ بہت اچھا شاعر تھا اور اس کے کلام میں بڑی تازگی تھی۔ افسوس! بہت کم عمری میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سعید احمد اکبر آبادی اور رضا مظہری میرے بزرگوں میں سے تھے اور ان سے میرے نیاز مندانہ مراسم تھے۔ سید لطیف الرحمن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ کہاں رہتے ہیں؟ اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ ان سے نہ ملنے کا بڑا افسوس ہوا۔ میں تنہا گھوم پھر کر اس تاریخی مدرسے کی عمارت کا جائزہ لینے لگا جو بہت بوسیدہ ہو چکی تھی اور رنگ و روغن سے محروم تھی۔

کلکتہ مدرسہ (جس کا اصل نام مدرسہ عالیہ ہے) بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے، جسے قائم ہوئے 210 سال ہو چکے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس مدرسے کا نام اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں منعقدہ تاریخی مشاعرے میں مرزا غالب اور اس دور کے شعرائے کرام کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہوئی تھی، جس نے بہت عرصے تک اردو شعر و ادب میں ہنگامہ برپا رکھا تھا۔ آج سے

ٹھیک 210 سال قبل ستمبر 1780ء میں کلکتہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک وفد نے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کی اور ان سے ایک ایسی درس گاہ قائم کرنے کی درخواست کی، جہاں مسلمان طلبار جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت اور فقہ کے مطابق تعلیم حاصل کر سکیں اور سرکار بہادر کی خدمات بھی انجام دے سکیں۔ وفد نے اس ضمن میں مولانا مجیدالدین نامی ایک عالم و فاضل شخص کا نام بھی لیا، جو یہ فریضہ بطور احسن انجام دے سکتے ہیں۔ وارن ہیسٹنگز کو یہ تجویز پسند آئی اور انہوں نے 1780ء میں مولانا مجیدالدین کو اسکول قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ وارن ہیسٹنگز نے اسکول کے قیام کے لیے اکتوبر 1780ء سے اپریل 1781ء تک اپنی جیب خاص سے 625 روپے ماہانہ ادا کئے۔ اس دور میں 625 روپے بہت بڑی رقم تصور کی جاتی تھی۔ جب مزدوروں کو کوڑیوں میں اجرت ادا کی جاتی تھی۔ چند دنوں کے بعد وارن ہیسٹنگز نے بیٹھک خانہ (سیالوہ) کے قریب پد پوکھر میں 5641 روپے میں اسکول کی عمارت کے لیے ایک قطعہ اراضی خریدی۔ 1781ء میں ہیسٹنگز نے اسکول کے بورڈ آف گورنرز میں تجویز پیش کی کہ اب عمارت کی تعمیر اور مدرسے کے تمام اخراجات حکومت کو پورے کرنے چاہیئں۔ بورڈ نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ 3 جون 1782ء کے ایک سرکاری اعلان نامے کے مطابق وارن ہیسٹنگز نے حکومت سے اسکول کے سلسلے میں اپنی جیب خاص سے خرچ کی ہوئی رقم 5251 روپے اور قطعہ اراضی خریدنے کے لیے 5641 روپے واپس کرنے کی درخواست کی۔ جسے بورڈ نے منظور کر لیا۔ دستاویزات کے مطابق مدرسہ عالیہ کی عمارت جون 1782ء میں بہو بازار کے جنوب میں اس جگہ تعمیر ہوئی جہاں اس سے قبل چرچ آف اسکاٹ لینڈ کا زنانہ مشن واقع تھا، لیکن یہ مقام اس دور میں بہت ہی گندہ اور طلبار کی صحت کے لیے مضرت رساں ثابت ہوا، چنانچہ اس کو کالنگہ (موجودہ ویلسلی اسکوائر) میں منتقل کر دیا گیا اور جون 1823ء میں حکومت نے زمین اور عمارت کی تعمیر کے لیے 140537 روپے (ایک لاکھ چالیس ہزار پانچ سو سینتیس روپے ادا کئے۔ 15 جولائی 1824ء کو مدرسہ عالیہ کی موجودہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی تعمیر پر تین سال صرف ہوئے اور اگست 1827ء سے مدرسہ عالیہ میں باقاعدہ درس و تدریس شروع ہوئی۔

وارن ہیسٹنگز برطانوی ہند کی تاریخ میں رسوائے زمانہ حکمراں گزرا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے سلطنت اودھ پر فوج کشی کے دوران رعایا اور نوابین پر بے پناہ مظالم ڈھائے، خصوصاً بیگمات اودھ کے ساتھ انتہائی نازیبا سلوک کیا۔ اس کے ظلم سے رعایا اس قدر دہشت زدہ تھی کہ جب وائسرائے ہند کی سواری کسی قصبہ یا دیہات سے گزرتی تو لوگ پورا قصبہ چھوڑ کر فرار ہو جاتے تھے۔

ایک جانب اس کے بارے میں یہ ساری داستانیں مشہور تھیں۔ دوسری جانب اس نے بنگال کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح اپنی جیب خاص سے مدرسہ قائم کیا۔ وہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

میں مدرسہ عالیہ کی اس تاریخی عمارت کو چاروں جانب سے گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا اور تاریخ کے جھروکے میں جھانک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ مدرسہ قائم نہ ہوتا تو ہندوستانی مسلمان مزید کتنے پس ماندہ رہ جاتے۔ یہ درست ہے کہ بنگال میں کوئی سرسید پیدا نہیں ہوا، لیکن سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کی ابتداء میں قائم ہونے والی اس درس گاہ کی تاریخی اور معاشرتی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ یہی وہ درس گاہ ہے جہاں سے بنگال کے مسلمان پڑھ لکھ کر میدان سیاست میں وارد ہوئے اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے حصول کے بعد علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

کلکتہ کالج آف آرٹس

میں جب کلکتہ میوزیم سے باہر نکلا تو اس کے بغل میں واقع "کلکتہ کالج آف آرٹس" میں تصویروں کی سالانہ نمائش ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ نمائش کو دیکھتا چلوں۔ معلوم نہیں پھر کبھی اسے دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ سالانہ نمائش میں کامیاب ہونے والے طلبار کے علاوہ اساتذہ کی تصاویر بھی رکھی جاتی ہیں۔ میں جب کلکتے میں تھا تو اپنے دوستوں ابوالخیر محمد فاروق اور محمد طیب کے ساتھ عموماً یہاں آیا کرتا تھا۔ کالج کی گیلری مین طلبار کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے مشہور مصوروں کی تصویروں کی نمائش بھی ہوا کرتی تھی۔ اس طرح اس گیلری کو کلکتہ کی ثقافتی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

میں جب کالج میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ایک دیوار گیر تختی پر نظر پڑی جس پر کالج کے گذشتہ اور موجودہ پرنسپلز کے نام نمایاں طور پر لکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نام عبدالرحمن چغتائی کا بھی تھا. جس سے معلوم ہوا کہ برصغیر کا یہ نابغہ روزگار مصور مصوری کی اس درس گاہ میں نہ صرف استاد بلکہ پرنسپل بھی تھا۔ عبدالرحمن چغتائی کے علاوہ اس درس گاہ سے اتولیہ بوس اور جیمنی رائے جیسے عالمی شہرت یافتہ مصور بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ یہ وہ مصور تھے، جنہوں نے مصوری میں نہ صرف بنگال بلکہ برصغیر ہندوستان کے نام کو روشن کیا اور دنیائے مصوری میں اپنے لیے مقام بھی پیدا کیا تھا۔ تصویروں کی نمائش میں دو خاص باتیں تھیں۔ اول، یہ کہ اس میں تجریدی اور نیم تجریدی تصاویر بہت کم تھیں۔ دوم یہ کہ جن مشہور اور بڑے مصوروں نے اس نمائش میں رسمی طور پر اپنی تصاویر بھیجی تھیں، انہوں نے خود کو مقابلے سے باہر رکھا تھا، تاکہ ابھرتے ہوئے مصوروں کو کامیابی کے مواقع حاصل ہوں اور محض ان کی وجہ سے نئے اور ابھرتے ہوئے مصور انعامات حاصل کرنے سے محروم نہ رہ جائیں۔ مجھے بڑے اور مشہور مصوروں کی یہ بات اچھی لگی۔ نمائش میں تجریدی اسٹائل کی تصاویر کی کمی کی وجہ یہ سمجھ

میں آئی کہ اس میں زیادہ تر کالج کے طلبار نے حصہ لیا تھا۔ جنہیں ابتدار میں کلاسیکی طرز کی حقیقت پسندانہ مصوری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سند حاصل کرنے کے بعد ہر مصور کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس اسٹائیل میں چاہے تصویریں بنائے۔ یہ نہیں کہ مصوری کی بنیادی تعلیم حاصل کرنے سے قبل ہی تجریدی مصوری شروع کر دے۔ جس طرح ہمارے افسانہ نگار کلاسیکی طرز کے افسانے لکھنا سیکھنے سے قبل تجریدی افسانے لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

میں نمائش دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ برصغیر ہندوستان میں جدید طرز کی مغربی مصوری کب اور کیسے شروع ہوئی؟ اس لیے کہ ہندوستان کی قدیم کلاسیکی مصوری کی تاریخ یوں تو کئی ہزار سال قبل از مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی بہترین مثال اجنتا اور ایلورا کی مصوری ہے جو بدھ عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مصوری نے مختلف روپ اور مختلف اسلوب اختیار کئے اور کبھی مغل، کبھی راجپوت اور کبھی کانگرہ اسٹائیل کا نام اختیار کیا، لیکن جدید یورپی مصوری، خصوصاً حقیقت پسندانہ مصوری کی قدیم ہندوستان کی مصوری کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی ابتدار کب سے ہوئی؟ راجہ روی ورما نے مغربی طرز کی مصوری کہاں سے سیکھی؟

غور کرنے پر مجھے یاد آیا کہ اس کی ابتدار بھی کلکتے سے ہی ہوتی ہے اور وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد، خصوصاً جنگ پلاسی میں کامیابی کے بعد، فرنگیوں کے سیاسی اقتدار سنبھالتے ہی مغرب سے گمنام مصوروں کی کلکتہ آمد شروع ہو چکی تھی اور ان کی ہندوستان آمد کا واحد مقصد حصول زر تھا۔ اس وقت تک اہل برطانیہ کو اس امر کی اطلاع مل چکی تھی کہ ہندوستان سونے کی ایک ایسی چڑیا ہے، جہاں جا کر زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جا سکتی ہے، چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں انگلینڈ سے نہ صرف تجارت پیشہ، طالع آزما اور ایڈونچر پسند لوگ اور عام سپاہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں بھرتی ہو کر دھڑا دھڑ ہندوستان آ رہے تھے، بلکہ ہیئر ڈریسر ماہر درزی، جادوگر، سرکس کے کرتب باز، اداکار اور مصور بھی بڑی تعداد میں کلکتہ پہنچ رہے تھے۔ ابتدار میں برطانوی معاشرے کے نچلے طبقے کے لوگ ہندوستان آئے اور ان کے بہت بعد اعلیٰ طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور ان گنی لوگوں کی آمد سے کلکتہ میں ایک بالکل نئے کلچر نے جنم لیا۔ جو نہ خالص ہندوستانی تھا اور نہ خالص مغربی، بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک نیا کلچر پیدا ہوا۔ اس وقت تک بنگال میں نئے زمینداری نظام کے قیام سے بنگالی ہندوؤں کا زمین پر منحصر نیا طبقہ اشرافیہ (لینڈیڈ ارسٹوکریسی) پیدا ہو

چکا تھا۔ اسی کے ساتھ اعلیٰ سرکاری افسروں پر مبنی نہایت دولت مند فرنگی بیوروکریٹ طبقہ بھی جنم لے چکا تھا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک جو برطانوی مصور اور انگریز ہندوستان آئے۔ ان کی کوئی باقاعدہ تاریخ تو نہیں ہے، البتہ اس دور کے اخبارات میں ان مصوروں کے بارے میں جو کچھ شائع ہوا ہے۔ اس کے مطالعے سے اس دور کے مصوروں اور مصوری کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اس دور کی بعض تصاویر (اور لیتھوگراف) کی ایجاد کے نتیجے میں ان تصاویر کی ری پرنٹس آج بھی کتابی صورت میں محفوظ ہیں۔ اس عرصے میں جو مصور لندن اور پیرس سے کلکتہ پہنچتے تھے۔ وہ اس دور کے اخبارات مثلاً "کلکتہ گزٹ" اور "ہرکارہ" وغیرہ میں بڑے بڑے اشتہارات کے ذریعے ہندوستانیوں کو مصوری کی تعلیم کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ وہ یہ تعلیم صرف اپنے گھروں میں ہی نہیں بلکہ ان کے گھروں پر جاکر بھی دینے کے لیے آمادہ رہتے تھے، بشرطیکہ انہیں اس کی معقول فیس ادا کی جائے۔ چنانچہ 1784ء میں اخبار "کلکتہ گزٹ" میں اس نوع کے ایک اشتہار کا نمونہ آج بھی نیشنل لائبریری کی فائل میں محفوظ ہے۔

یہ مصور کوئی نامی گرامی فن کار نہ تھے، لیکن وہ اپنے فن کے ماہر ضرور تھے اور چونکہ مغرب میں رینے ساں کے عہد میں بوتچیلی، لیونارڈوراونچی، مائیکل انجلو، ٹیشین، رافیل، روبنیس، ریمبراں اور گویا جیسے عظیم مصور پیدا ہو چکے تھے اور یورپی مصوری پر ان اساتذہ کے فن کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اس لیے یہ سارے مصور بھی انہی کی روایت کے امین اور پاسبان تھے اور وہ اپنے فن کے ساتھ ان روایات کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے، لہذا انہوں نے متمول گھرانے کے ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں (بڑے زمین داروں) کی اولادوں کو مصوری کی جو تعلیم دی وہ دراصل مغرب کی جدید مصوری کی ہی تعلیم تھی۔ اس طرح ہندوستان کا ابھرتا ہوا لینڈیڈ ارسٹوکریٹ طبقہ ان مصوروں کے ذریعے مغربی مصوروں اور مصوری سے متعارف ہوا۔ ان کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ملک بازار کے مشہور راجہ اندر ملک کے عظیم الشان ماربل ہاؤس میں دنیا کے عظیم مصور روبنس کی دو اوریجنل تصاویر موجود تھیں، جنہیں دیکھنے کے لیے باذوق لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ خیال اغلب ہے کہ راجہ روی ورما اور ان کے ہم عصروں نے جدید مصوری کی تعلیم انہی مغربی مصوروں سے حاصل کی ہوگی۔ اس دور میں صرف بنگالی زمیندار طبقہ ہی اتنی مالی استطاعت رکھتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو خطیر معاوضہ ادا کر کے مغربی مصوری کی تعلیم دلائے۔ اس دور میں صرف دو طرز کی تصویریں بہت مقبول تھیں۔ ایک پورٹریٹ

اور دوسری لینڈ اسکیپ۔ بڑے بڑے اور متمول فرنگی اور ان کے جانشین ہندو زمیندار اپنی جاہ وحشمت کے مظاہرے اور اپنی شاہانہ حیثیت کو تصویروں میں محفوظ کر لینے کے لیے ہزاروں روپے معاوضہ ادا کر کے اپنا قد آدم پورٹریٹ بنوایا کرتے تھے اور پھر انہیں اپنے محل نما گھروں میں آرائش کے لیے آویزاں کر دیتے تھے۔ اس قسم کی بہت سی تصاویر آج بھی وکٹوریہ میموریل اور لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ جن سے اس عہد کی مصوری کے رجحان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ رجحان اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک لیتھو گرافک پریس ہندوستان نہیں پہنچا۔ 22-1820ء میں کلکتہ میں پہلی بار لیتھو گرافک پریس قائم ہوا اور اسی کے ساتھ باتصویر کتابوں کی اشاعت اور تصویروں پر مشتمل البم کی چھپائی شروع ہوئی۔ یہ پریس اس دور کے دو فرانسیسی مصوروں موسیو بیل نوس (Belnos) اور موسیو شویشا نک (Shavivhnac) کی کوششوں سے قائم ہوا۔ اس سے قبل لکڑی پر کھدائی (ووڈ کرافٹ) کے سوا تصویروں کی چھپائی کا اور کوئی طریقہ رائج نہیں تھا۔ اس سے قبل کتابوں کی رنگ برنگے روغنوں کے ذریعے تزئین و آرائش اور تصویر کشی کی مثالیں تو ملتی ہیں، لیکن تصویروں کی طباعت ممکن نہیں ہوئی تھی۔ یورپ میں لیتھو گرافک پریس کے ایجاد ہوتے ہی یہ دونوں فرانسیسی اسے کلکتہ لے آئے اور اس طرح انہوں نے بہت روپے کمائے۔ وہ دونوں باقاعدہ مصور بھی تھے، چنانچہ انہوں نے فرنگی اور ہندوستانی مردوں، عورتوں اور بچوں کے علاوہ چرندوں، پرندوں، پھولوں، پھلوں، قدرتی مناظر اور اس دور کے کلکتہ کی بڑی بڑی شاہراہوں، عمارتوں، دریائے بھاگیرتی پر لنگر انداز جہازوں کے علاوہ سماجی زندگی کی تصویریں بھی بنائیں اور انہیں چھاپ کر فروخت کیا۔ راجہ روی ورما سے بہت قبل 19-1818ء میں جس بنگالی مصور نے مغربی طرز کی مصوری سیکھ کر بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کا نام کاشی ناتھ مستری تھا۔ علاوہ ازیں "فرینڈ آف انڈیا" نامی اخبار کی 20 ستمبر 1820ء کی اشاعت میں جوڑاسانکو کے جس باشندے کی مصوری کی بڑی تعریف شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام ہری ہر بندیا دھیائے تھا۔ اس دور میں جن برطانوی اور فرانسیسی مصوروں کی بڑی شہرت تھی۔ ان میں موسیو اور مادم بیل نوس، موسیو شویشیا نک، گوزوردی گرانٹ، فینی پارکس اور ڈینیل وغیرہ شامل ہیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ برطانوی ہند میں جتنے بڑے بڑے اور مشہور و معروف مصور پیدا ہوئے۔ ان میں صرف ہندو مصور کیوں ہیں۔ عبدالرحمن چغتائی کے سوا ہندوستان گیر شہرت کا مالک کوئی دوسرا مسلمان مصور کیوں پیدا نہیں ہوا (ایم۔ اے۔ حسین واحد مسلمان مصور ہے جس نے حصول آزادی کے بعد ملک

گیر شہرت حاصل کی اور اس کا شمار ہندوستان کے ممتاز جدید مصوروں میں ہوتا ہے) آزادی سے قبل صرف عبدالرحمن چغتائی ہی واحد ایسے مصور تھے، جنہوں نے ہندوستان کے ممتاز مصوروں اور مصوری کے نقادوں سے اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ اس کی وجہ ان کی نہ صرف زبردست صلاحیت بلکہ انفرادیت بھی تھی۔ وہ ہندوستان کے مصوروں میں اپنے اسٹائل کے باعث پہلی نظر میں ہی قطعی مختلف اور منفرد نظر آتے تھے۔ انہوں نے جدیدیت کے دور میں مغلیہ مصوری کی روایت کو برقرار رکھ کر بہت کمال کیا تھا۔ اسی روایت نے انہیں آج امر بنادیا ہے۔

اسی کے ساتھ میرے ذہن میں متحدہ ہندوستان میں مصوری کے عظیم نقاد اور انگریزی کے شاعر، ادیب اور ماہر تعلیم شاہد حسن سہروردی کا خیال آیا، جن کے مقابلے کا ہندوستان نے صرف ایک آرٹ کرٹک پیدا کیا تھا اور وہ تھے کمار سوامی۔ تقسیم سے قبل شاہد حسن سہروردی کلکتہ کی ادبی اور ثقافتی دنیا کی جان تھے اور وہ جب تک کلکتے میں رہے، انگریزی روزنامہ "اسٹیٹس مین" میں مصوروں اور مصوری پر تنقیدیں لکھتے رہے اور اس حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ پہلے نقاد تھے، جنہوں نے ہندوستان کے جدید مصور جیمنی رائے کو بیرون ملک متعارف کرایا اور انہوں نے آج کے دور میں جو عالمی شہرت حاصل کی وہ ان کے طفیل حاصل کی۔ افسوس! پاکستان آنے کے بعد ان کی یہ حیثیت ماند پڑ گئی اور وہ محض پاکستان پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین اور پاکستان پی۔ ای۔ این کے صدر بنادیئے گئے۔ وہ جب کراچی میں بہت علیل تھے تو اس دور کے وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو نے اپنے ایک مشترک دوست اور مشہور بنگالی مصنف دلیپ کمار رائے کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں علاج و معالجہ کے لیے ہندوستان بلانا چاہا، لیکن انہوں نے ہندوستان جانے سے معذرت کرلی۔

ایشیاٹک سوسائٹی

کلکتے میں عمر کا بیش تر حصہ گزارنے کے باوجود میں کبھی ایشیاٹک سوسائٹی میں نہیں گیا۔ اس لیے کہ اس میں عوام الناس کا داخلہ ممکن نہ تھا اور پھر میں اس میں جانے کا اہل بھی نہ تھا۔ یہ ادارہ صرف مشہور و معروف اور مستند اسکالروں کے لیے مخصوص تھا اور میں نہ مشہور تھا اور نہ اسکالر۔ میں پارک اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے صرف اس تاریخی عمارت کو دیکھتا اور دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اندر داخل ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے جب ایشیاٹک سوسائٹی چلنے کی دعوت دی تو میں فوراً آمادہ ہو گیا۔ میں اس تاریخ ساز ادارے کی اہمیت اور سر ولیم جونز کی عہد ساز خدمات سے واقف تھا اور اس ادارے کو اندر سے دیکھنے کا مشتاق بھی۔

ایشیاٹک سوسائٹی دنیا کے ان عظیم اداروں میں سے ہے، جس نے کئی جدید علوم کو جنم دیا اور ایشیا کے مختلف فنون و علوم کو منظر عام پر لا کر دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ اس نے جن علوم کو جنم دیا ان میں اورینٹل ازم (علم مشرقیات) انڈولوجی (علم الہند) لسانیات اور معاشرتی علوم وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہی ادارہ ہے جس نے مستشرقین کی ایک پوری جماعت پیدا کی، جس کی کوششوں سے ایشیائی اقوام کو اپنے قومی اور تہذیبی ورثے کا علم ہوا اور جن کی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستان میں تہذیبی نشاۃ الثانیہ برپا ہوئی۔ جس نے آگے چل کر عوام میں قومی شعور اور بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اگر سر ولیم جونز نے سنسکرت زبان و ادب کے حوالے سے قدیم ہند کی عظمتوں کا سراغ نہ لگایا ہوتا تو شاید جدید ہندوستان میں نہ راجہ رام موہن رائے جیسے ریفارمر پیدا ہوتے اور نہ عظمت کا احساس جنم لیتا۔

ایشیاٹک سوسائٹی کا شمار دنیا کے قدیم ترین تحقیقاتی اداروں میں ہوتا ہے۔ وہ 15 جنوری 1784ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس سے قبل صرف جرمنی کی بیٹوین سوسائٹی تھی، جو 1779ء میں قائم ہوئی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی ولیم جونز 1783ء میں سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے کلکتہ آئے اور انہوں نے اس کے ایک سال کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ ولیم جونز خود ایک شاعر اور

ماہر لسانیات تھے اور انہیں ایشیائی زبانوں اور تہذیبوں سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ایشیا کی کئی کلاسیکی زبانوں مثلاً سنسکرت، پالی، چینی، تبتی، عربی اور عبرانی سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ہندوستان آنے سے بہت قبل 1771ء میں فارسی زبان کی گرائمر "اے گریمر آف دی پرشین لنگویج" 1773ء میں ایشیائی زبانوں کی نظموں کا ترجمہ اور 1782ء میں "سات عربی نظمیں" شائع کیں۔ وہ اگرچہ سپریم کورٹ کے چیف جج کی حیثیت سے ہندوستان آئے، لیکن انہوں نے آتے ہی سنسکرت زبانوں کے حوالے سے قدیم ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے ایشیائی تمدن کے مطالعے اور تحقیقات کے لیے مستقل ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے تیس سرکردہ انگریزوں کو قدیم سپریم کورٹ (موجودہ کلکتہ ہائی کورٹ) کے گرانڈ جیوری روم میں طلب کیا اور ان کے سامنے ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ ایشیائی ممالک کی تاریخ، کلچر اور تہذیب کا مطالعہ کیا جائے۔ جونز کی تجویز پر اس ادارے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ 1875 تک سوسائٹی کا اجلاس سپریم کورٹ کی عمارت میں ہوتا رہا۔ بعد میں حکومت نے پارک اسٹریٹ کے نکڑ پر 1805ء میں سوسائٹی کی عمارت کے لیے ایک قطعہ اراضی عطا کی اور 1808ء میں اس کی عمارت تعمیر ہوئی۔ ڈیڑھ صدی پرانی عمارت خستہ اور کمزور ہو جانے کے باعث حکومت ہند نے 1961ء میں اس کے قریب ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ جس کا 65ء میں جمہوریہ ہند کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے افتتاح کیا۔

سر ولیم جونز جب تک زندہ رہے۔ سوسائٹی کا کام بخوبی چلتا رہا، لیکن 1794ء میں ان کی وفات کے بعد سوسائٹی کے مستقبل کے بارے میں اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لارڈ ویلزلی نے آڑے وقت میں سوسائٹی کو سہارا دیا اور فورٹ ولیم کالج کے پروفیسر جون گلکریسٹ کو 1800ء میں اس کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ طویل عرصے تک کسی ہندوستانی کو ایشیاٹک سوسائٹی کا رکن بننے نہیں دیا گیا اور یہ سوسائٹی صرف انگریزوں کے لیے مخصوص رہی۔ 1829ء میں پہلی بار ہندوستانیوں کو بھی اس کا رکن بنایا گیا، چنانچہ اس دور میں جو مشاہیر ہندوستانی اس کے رکن ہوئے ان میں پرسنا کمار ٹیگور اور دوار کا ناتھ ٹیگور وغیرہ شامل ہیں۔ 1832ء میں سوا بازار کے راجہ رادھا کانت دیب بہادر اس کے رکن ہوئے۔ اس کے ایک سال کے بعد 1833ء میں رام کمل سین اس کے پہلے ہندوستانی سیکرٹری منتخب ہوئے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کو ہندوستان کے بہت سے قومی اداروں کی ماں بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان

اداروں کا ایشیاٹک سوسائٹی سے جنم ہوا۔ سوسائٹی کے مقاصد میں بہت سے علوم و فنون کے بارے میں مطالعات اور تحقیقات شامل تھیں، مثلاً تاریخ، جغرافیہ، قوانین، سائنس، آرٹس، ادبیات، آثار قدیمہ، حیوانات، ارضیات اور معدنیات وغیرہ۔ چنانچہ اس ادارے میں مختلف علوم کے بارے میں تحققات کا کام سرانجام دیا جاتا رہا، لیکن جب یہ تحقیقاتی سرگرمیاں بہت زیادہ پھیل گئیں تو انہیں زیادہ بہتر طور پر انجام دینے کے لئے 1818ء میں ٹریگو نو میٹریکل سروے آف انڈیا اور 1912ء میں اسکول آف ٹروپیکل میڈیشن اور یونیورسٹی آف کلکتہ قائم ہوئی۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ ایشیاٹک سوسائٹی کا نہ صرف رکن تھا، بلکہ اسکالر کی حیثیت سے بہت معروف بھی تھا اور اس کے عہدے داروں سے اس کی گہری شناسائی بھی تھی، چنانچہ وہ مجھے لیتا ہوا سیدھے سوسائٹی کے لائبریرین ایس۔ چندن کے پاس پہنچ گیا۔ مجھ سے تعارف کرایا، میری اور میرے کام کی مبالغہ آمیز حد تک تعریف کی۔ میں نے بنگلہ زبان میں رسمی کلمات ادا کئے اور ان سے مل کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں ان کی اپنی زبان سے واقف ہوں۔ شانتی پھر مجھے سوسائٹی کے اسسٹنٹ لائبریرین عبدالخالق ندوی ایم۔ اے (علیگ) سے ملانے کے لیے لے گئے، جن سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ شانتی کی خواہش تھی کہ میں ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ تاریخی اہمیت کی وہ کتب اور نوادرات بھی دیکھوں جو اردو کے عام ادیبوں کو دیکھنا نصیب نہیں ہوتا، چنانچہ میرے لیے فوراً داخلہ کارڈ بنوایا گیا جسے "ایڈمیٹ کارڈ فار کینزول ریڈر" کہا جاتا ہے، جس کے بغیر سوسائٹی کی لائبریری میں داخلہ ممنوع ہے۔

عبدالخالق صاحب نے ایشیاٹک سوسائٹی کے بارے میں جو کچھ بتایا اسے سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور میں خود کو خوش نصیب تصور کرنے لگا کہ میں علوم و فنون کے ایسے مخزن میں موجود ہو سکا۔ جس کا دنیا میں اور کوئی نظیر نہیں ہے۔ خالق صاحب نے بتایا کہ ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری نے اس وقت تاریخی اہمیت اختیار کر لی جب 1803ء میں ہینری کال بروک نے فورٹ ولیم کالج کی لائبریری کو سوسائٹی منتقل کر دیا۔ سوسائٹی کی اپنی لائبریری اس وقت مزید مالا مال ہوئی جب ٹیپو سلطان کی شاہی لائبریری کی انتہائی اہم اور بیش بہا کتابیں سوسائٹی کی لائبریری منتقل کی گئیں۔ اس لائبریری کے چار حصے ہیں۔ پہلا شعبہ، عام شعبہ ہے۔ جس میں ایشیائی اور یورپی زبانوں کی تمام اہم کتب و جرائد جمع ہیں۔ ان میں ایشیا اور ہندوستان کی تہذیب سے متعلق بعض بے حد قیمتی اور نایاب کتابیں بھی شامل ہیں۔ یہاں پندرہویں صدی کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ دوسرا شعبہ سنسکرت کا ہے۔ یہ شعبہ سنسکرت زبان و

ادب سے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے۔ جس میں سنسکرت کے تیس ہزار مخطوطات موجود ہیں۔ ان میں بعض مخطوطہ کا تعلق ساتویں صدی عیسوی سے ہے۔ بعض ایسے منی ایچرز بھی ہیں جن کا تعلق دسویں صدی عیسوی سے ہے۔ تیسرا شعبہ اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلق ہے جس میں عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور اردو وغیرہ کی مطبوعات اور مخطوطات محفوظ ہیں۔ ان میں مخطوطات کی مجموعی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان میں سے بعض مخطوطے بارہویں صدی عیسوی کے ہیں، جو اسلامی تہذیب اور تاریخ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان میں سے بعض مطبوعات اور مخطوطات قطعی نادر و نایاب ہیں۔ ان میں سے بعض مخطوطے خطاطی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں اور جن میں اعلیٰ درجہ کی مینی ایچر پینٹنگز بھی شامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تصاویر مغل بادشاہوں کی لائبریریوں سے یہاں پہنچی ہیں۔ چوتھا شعبہ چین، تبت اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تہذیب و تاریخ سے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے۔ جن میں برمی، سیامی، چینی اور تبتی زبانوں کی مطبوعات اور مخطوطات شامل ہیں۔

خالق ندوی نے مجھے خاص طور پر ساتویں صدی عیسوی یعنی گپتا عہد کی کئی سنسکرت کی تحریریں دکھائیں جن میں نواری (Newari) رسم الخط کی تحریریں بھی شامل تھیں۔ علاوہ ازیں نویں صدی عیسوی کی جامع التواریخ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خالق ندوی نے شاہجہاں کی دستخط شدہ کتاب "بادشاہ نامہ" (جلد دوم) بھی دکھائی۔ جس کے مصنف عبدالحمید لاہوری تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی کے "مہا بھارت" کا فارسی ترجمہ بھی دکھایا۔ جس کے مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ سب سے حیران کن سنہری حروف میں لکھا ہوا قرآن کریم کا ایک ایسا نسخہ تھا جس کے ہر صفحے میں پہلا لفظ الف سے شروع ہو کر آخری لفظ الف پر ختم ہوتا تھا۔

وقت کم ہونے کے باعث میں مزید مطبوعات و مخطوطات نہ دیکھ سکا اور شانتی رنجن کے ساتھ باہر نکل آیا۔

نیشنل لائبریری

کلکتہ پہنچنے کے دوسرے روز میں نے جس مقام کی زیارت کی وہ نیشنل لائبریری تھی۔ جس کا برطانوی دور حکومت میں امپریل لائبریری نام تھا۔ میں نے اس کے لیے لفظ "زیارت" اس لیے استعمال کیا کہ برصغیر میں علم وادب کے اس سب سے بڑے گہوارے کے لیے اس سے بہتر اور کون سا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے؟ لوگ ہندوستان کی درگاہوں، مزاروں اور خانقاہوں کی زیارت اور تاریخی مقامات کی سیر کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ میں نیشنل لائبریری اپنی ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزارے۔ میں جب بے روزگار تھا (یا یوں کہیے کہ میں نے عملی زندگی میں قدم نہیں رکھا تھا) میں اپنا زیادہ تر وقت اسی لائبریری میں گزارتا تھا۔ اس لائبریری کی خوبی یہ ہے کہ یہ صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کھلی رہتی ہے، یعنی پورے بارہ گھنٹے۔ یہ سال کے 362 دنوں میں صرف تین روز بند رہتی ہے یعنی یوم آزادی، یوم جمہوریہ اور گاندھی کے یوم ولادت کے موقع پر۔ عید، بقرعید، کرسمس اور ہندوؤں کے تمام تہواروں میں لائبریری کھلی رہتی ہے، البتہ مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں ہندو اور ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں مسلمان ارکان لائبریری میں کام کرتے ہیں۔

اس لائبریری میں، خصوصاً اس کے اردو سیکشن میں (جو بوہار سیکشن کے نام سے مشہور ہے) باقاعدگی سے آنے جانے کی وجہ سے اس کے تمام اسٹاف سے میری جان پہچان ہو گئی تھی، جو بعد میں دوستی میں بدل گئی۔ اردو سیکشن کے اسسٹنٹ لائبریرین سید مقیت الحسن نے پٹنہ یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں اعلیٰ سند حاصل کی تھی اور جو عبدالغفور نساخ کی خود نوشت سوانح حیات مرتب کر رہے تھے۔ ان سے میرے خصوصی مراسم تھے، چنانچہ میں جب اس دفعہ نیشنل لائبریری کی مین

بلڈنگ میں داخل ہوا تو دندناتا ہوا لائبریری کے اس گوشے میں پہنچ گیا۔ جہاں کبھی اردو، فارسی اور عربی کا شعبہ واقع تھا، لیکن میں وہاں پہنچ کر حیران رہ گیا، کیوں کہ وہاں اس شعبے کا نام و نشان تک نہ تھا اس کی جگہ ہندی کا شعبہ قائم تھا۔ سید مقیت الحسن اور اردو شعبے کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سید مقیت الحسن کا دفتر اسی عمارت میں واقع ہے البتہ بوہار سیکشن نو منزلہ نئی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ ہندی شعبے کا قاصد جب مجھے سید مقیت الحسن کے کمرے میں لے کر پہنچا تو مقیت صاحب کو دیکھ کر مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔

خوب صورت، جوان اور وجیہہ مقیت الحسن بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے سر کے بال بہت حد تک سفید ہو چکے تھے۔ آنکھوں پر دبیز چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اکیس سال کے دوران دنیا بدل چکی تھی۔

مقیت الحسن کی یہ حالت فالج گرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ بہت دنوں تک ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا رہا۔ ایک دن فالج نے اس پر اچانک حملہ کر دیا اور وہ بستر پر دراز رہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں متاثر ہوا اور طویل علاج و معالجہ کے بعد وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ وہ بھی لاٹھی کے سہارے۔ اس کا شعبہ نئی عمارت کی نو ویں منزل میں تھا لیکن اس کا دفتر اس کی آسانی کے لیے لائبریری کی اصل عمارت کی نچلی منزل میں واقع تھا، تاکہ اسے چڑھنے اترنے میں تکلیف نہ ہو۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ جسمانی طور پر معذور ہو چکا تھا اور اپنا اور اپنے اہل خاندان کے پیٹ کی خاطر حسب معمول فرائض انجام دینے پر مجبور تھا۔

یاد دلانے پر مقیت نے مجھے پہچان لیا اور خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اسے نیشنل لائبریری کے لیے اپنی دو کتابیں "جدید اردو افسانہ" اور "اندھیری رات کا تنہا مسافر" دیں۔ اس نے اس کے عوض اپنی دو اردو کتابیں دیں اور درخواست کی کہ میں انہیں کراچی کی لیاقت لائبریری میں پہنچا دوں۔

میں اس سے رخصت ہو کر نیشنل لائبریری کے مختلف گوشوں کی سیر کرتا رہا۔ نیشنل لائبریری برصغیر ہندوستان کو برطانوی حکومت کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ ایک ایسا عطیہ، جس پر ہندوستان کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ یہ نہ صرف جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے، بلکہ اس کا شمار دنیا کی عظیم ترین لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں پبلک لائبریری کا سب سے پہلا تصور انگریزوں نے پیش کیا۔ اس سے قبل زیادہ تر لائبریریاں نجی ہوتی تھیں اور مطبوعہ کتابیں اور غیر مطبوعہ مسودات (مخطوطات) عوام الناس کی دسترس سے باہر ہوتے تھے۔ کلکتہ میں سب سے پہلی

پبلک لائبریری 1838ء میں انگریزوں نے قائم کی۔ وہ بھی فن طباعت کے فروغ کے بہت دنوں کے بعد۔(جب تک طباعت کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔ کتابیں بہت محدود تعداد میں شائع ہوتی تھیں۔ زیادہ تر کتابیں مخطوطات کی صورت میں ہوتی تھیں)۔ 1835ء میں مسٹر گرانٹ کی صدارت میں کلکتہ ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ ہوا، جس میں پہلی بار ایک پبلک لائبریری قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا۔ اس دور کے مشہور بنگلہ اخبار "سماچار درپن" نے اپنی 12 ستمبر 1835ء کی اشاعت میں لکھا کہ اس جلسہ میں موجود تقریباً سو فرنگیوں نے فی کس تین سو روپیہ عطیہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے تیس ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اسی کے ساتھ صاحب ثروت انگریزوں نے بطور عطیہ بڑی تعداد میں کتابیں دیں۔ اس کے چار سال بعد، یعنی 1839ء میں کلکتہ کے متمول ہندوستانیوں کو عوام کی فلاح و بہبود اور ان میں علوم کے فروغ کے لیے لائبریری قائم کرنے کا خیال آیا۔ کلکتہ کو مرکز بنا کر 30-1829ء کے بعد ہندو کالج کے قیام کے نتیجے میں جو پڑھا لکھا بنگالی متوسط طبقہ ظہور میں آیا۔ اس میں اس لائبریری کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

1816ء میں سری رام پور میں بیپ ٹسٹ پریس کے قیام کے بعد کلکتہ میں ایک ثقافتی انقلاب رونما ہوا۔ جس کے نتیجے میں کلکتہ کے ہر محلے میں دیکھتے ہی دیکھتے پریس قائم ہو گئے اور اسی کے ساتھ اس نے کلکتہ کو "گرنتھ نگری" یعنی "کتابوں کے شہر" میں بدل دیا۔ نیشنل لائبریری اسی روایت کا ایک حصہ ہے۔

نیشنل لائبریری کو قائم ہوئے دو سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ لائبریری "کلکتہ پبلک لائبریری" کے نام سے قائم ہوئی۔ نجی شعبے میں قائم ہونے والی یہ خالص غیر سرکاری لائبریری تھی۔ اس کا اصل مقصد نایاب کتابوں اور جرائد کا حصول اور اس کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کے سرپرست زیادہ تر متمول شہری ہوا کرتے تھے۔ جو نجی طور پر چندہ ادا کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے بند ہو جانے کے بعد گورنر جنرل لارڈ میٹ کلیف کی ہدایت پر 4675 نہایت قیمتی کتابیں مذکورہ لائبریری کو منتقل کی گئیں۔ اس طرح لائبریری کے علمی خزانے میں غیر معمولی کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔

اس کے پہلے لائبریرین مسٹر اسٹیسی Mr. stacy تھے۔ اس کے بعد پیری چند متراسب لائبریرین مقرر ہوئے۔ جو بعد میں بنگلہ زبان میں ناول نویسی کے "بابا" کہلائے۔ یہ لائبریری 21 مارچ 1836ء میں عوام الناس کے لیے کھول دی گئی۔ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد کلکتہ

پبلک لائبریری بحران کا شکار ہو گئی۔ اس سے قبل لائبریری ہندوستانی اور یوروپین باشندے باہم مل کر چلایا کرتے تھے اور دونوں طبقے میں دوستی اور یگانگت نے لائبریری کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا، لیکن 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد دونوں طبقوں کے درمیان شکوک وشبہات پیدا ہو گئے اور انگریزوں نے خود کو لائبریری کے معاملات سے الگ تھلگ کر لیا۔ 1830ء سے 1840ء تک کلکتہ پبلک لائبریری ہی شہر کی سب سے بڑی اور واحد لائبریری تھی۔ 1850ء کے بعد کلکتہ میں متعدد دوسرے دارالمطالعے اور کتب خانے قائم ہو گئے، جس کی وجہ سے اس لائبریری کی وہ حیثیت نہ رہی جو پہلے تھی۔ اس لائبریری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس عہد کے تقریباً تمام اہم علما، فضلا، محققین، مصنفین، سماجی مصلحین اور پبلک لیڈرز اس کے رکن تھے۔ اس لائبریری کی سب سے بڑی خصوصیت انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور دیگر کلاسیکی زبانوں کی نایاب کتابوں کا انمول ذخیرہ تھا۔ جس سے استفادہ کرنے کے لیے اسکالرز نہ صرف ہندوستان کے دور دراز مقامات سے، بلکہ بیرون ملک سے بھی کلکتے آتے تھے۔

لارڈ کرزن نے گورنر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالنے کے بعد کلکتہ پہنچتے ہی جو پہلا کام سرانجام دیا وہ اس لائبریری کا معائنہ ہے۔ اس دور میں کلکتے میں صرف دو بڑی اور مشہور لائبریریاں تھیں۔ ایک امپریل لائبریری اور دوسری کلکتہ پبلک لائبریری۔ امپریل لائبریری ابتدا میں حکومت کے مختلف محکموں کے لیے مخصوص سکریٹریٹ لائبریری تھی، جو 1891ء میں قائم ہوئی۔ اس کا سربراہ حکومت ہند کا آفیسر انچارج آف ریکارڈز ہوا کرتا تھا۔ اس لائبریری کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں فورٹ ولیم کے ایسٹ انڈیا کالج اور لائبریری آف دی ایسٹ انڈیا بورڈ کی بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں جمع تھیں۔ امپریل لائبریری کے استعمال پر کڑی پابندیاں عائد تھیں اور صرف صوبائی اور مرکزی حکومت کے اعلیٰ افسران ہی اسے استعمال کر سکتے تھے۔ غیر افسروں کو اس لائبریری سے استفادہ کرنے کے لیے حکومت ہند کے کسی شعبے کے سربراہ سے اجازت طلب کرنا ضروری تھا۔ لارڈ کرزن نے جب کلکتہ پبلک لائبریری کا معائنہ کیا تو لائبریری کی قیمتی کتابوں کی بوسیدہ حالت دیکھ کر انہیں شدید صدمہ پہنچا اور انہوں نے حکم دیا کہ امپریل لائبریری اور کلکتہ پبلک لائبریری کو آپس میں ضم کر دیا جائے اور لائبریری عام لوگوں کے مطالعے کے لیے کھول دی جائے۔ جس وقت دونوں لائبریریوں کو باہم ضم کرنے کی بات ہو رہی تھی اس وقت کلکتہ پبلک لائبریری کے پاس چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور جرائد موجود تھے اور لائبریری کے قیام سے لے کر اب وقت تک لائبریری پر دو لاکھ پچاس ہزار نو سو

روپے خرچ کئے جا چکے تھے۔ اس موقع پر حکومت ہند نے جو خصوصی قوانین وضع کئے وہ "امپریل لائبریری ایکٹ 1902ء" کہلایا۔

اس وقت نیشنل لائبریری جس جگہ واقع ہے۔ اس کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس مقام کا نام "بیل دے ڈیر" (Belvedere) ہے۔ یہ زمانہ قدیم میں، یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں اپنے جائے وقوعہ اور قدرتی مناظر کے باعث کلکتہ کی سب سے حسین ترین جگہ تصور کی جاتی تھی اور اس کی عمارت کا شمار برطانوی طرز تعمیر کا انوکھا نمونہ اور اس دور کے کلکتے کی خوب صورت ترین عمارتوں میں ہوتا تھا (آج بھی یہ عمارت اپنی خوبصورتی کے باعث بے مثال ہے) اس دور میں جو غیر ملکی، خصوصاً یوروپین سیاح کلکتہ آتے تھے، وہ بیلوے ڈیر کو دیکھ کر عش عش کرتے رہ جاتے تھے۔ یہ عمارت برطانیہ کے نامزد کردہ نواب ناظم آف مرشد آباد میر جعفر علی خاں کی ملکیت تھی۔ جسے پرنس عظیم الشان نے 1700ء میں تعمیر کروایا تھا۔ وارن ہیسٹنگز ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے تو انہوں نے بیل دے ڈیر کی خوب صورتی کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔ اس کے بعد 1802ء سے لے کر 1854ء تک یہ ہندوستان کے کمانڈر ان چیف سر ایڈورڈ پیگلف، آرمی انجینئر لیفٹیننٹ کرنل ٹالی، شمبھو چندر مکرجی، چارلس رو برٹ پرنسیپ اور آخر میں 1854ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال میں آتا رہا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں وارن ہیسٹنگز اور ان کے دشمن برطانوی ممبر پارلیمنٹ مسٹر فرانسس کے درمیان 17 اگست 1780ء کی صبح پانچ بجے ڈوئیل ہوا تھا اور اس معرکے میں دونوں بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ اس تاریخی واقعہ کی یاد میں آج بھی وہاں ایک سڑک "ڈوئیل اسٹریٹ" کے نام سے موسوم ہے۔ 1947ء میں اعلان آزادی سے قبل تک اس جگہ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر رہائش پذیر تھے۔ آزادی کے بعد جب یہ عہدہ ختم ہو گیا تو اس دور کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی خواہش پر امپریل لائبریری کو اس جگہ منتقل کر دیا گیا اور اس کا نام بدل کر نیشنل لائبریری رکھا گیا۔

یوں تو پوری لائبریری اپنی نایاب اور بیش قیمت کتابوں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے، لیکن اس کا سب سے اہم شعبہ عربی، فارسی اور اردو ڈویژن ہے، جو عرف عام میں "بوہار لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ ضلع بردوان کے منشی سید صدر الدین، نواب آف مرشد آباد کے میر منشی اور ولی عہد نجم الدولہ کے اتالیق تھے۔ بعد میں وہ وارن ہیسٹنگز کے منشی مقرر ہوئے اور انہوں نے نواب آف مرشد آباد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کی منتقلی میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا۔ بادشاہ شاہ عالم نے انہیں بنگال کے

بائیس ہزاری پرگنہ کا متولی مقرر کیا تھا۔ منشی صدر الدین کے 1775ء میں بوہار کے قریب ایک درس گاہ "جلالیہ مدرسہ" کے نام سے قائم کی۔ اسی کے ساتھ جلالیہ لائبریری بھی قائم کی۔ جو بعد میں بوہار لائبریری کے نام سے مشہور ہوئی۔ بیس ہزاری پرگنہ سے جو آمدنی ہوتی، وہ جلالیہ مدرسہ اور اس سے ملحق لائبریری پر صرف ہوتی۔ منشی صدر الدین 14 رمضان المبارک 1211ھ بمطابق 1796ء کو انتقال فرما گئے۔ ان کی رحلت کے بعد بوہار خاندان کے ایک سپوت مرحوم منشی صدر الدین کے پوتے مولوی صدرالدین احمد نے جب مدرسے اور لائبریری کا نظم و نسق سنبھالا تو انہوں نے لائبریری کو چار چاند لگا دیے۔ اس لیے کہ وہ بڑے عالم و فاضل تھے اور مشرقی علوم و فنون سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ بوہار لائبریری میں موجود عربی و فارسی کی متعدد مخطوطات پر ان کے لکھے ہوئے فاضلانہ حاشیے ملتے ہیں۔

مولوی صدرالدین احمد نے اپنی زندگی میں بوہار لائبریری کو بڑی ترقی دی، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ منشی صدرالدین کا جب انتقال ہوا اور ان کے پوتے مولوی صدرالدین احمد نے مدرسہ اور لائبریری کا انتظام سنبھالا تو اس دوران لائبریری پر کیا گزری؟ خیال ہے کہ اس صدی کے وسط میں اس لائبریری کو بہت نقصان پہنچا۔ اس وقت تک وہاں تقریباً ایک سو مخطوطات اور کتابیں محفوظ تھیں۔ اس کے بعد اس کے ذخیرے میں مزید اضافہ ہوا اور عربی مخطوطات کی تعداد بڑھ کر چار سو چونسٹھ۔ فارسی مخطوطات کی تعداد چار سو تراسی اور ایک سو چالیس اردو کتابیں تھیں جو لتھوگراف پر چھپی ہوئی تھیں۔ اس لائبریری کو ترقی دینے میں جس شخص کا ہاتھ تھا اس کا نام مولوی صدرالدین احمد تھا۔

منشی صدرالدین کی طرح مولوی صدرالدین احمد کی بھی خواہش تھی کہ بوہار لائبریری عربی اور فارسی کے محققوں کی آئندہ نسل کے لیے قطعی محفوظ رہے، چنانچہ مولوی صدرالدین احمد نے اپنی زندگی میں ہی اسے حکومت ہند کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں 22 اگست 1904ء کو محکمہ داخلہ کے دفتر میں حکومت ہند کے سیکرٹری اور مولوی صدرالدین احمد کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ جس میں طے پایا کہ کلکتہ کے میٹکلف ہال میں اس کے لیے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص کیا جائے گا اور اس کا نام بوہار لائبریری رکھا جائے گا۔ اس لائبریری میں دو تہائی قیمتی کتابیں تھیں۔ ایک شہنشاہ اورنگ زیب کا خط نسخ میں 1099ھ کا لکھا ہوا قرآن پاک کا نسخہ اور دوسرا شہزادہ دارالشکوہ کا خط نسخ میں طلائی حروف میں لکھا ہوا "پنج سورہ"۔ بوہار لائبریری حکومت ہند کے حوالے کرنے کے ایک سال کے بعد مولوی صدرالدین کا 1905ء میں انتقال ہو گیا۔

اس لائبریری میں یوں تو بہت سی نایاب اور بیش قیمت کتابیں موجود ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم کتاب "تاریخ ہرات" ہے جسے آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں ایک ایسے شخص نے تحریر کیا ہے جس نے تمام واقعات کو خود اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس لائبریری میں نظامی کا دیوان، فردوسی کا شاہنامہ، نظامی کا خمسہ اور دولت شاہ کا تذکرہ اشعراور غزالی کی کیمیائے سعادت کے نسخے بھی موجود ہیں۔ بوہار لائبریری میں اس کے بعد بھی کتابوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور جن مشاہیر شخصیتوں نے لائبریری کو کتابیں نذر کیں ان کے نام سے علیحدہ علیحدہ گوشہ قائم کر دیا گیا مثلاً سر عبدالرحمن کلیکشن، ہدایت حسین کلیکشن، ذکریا کلیکشن، امام باڑہ کلیکشن، سریندر ناتھ بینرجی کلیکشن اور جادو ناتھ سرکار کلیکشن وغیرہ جادو ناتھ سرکار نے فارسی کے جو دو سو مخطوطات بطور عطیہ دیے۔ انہیں بوہار لائبریری کے ذخیرہ علمی میں شامل کرنے کے بجائے اسے ایک علیحدہ یونٹ کے طور پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ مخطوطات اس لیے بھی بہت قیمتی اور اہم ہیں کہ ان کا زیادہ تر تعلق 1659ء سے 1837ء تک عہد مغلیہ اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اولین عہد سے ہے۔ ان مخطوطات کی ایک اور اہمیت اس لیے بھی ہے کہ جادو ناتھ سرکار نے اس کے پہلے اور آخری خالی صفحات پر اپنے ہاتھ سے نوٹس لکھ رکھے ہیں۔ ان نایاب اور قیمتی کتابوں کے علاوہ لائبریری کی جو اپنی عربی فارسی اور اردو کتابیں ہیں۔ ان کی تعداد درج ذیل ہے۔

	کتابیں	مخطوطات
عربی	1715	78
فارسی	1312	68
اردو	6009	14
	9036	160

ڈیلیوری آف بکس (پبلک لائبریری) ایکٹ 1954ء کے نفاذ کے بعد نیشنل لائبریری میں نئی کتابوں اور جرائد کی تعداد میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کے جس مقام سے بھی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری میں لازمی طور پر داخل کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ہر سال ہندوستان میں شائع ہونے والی عربی۔ فارسی اور اردو کی سالانہ اوسطاً پانچ سو کتابیں

اصل ذخیرے میں شامل ہو جاتی ہیں۔

عربی اور فارسی اور اردو کتابوں کی نگرانی کے لیے 1959 ءمیں ایک نیا ڈویژن قائم کیا گیا ہے۔ گاہے گاہے عطیہ کے طور پر ملنے والی کتابوں کے علاوہ نیشنل لائبریری خود بھی قیمتی اور نایاب کتابیں اور مخطوطات خریدتی رہتی ہے۔ اس طرح اس ڈویژن کے پاس اس وقت 12133 کتابیں اور 1310 مخطوطات موجود ہیں۔ اس ڈویژن کے تحت عربی، فارسی اور اردو اخبارات اور جرائد کو حاصل کرنے اور اسے مجلد کرنے کے خصوصی انتظام ہیں۔

میں نے اپنے کلکتے کے قیام کے دوران اس دفعہ مقیت الحسن سے نیشنل لائبریری خصوصاً بوہار لائبریری کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کیں، اس سے قبل کبھی نہیں کیں۔ اس لیے کہ اس وقت میں اس شہر کا باشندہ تھا اور کسی بھی وقت یہ ساری معلومات حاصل کر سکتا تھا، لیکن اس دفعہ میں وہاں ایک غیر ملکی کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس بارے میں جس قدر معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، حاصل کر لو۔ معلوم نہیں پھر کبھی اس عظیم کتب خانے میں آنا ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ میں نے لائبریری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مقیت الحسن کی فراہم کردہ معلومات اور اعداد و شمار کی بنیاد پر لکھا ہے۔ میں نے روانگی سے قبل اس عظیم لائبریری کو نظر بھر کر دیکھا اور خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

مغربی بنگال اردو اکیڈیمی

کلکتہ پہنچ کر مغربی بنگال اردو اکیڈیمی میں نہ جانا اور وہ بھی ایسی صورت میں، جبکہ اس کا چیئرمین میرا دیرینہ دوست ہو، تقریباً ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے سب سے پہلے کامریڈ محمد امین کا سراغ لگانے کی کوشش کی اور سیدھے کمیونسٹ پارٹی کے اخبار روزنامہ "سادھینتا" کے دفتر (واقع علیم الدین اسٹریٹ) پہنچا۔ جہاں سے وہ کمیونسٹ پارٹی کا اردو ہفت روزہ شائع کرتا تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دفتر سے جاچکا ہے اور اب اردو اکیڈیمی کے دفتر میں ملے گا۔

اردو اکیڈیمی کا دفتر سندری موہن ایونیو میں لیڈیز پارک کے عقب میں واقع تھا اور سندری موہن ایونیو کہاں واقع تھا؟ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ دراصل اکیس سال کے دوران کلکتہ کے راستوں اور شاہراہوں کے نام اس قدر بدل چکے تھے کہ اب میری طرح "پردیسی" کے لیے انہیں پہچاننا بہت مشکل تھا۔ مزید دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے جس راستے کا نام سی۔ آئی۔ ٹی روڈ تھا۔ اب اس کا نام سندری موہن ایونیو ہے، جو انٹالی سے شروع ہو کر پارک سرکس میدان میں آکر ختم ہوتا ہے۔

میں ٹیکسی پر سیدھے لیڈیز پارک پہنچا۔ جس کے عقب میں اردو اکیڈیمی کا دفتر واقع تھا۔ اکیڈیمی سہ منزلہ عمارت میں واقع تھی۔ نچلی منزل میں کتابت اسکول اور دوسری منزل میں لائبریری اور دفتر واقع تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ امین ابھی تک دفتر نہیں پہنچا ہے۔ میں نے اکیڈیمی کے سیکرٹری محمد فخرالدین سے اپنا تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور چیئرمین محمد امین کا دوست ہوں۔ انہوں نے فوراً اس کے گھر پر فون کیا اور اس سے میری بات کرادی۔ امین نے کہا کہ "تم میرا انتظار کرو میں ابھی دفتر پہنچتا ہوں"۔

میں سیکرٹری فخرالدین سے اکیڈیمی اور اس کے مقاصد اور کارکردگی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

انہوں نے اکیڈیمی کا بلیٹن اور رسالہ "روح ادب" کے کئی نئے اور پرانے شمارے نذر کئے۔ اکیڈیمی کا سہ ماہی جریدہ "روح ادب" بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے کئی خاص نمبر نکل چکے ہیں اور اس ادارے سے کئی درجن کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اکیڈیمی کی مطبوعات میں میرے دوست سید لطیف الرحمن کی کتاب "نساخ سے وحشت تک" بھی شامل ہے۔

میں کامریڈ امین کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ اس سے ملے اکیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات آج سے 35 سال قبل 1950ء میں راج شاہی سنٹرل جیل میں ہوئی تھی۔ میں اپنے انقلابی خیالات اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے پہلے ہی اقتناعی نظربندی ایکٹ کے تحت نظربند کر دیا گیا تھا اور ابھی مجھے جیسور ڈسٹرکٹ جیل سے راج شاہی سنٹرل جیل میں منتقل ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ محمد امین گرفتار ہو کر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ سو سیاسی نظربندوں میں میں تنہا غیر بنگالی اور اردو داں سیاسی نظربند تھا۔ اس کی آمد سے ایک اور غیر بنگالی اردو داں سیاسی نظربند کا اضافہ ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ کا رہنے والا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے چٹکل (جوٹ مل) کا مزدور ہے اور حال ہی میں سید پور میں گرفتار ہوا ہے۔ اس وقت ہم دونوں کی عمر بہت کم تھی (یعنی اٹھارہ سے بیس سال کے درمیان) اور ہم میں بڑا جوش و ولولہ تھا۔ اس لیے ہمیں اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔

امین ایک مل مزدور تھا اور تعلیم سے قطعاً نابلد، لیکن معاشرے کو بدلنے اور ایک خوشحال اور سماجی ناانصافیوں سے پاک دنیا کی تعمیر کے خواب نے اسے عملی میدان میں قدم رکھنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ اس نے جیل میں نظربندی کے دوران (جو دو سال سے زیادہ مدت پر محیط تھی) انگریزی اور بنگلہ کی تعلیم حاصل کی اور جب ہم دونوں 52ء میں رہا ہو کر کلکتہ پہنچے تو وہ ایک نیا انقلابی نوجوان بن چکا تھا۔ امین اب چونکہ پڑھ لکھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے مزدوری ترک کر دی اور جوٹ ملز کے محنت کشوں کی ٹریڈ یونین سے وابستہ ہو گیا۔ میں جب تک کلکتے میں رہا۔ وہ اسی شعبے میں کام کرتا رہا۔ اس وقت تک اس کا شعر و ادب سے تعلق نہ تھا، لیکن میرے پاکستان آنے کے بعد اس میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغربی بنگال میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت بننے کے بعد وہ ٹرانسپورٹ کا وزیر بن گیا اور جب مغربی بنگال اردو اکیڈیمی قائم ہوئی تو اسے حکومت کی طرف سے اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ وہ اس وقت سے اسی عہدے پر فائز ہے۔ اس دوران اس نے ادبی مضامین بھی لکھنے شروع کر دیئے اور مختصر بنگلہ اردو ڈکشنری بھی مرتب کی جو اکیڈیمی کی جانب سے شائع ہوئی۔

محمد امین کے دفتر پہنچتے ہی میں اس سے ملنے کے لیے اس کے چیمبر میں پہنچا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے والہانہ طور پر بغل گیر ہوئے اور بہت دیر تک ماضی کی باتیں اور مشترکہ دوستوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ محمد امین کو اکیڈیمی کے چیئرمین کے عہدے پر فائز دیکھ کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ ایک مزدور کا ترقی کر کے اردو اکیڈیمی جیسے علمی و ادبی ادارے کے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچنا صرف ایک ایسے معاشرے میں ہی ممکن ہے جہاں صحیح معنوں میں جمہوری نظام ہو۔ اس سے قبل میرے سامنے کامریڈ محمد الیاس کی مثال تھی۔ جو امین کی طرح جوٹ مل کا ان پڑھ مزدور رہنما تھا، لیکن جس نے جیل میں تعلیم حاصل کی اور پھر لوک سبھا (انڈین پارلیمنٹ کے ایوان بالا) کا ممبر بن گیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیا پاکستان میں ایسا ممکن ہے؟ یہاں تو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستیں صرف جاگیر دار طبقے کے لیے مخصوص ہیں۔ مزدور تو کجا متوسط طبقے کا کوئی فرد ان ایوانوں میں پہنچنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد محمد امین سے کہا کہ "میرے پاس "مغربی ادب اور تیسری دنیا کا ناول" کے عنوان سے ایک غیر مطبوعہ مضمون ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے "روح ادب" میں شائع کر سکتے ہو۔

اس نے مضمون میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ مضمون پڑھنے کے بعد اپنے پی۔اے کو مضمون کا معاوضہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا پی۔اے تین سو روپے لے کر آیا اور ایک رسید پر دستخط کروانے کے بعد رقم میرے حوالے کر دی۔ میں بہت خوش ہوا۔ مضمون کا تین سو روپے معاوضہ اور وہ بھی طباعت سے قبل۔ پاکستان میں اس بارے میں تصور تک ممکن نہ تھا۔

محمد امین نے اکیڈیمی کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا کہ اکیڈیمی بنگالیوں کو اردو پڑھنے کی ترغیب دینے کے لیے فی کس ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ دیتی ہے اور اس وقت بیس سے پچیس بنگالی مرد اور عورتیں باقاعدہ اردو پڑھ رہی ہیں۔ اکیڈیمی کی اردو کلاس اسلامیہ ہائی اسکول (بنیا پوکھر) میں ہوتی ہے اور مشہور محقق شانتی رنجن بھٹاچاریہ اس کے نگران ہیں۔

محمد امین نے مزید بتایا کہ بنگال میں فیض احمد فیض بہت مقبول ہیں اور ان کی نظمیں انگریزی اور بنگلہ تراجم کے ذریعے بنگالی عوام تک پہنچ چکی ہیں۔ وہ ایک بار خود اردو اکیڈیمی کے دفتر میں تشریف لائے تھے اور انہوں نے اکیڈیمی کی خدمات کو بہت سراہا تھا۔ امین نے فیض کے بارے میں ایک بہت دلچسپ انکشاف کیا۔ اس نے بتایا کہ ایک بار فیض ہوائی جہاز پر ہندوستان سے گزرتے ہوئے چند

گھنٹوں کے لیے کلکتہ ایئرپورٹ پر ٹھہرے۔ انہوں نے امیگریشن آفیسر سے کہا کہ کلکتے میں ان کے چند دوست ہیں۔ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو وہ ان سے ملاقات کر آئیں۔ امیگریشن آفیسر انہیں اس کی کیوں کر اجازت دے سکتا تھا۔ اس نے معذرت کر لی۔ اس پر فیض نے کہا کہ "میں ایک دوست کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت ہو تو فون کر لوں"۔ اس پر امیگریشن آفیسر نے اجازت دے دی۔ فیض نے براہ راست وزیر اعلیٰ مغربی بنگال مسٹر جیوتی باسو کو فون کیا اور انہیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امیگریشن آفیسر کی جانب سے ایئرپورٹ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہونے کے باعث وہ وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں"۔

جیوتی باسو نے ان سے کہا کہ "آپ میرا انتظار کیجیے۔ میں ابھی حاضر ہو رہا ہوں"۔ جیوتی باسو چند منٹوں میں ایئرپورٹ پہنچ گئے اور انہیں اپنے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا اور پھر انہیں خود ایئرپورٹ میں پہنچا دیا۔ فیض ہندوستان میں کتنے مقبول تھے۔ اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر صرف فیض احمد فیض کے لیے قائم کیا گیا تھا، لیکن فیض بوجوہ اس عہدے کو قبول نہ کر سکے۔

میں کلکتے سے روانگی سے قبل جب دوسری دفعہ مغربی بنگال اردو اکیڈیمی گیا تو نہ کامریڈ امین سے ملاقات ہوئی اور نہ سیکرٹری فخرالدین سے۔ اس روز اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہونے والا تھا اور وہاں علقمہ شبلی اور اعزاز افضل موجود تھے۔ ان دونوں سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی اور ہم آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے۔ علقمہ شبلی میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ابتدا سے درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اور اب بھی اسی پیشے سے وابستہ ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کا اصل نام تو ابو علقمہ محمد شبلی نعمانی ہے، لیکن ادبی دنیا میں وہ علقمہ شبلی کے نام سے مشہور ہیں۔ سی۔ ایم۔ کالج (دربھنگہ) سے بی۔ اے، کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ ٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد سرکاری اسکول سے وابستہ ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

اعزاز افضل ترقی پسند شاعر ہیں۔ وہ پرویز شاہدی کے بہت ہی عزیز شاگرد تھے اور ان پر پرویز شاہدی کا گہرا اثر ہے۔ ان کا تعلق بھی درس و تدریس سے ہے۔ وہ اس وقت مولانا آزاد کالج (سابق اسلامیہ کالج) سے وابستہ ہیں۔ ان سے میرے بڑے دیرینہ مراسم تھے اور کلکتہ کے قیام کے دوران ہم دونوں روز ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ علقمہ اور اعزاز دونوں نے مجھے تفصیلی ملاقات کے لیے اپنے گھر پر بلایا تاکہ دل بھر کر گفتگو ہو، لیکن افسوس! وقت نہ ملنے کے باعث میں ان سے دوبارہ نہ مل سکا۔

مجلس عاملہ کا جلسہ شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے میں ان سے اجازت لے کر اکیڈیمی کی لائبریری میں آکر بیٹھ گیا تاکہ جلسہ ختم ہو تو میں ان سے دوبارہ مل سکوں۔ اکیڈیمی کی لائبریری نئی اور پرانی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں پاکستانی کتابوں کی بھی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ وہاں پاکستانی مطبوعات کی بڑی مانگ ہے اور وہ ہر ذریعے سے پاکستانی کتابیں خریدتے رہتے ہیں۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ میں آئندہ ہندوستان آؤں تو اپنے ساتھ پاکستانی مطبوعات بھی لیتا آؤں۔

میں نے دیکھا کہ لائبریری میں ایم۔ اے کے کئی طلبار مطالعے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ پی ایچ ڈی کے تھیسز کے لیے نوٹس لینے میں مصروف تھے۔ ان میں ایک طالب علم خواجہ نسیم اختر بھی تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ "اختر الایمان۔ حیات اور کارنامہ" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ ان میں مجھے ایک بنگالی لڑکی بھی نظر آئی جو خاموشی کے ساتھ مطالعے میں مصروف تھی۔ محمد امین سے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ بنگالیوں میں اردو پڑھنے کا خاص رجحان پیدا ہو چکا ہے، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ بنگالی لڑکیاں اردو کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں۔ اس بنگالی لڑکی سے متعارف ہونے کی خواہش نے مجھے اس سے گفتگو کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پہلے اپنا تعارف کرایا اور پھر اس سے اس کا نام دریافت کیا۔

اس نے بتایا کہ "میرا نام شہناز نبی ہے اور میں "اردو تنقید 1960ء کے بعد" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رہی ہوں"۔

اس سے باتیں کرنے کے بعد اس کے بنگالی ہونے کے بارے میں میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ وہ بنگالی نہیں، کلکتے کی اردو داں تھی، لیکن اس نے اس انداز سے ساڑھی باندھ رکھی تھی (خصوصاً جوڑا اس انداز سے باندھ اور پیشانی پر ٹکہ اس طرح لگا رکھا تھا) کہ اس پر ہندو بنگالی ہونے کا گمان ہوتا تھا، کلکتہ کی عورتیں عموماً ساڑھیاں پہنتی ہیں (خواہ وہ بنگالی ہوں یا غیر بنگالی) لیکن ساڑھی باندھنے کے اسٹائل اور بال سنوارنے کے انداز سے ان کے غیر بنگالی اور غیر ہندو ہونے کا پتہ چل جاتا تھا۔ لیکن گذشتہ تیس پینتیس سال کے دوران دنیا بدل چکی تھی اور ہندوستانی مسلمانوں، خصوصاً متوسط طبقہ کے مسلمان مردوں اور عورتوں کے لباس اور طرز زندگی پر ہندو ثقافت کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں۔ شہناز نبی کو ایک نظر دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ ہم پاکستانیوں کو یہ بات ضرور عجیب لگے گی، لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اکثریت کا ہمیشہ اقلیت پر ثقافتی اثرات مرتب ہوتے رہے ہیں۔ ہم پاکستانیوں نے خود کو ہندو ثقافت کے اثرات سے محفوظ

رکھنے کے لیے الگ ملک قائم کر لیا ہے، لیکن ہندوستان میں آج بھی بارہ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ جن پر غیر شعوری طور پر ہندو کلچر مسلط ہو رہا ہے۔ وہ اس کی مزاحمت کس طرح کریں گے؟ یہ صرف وہی جان سکتے ہیں۔

نذرل لائبریری

اکیس سال کے بعد میں جب کلکتے گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ان مقامات پر ضرور جاؤں گا جہاں سے میری یادیں وابستہ ہیں چنانچہ موقع ملتے ہیں میں جہاں گیا۔ وہ نذرل لائبریری ہے۔ اس لائبریری کی بڑی تاریخی اہمیت تھی۔ نذرل لائبریری میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح جس طرح نیشنل لائبریری۔ میں نے اپنی بے فکری اور بے روزگاری کے دن انہی دو لائبریریوں میں پڑھتے ہوئے گزارے۔ میں نے اپنا وقت سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بجائے انہی مقامات پر "راہ فرار" اختیار کی اور خود کو کتابوں کے سمندر میں غرق کر دیا۔ اکیس سال کے بعد میں جب مرزا پور اسٹریٹ میں واقع نذرل لائبریری پہنچا تو دنیا بدل چکی تھی۔ یہ لائبریری بنگلہ زبان کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام کی یاد میں قائم کی گئی تھی۔ لائبریری کے سارے عہدے دار بدل چکے تھے۔ ان کی جگہ نئے لوگ آ گئے تھے۔ ان میں سے کسی سے بھی میرا تعارف نہیں تھا، حالانکہ میں جب یہاں تھا تو سیکرٹری سے لے کر صدر تک تمام عہدے داروں سے میری شناسائی تھی۔ میں اس کا بہت ہی فعال رکن تھا، لیکن اب مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا، چنانچہ میں خاموشی کے ساتھ لائبریری کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا اور میں نے کسی سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ "کیا حاصل ہے۔ ان سے اپنا تعارف کرا کے؟" میں نے دل میں سوچا "جبکہ میں چند لمحوں کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر شاید کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا"۔

میں لائبریری میں بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اس وقت جس جگہ نذرل لائبریری قائم ہے وہاں آزادی سے قبل "مسلم ساہتیہ پریشد" قائم تھا۔ وہ مسلم ساہتیہ پریشد، جو بنگو ساہتیہ پریشد کے مقابل قائم کیا گیا تھا! یہ بنگال کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے کہ قیام پاکستان سے قبل بنگلہ ادب کے نام پر ہندو ساہتیہ (ہندو ادب) اور "مسلم ساہتیہ" (مسلم ادب) معرض وجود میں آ چکا تھا، حالانکہ اصولی طور پر ادب کو محض ادب ہونا چاہیے تھا، لیکن اس امتیاز

کے لیے بنگال کا ہندو فرقہ ذمے دار تھا، جس نے کبھی سیکولر انداز میں نہیں سوچا اور اگر سوچا تو ہندو بن کر سوچا۔ اسی لیے جو بنگلہ ادب تخلیق ہوا۔ وہ بنیادی طور پر بنگلہ زبان کا ہندو ادب تھا۔ اسی نقطہ نظر کا نتیجہ تھا کہ بنگال کے سب سے پہلے کالج کا نام "ہندو کالج" اور پہلے ادبی ادارے کا نام "بنگو ساہتیہ پریشد" رکھا گیا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلم ساہتیہ پریشد، بنگو ساہتیہ پریشد کے رد عمل میں بہت عرصے کے بعد معرض وجود میں آیا۔ بنگال کے ہندوؤں نے جولائی 1893ء میں سوابازار کے راجہ بنئے کرشنا دیب کے مکان پر بنگال اکیڈیمی آف لٹریچر کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی اور ایک سال بعد اپریل 1894ء میں اس کے بنگلہ نام "بنگو ساہتیہ پریشد" کا اعلان کر دیا۔ اس ادارے کو قائم ہوئے 96 سال ہو چکے ہیں۔ اس ادارے کا مقصد بنگلہ زبان، ادب اور تہذیب کے بارے میں تحقیق کرنا تھا۔ 1901ء میں قاسم بازار کے مہاراجہ جتیندر چند نندی نے اس کی عمارت کی تعمیر کے لیے سات کٹھا زمین بطور عطیہ فراہم کی جس پر پریشد کی موجودہ عمارت قائم ہے۔

"بنگو ساہتیہ پریشد" نام کے اعتبار سے تو سیکولر ادارہ تھا، لیکن کام کے اعتبار سے ایسا نہ تھا۔ اس پر ہندویت کی گہری چھاپ تھی، اس کا اندازہ بنگلہ ادب کی تاریخ اور بنگالی ادیبوں کی ذہنیت سے ہوتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود بنگلہ ادب میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کی تاریخی اور معاشرتی پس ماندگی اور علم و ادب اور تعلیم و تہذیب میں پچھڑے رہنے کی وجہ سے مسلمانوں میں تعلیم یافتہ طبقہ بہت بعد میں پیدا ہوا اور جب بنگال کے مسلمان ادیب و شاعر منظر عام پر آئے تو ہندو ادیبوں کی اکثریت نے اپنی قومی شاونیت کے باعث انہیں خاطر خواہ اہمیت نہیں دی اور نہ شعر و ادب میں انہیں مرتبہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی نذر الاسلام سے قبل ہندو ادیبوں، ناقدوں اور ادبی مورخوں نے کسی مسلمان تخلیقی ادیب کی صلاحیت کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ "بشاد سندھو" کے مصنف مشرف حسین نے سانحہ کربلا کے موضوع پر اپنی ناقابل فراموش تصنیف کے باعث خود کو تسلیم کروا لیا تھا۔

نذرل لائبریری میں داخل ہوتے ہی مجھے "مسلم ساہتیہ پریشد" اور "ایسٹ بنگال رینیے سال سوسائٹی" یاد آ گئی۔ جن کے دفاتر اسی جگہ قائم تھے۔ جیسا کہ "ایسٹ بنگال رینیے سال سوسائٹی" کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ان بنگالی مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کی تنظیم تھی، جنہیں اپنے پسماندہ ہونے کا

شدید احساس تھا اور جو چاہتے تھے کہ ایک تحریک کے ذریعے بنگالی مسلمانوں میں بیداری کی لہریں موج زن ہوں اور ان میں تعلیم و تہذیب کے میدان میں ترقی کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔ اس سوسائٹی سے قبل بنگال کے مسلمان ادیبوں نے "مسلم ساہتیہ پریشد" کے نام سے ایک علیحدہ ادارہ اس لیے قائم کیا تھا کہ انھیں اس کا احساس تھا کہ بنگلہ زبان وادب میں انہیں خاطر خواہ نمائندگی حاصل نہیں ہے اور بنگالی مسلمانوں کو 1905 ء میں مشرقی بنگال کو علیحدہ صوبہ بنانے کے باعث جو کچھ حاصل ہوا تھا، بنگال کی تقسیم منسوخ کر کے انہیں اس سے محروم کر دیا گیا ہے۔

اس کا اندازہ بنگال کے معروف ناول نویس شرت چندر چٹرجی کے اس خطاب سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کی جانب سے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے کے موقع پر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہندو بنگالیوں کی یونیورسٹی (کلکتہ یونیورسٹی) نے تو مجھے کسی قابل نہیں سمجھا اور مسلمانوں کی یونیورسٹی (ڈھاکہ یونیورسٹی) مجھے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے رہی ہے حالانکہ میں نے مسلمانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ میں آج وعدہ کرتا ہوں کہ میں بنگالی مسلمانوں کے بارے میں بھی لکھوں گا"۔

اس کے بعد سرت چند نے اپنا وہ مشہور و معروف مختصر افسانہ "مہیش" لکھا، جسے پڑھنے کے بعد بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ پاکستان کیوں قائم ہوا؟ پاکستان کے قیام کا شرت بابو کے اس افسانے سے کیا تعلق ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے اس افسانے کا خلاصہ سمجھنا ضروری ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ غیر منقسم بنگال میں مسلمان اکثریت میں تھے اور ہندو اقلیت میں۔ مسلمانوں کی اکثریت کاشت کار تھی اور ہندو اقلیت زمین دار۔ اس کے باوجود رعب دبدبہ اور عملی حکمرانی ہندو زمین داروں کی ہی تھی اور جہاں ہندو زمین دار تھے وہاں گئو کشی قطعی ممنوع تھی۔ "مہیش" ایک گائے کا نام ہے۔ اس کا مالک عبدل ایک غریب کھیت مزدور ہے۔ اس کی بن ماں کی ایک چھوٹی سی بچی ہے اور سر چھپانے کے لیے صرف ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے۔ وہ دوسروں کی زمین پر کام کر کے گزارا کرتا ہے۔ بہت دنوں سے اسے کوئی کام نہیں مل رہا ہے۔ اس لیے وہ نیم فاقہ ہے۔ وہ اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ بھرنے سے معذور ہے اس لیے وہ مہیش کو بھی چارہ فراہم کرنے سے مجبور ہے۔ عبدل سے مہیش کی بھوک سے آہ و بکا سنی نہیں جاتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی جھونپڑی کا پوال توڑ توڑ کر اس کو کھلاتا رہتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کی جھونپڑی کا نصف سے زیادہ پوال ختم ہو جاتا ہے۔ ایک روز مہیش بھوک سے بے تاب ہو کر رسی توڑ کے دوسرے شخص کے

کھیت میں گھس جاتی ہے اور فصل کو نقصان پہنچاتی ہے۔ زمین دار کو جب معلوم ہوتا ہے کہ عبدل کی گائے نے زمین دار کی فصل کو نقصان پہنچایا ہے تو زمین دار کے گماشتے مہیش کو باندھ کر نہ رکھنے کی پاداش میں اسے خوب زد و کوب کرتے ہیں۔ عبدل لہولہان ہو جاتا ہے۔ وہ مہیش کو پھر کھونٹے سے باندھ دیتا ہے، لیکن ایک روز پھر مہیش بھوک سے بے تاب ہو کر کھونٹے سمیت زمین دار کے کھیت میں گھس جاتا ہے۔ عبدل کو جب معلوم ہوتا ہے تو وہ غصے میں آکر مہیش کو داؤ سے مارتا ہے جس سے وہ مر جاتا ہے۔

مہیش کے مرتے ہی ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ زمین دار کے گماشتے اسے پھر خوب زد و کوب کرتے ہیں اور اس پر گئو ہتیا کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے روز پنچایت بیٹھتی ہے اور پنچایت اس کے جرم کی سزا کے طور پر فیصلہ سناتی ہے کہ وہ گاؤں چھوڑ دے۔ افسانے کا اختتام اس پر ہوتا ہے کہ عبدل اپنی ننھی سی بچی کا ہاتھ پکڑ کر گاؤں کی سرحد سے باہر نکل جاتا ہے۔

بنگلہ کے افسانوی ادب میں "مہیش" ایک شاہکار افسانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ افسانہ عرصہ دراز تک کلکتہ یونیورسٹی میں بنگلہ ادب کے ایم۔اے کے نصاب میں شامل رہا ہے، لیکن ہندو مہا سبھا کے بانی مشہور فرقہ پرست رہنما شیاما پرشاد مکرجی کے کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنتے ہی سرت چند کا مذکورہ افسانہ نصاب سے خارج کر دیا گیا۔

میں نذرل لائبریری کے دارالمطالعہ میں بیٹھا ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ "پاکستان یونہی تو قائم نہیں ہوا؟ بنگالی مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں بلاوجہ تو حصہ نہیں لیا؟ پاکستان کے قیام کے اسباب و علل تو پہلے سے موجود تھے۔ قائد اعظم نے صرف رہبری کی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی منزل کا تعین تو خود فرقہ پرست اکثریتی ہندوؤں نے کر دیا تھا۔

میں لائبریری کے عہدے داروں سے ملے بغیر خاموشی سے سر جھکا کر باہر نکل آیا۔

مٹیا برج

میں کلکتے میں جب تک رہا مٹیا برج، خصوصاً تاریخی امام باڑے اور شاہی مسجد کو اندر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ خیال تھا کہ جب جی چاہے گا اسے اندر سے دیکھ لوں گا۔ اتنی جلدی کیا ہے! یوں میں مٹیا برج کئی بار گیا اور اس کی سیر بھی کی لیکن امام باڑے کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور پھر میں پاکستان آگیا۔ اس دفعہ میں جب کلکتے گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اس تاریخی مقام کو اندر سے ضرور دیکھوں گا۔ آخر اردو ادب اور ہندوستان کی تاریخ میں اس محلے کا اس قدر ذکر ہوتا ہے تو اس کی کوئی تو وجہ ہو گی!

مٹیا برج اب ایک محلے کا نہیں، بہت بڑے علاقے کا نام ہے۔ جسے چھوٹا موٹا شہر بھی کہا جا سکتا ہے۔ مٹیا برج اب اس قدر بدل چکا ہے اور وہاں آبادی اتنی گنجان ہو چکی ہے کہ اب قدیم مٹیا برج کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ سوائے امام باڑے، شاہی مسجد اور چند بوسیدہ اور شکستہ کوٹھیوں کے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانے کے سارے محلات اور کوٹھیاں ایک ایک کر کے یا تو گر چکی ہیں یا انہیں منہدم کر کے اس کی جگہ نئی نئی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے ان تاریخی عمارات کی حفاظت کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ اس طرح واجد علی شاہ کے عہد کا مٹیا برج قطعی اجڑ چکا ہے اور اس کی جگہ ایک نہایت غلیظ اور انسانوں سے بھرا ہوا جنگل اُگ آیا ہے۔ جیسے یہاں کبھی مٹیا برج قائم تھا ہی نہیں۔

کلکتہ کے جنوب مغربی حصے میں دریائے ہگلی کے کنارے واقع اس علاقے کا پرانا نام گارڈن ریچ ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں فرنگیوں نے اپنے جہازوں کی مرمت کے لیے قائم کیا تھا اور ایک بہت بڑا ورک شاپ تعمیر کیا تھا۔ جہاں برطانیہ سے آنے والے جہازوں کی صفائی اور

مرمت کا کام کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں انگریزوں نے یہاں اپنی آبادی بھی قائم کر لی تھی لیکن 1856ء میں لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں جب والی اودھ نواب واجد علی شاہ مسند شاہی سے علیحدہ کئے گئے اور انہیں کلکتہ کے اس علاقے میں منتقل کر دیا گیا تو اس علاقے کا نام "مٹیا برج" پڑ گیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلکتہ میں تین مسلمان فرمانرواؤں کے خاندان تین مختلف علاقوں میں آباد کئے گئے ہیں۔ اول، نواب سراج الدولہ کے ورثا جنگ پلاسی (1757ء) میں شکست کے بعد کلکتہ کے محلہ چیت پور میں بسائے گئے۔ ان کے خاندان کے آخری سربراہ نائب دیوان رضا خان تھے۔ مرشد آباد کی نواب فیملی کی سرپرستی میں یہاں مسلمانوں کی آبادی قائم ہوئی اور پھر مختلف نوع کی تجارت کے باعث اس علاقے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ ٹیپو سلطان کی شکست اور انتقال کے بعد 1796ء میں ان کے ورثا کو جنوبی کلکتہ کے علاقہ ٹالی گنج میں آباد کیا گیا۔ ان کے ورثا میں پرنس غلام محمد انور شاہ مشہور شخصیت گزرے ہیں۔ ان کے نام سے اس علاقے کی ایک سڑک "پرنس انور شاہ روڈ" منسوب ہے۔ اس علاقے میں بھی مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ سلطنت اودھ کے آخری فرماں روا نواب واجد علی شاہ 1856ء میں معزولی کے بعد کلکتہ لائے گئے اور مٹیا برج کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا گیا۔

میں بسیں بدلتا ہوا مٹیا برج پہنچ گیا۔ گائیڈ کے بغیر منزل مقصود تک پہنچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ لوگوں سے پوچھتا ہوا 34 نمبر گارڈن ریچ روڈ میں واقع امام باڑہ پہنچ جاؤں، چنانچہ چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد میں اس تاریخی مقام پر پہنچ گیا، لیکن امام باڑہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ امام باڑہ کے اندر بادشاہ واجد علی شاہ ہمیشہ کے لیے استراحت فرما رہے تھے اور ان کے مقبرے کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس کے ارد گرد چند تاریخی تصاویر آویزاں تھیں اور بس۔ مقامی لوگوں سے بات چیت کرنے سے معلوم ہوا کہ زیادہ تر لوگوں کو اس "دوسرے لکھنو" کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے دھندے میں مصروف ہیں۔ اس علاقے میں اگرچہ آج بھی مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، لیکن زیادہ تر مسلمان غریب اور مفلوک الحال ہیں۔ صرف چند بہت ہی ضعیف لوگوں کو مٹیا برج کے ماضی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہیں، لیکن اب ان کی تعداد بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے یا ان کی یادداشتیں ان کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔

میں نے واجد علی شاہ کے مقبرے پر فاتحہ پڑھی اور اس عجیب و غریب بادشاہ کے بارے میں سوچنے لگا جو تعیش پسندی اور نفاست میں ساری دنیا میں مشہور ہے۔ انگریز سیاحوں اور مورخوں نے اسے بدنام

کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اسے تاریخ میں عجیب و غریب انداز میں پیش کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی ترقی کے ضمن میں جو کارنامے انجام دیئے، وہ بھی ناقابل فراموش ہیں۔ نثر ہو یا نظم، موسیقی ہو یا رقص یا مصوری۔ واجد علی شاہ کی خدمات کو فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک تعیش پسندی اور ایک سے زیادہ شادیاں کرنے اور داشتائیں رکھنے کا سوال ہے۔ کون حکمران ہے جس نے ایسا نہیں کیا؟ کیا شہنشاہ اکبر اور جہاں گیر ان "خوبیوں" سے مبرا تھے؟ پھر مغربی مورخین نے انہیں کیوں بدنام نہیں کیا؟ صرف واجد علی شاہ کو کیوں کیا؟

میں ماضی کے جھروکے میں جھانکتا ہوا قدیم مٹیا برج کے بارے میں سوچتا رہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ٹائم کیپسول میں بیٹھ کر قدیم مٹیا برج پہنچ گیا ہوں، خصوصاً آخری دور کے مٹیا برج میں۔ بادشاہ واجد علی شاہ کے انتقال کے فوراً بعد کے مٹیا برج میں۔ جب لکھنو کی طرح نئے لکھنو کا چراغ بھی ٹمٹارہا تھا اور ہر جانب تباہی و بربادی برپا تھی۔

ماضی کا مٹیا برج کیسا تھا؟ عبدالحلیم شرر اس کا ذکر اپنی مشہور تصنیف "گذشتہ لکھنو" میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ شرر نے مٹیا برج کو "نیا لکھنو" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مٹیا برج لاشبہ نیا لکھنو تھا، لیکن زوال لکھنو کی طرح زوال مٹیا برج بھی اپنی جگہ ایک عبرت ناک داستان ہے۔ شاعروں ادیبوں اور مورخوں نے مٹیا برج اور اس کی ثقافتی روایتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن واجد علی شاہ کی وفات کے بعد مٹیا برج اور اس کے رہنے والوں اور ان کے اہل خانہ پر جو کچھ گزری اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے۔

واجد علی شاہ کو انگریزوں نے جب 1856ء میں تخت سے بے دخل کر دیا تو بادشاہ کی معصومیت ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اس "ظلم" کے خلاف برطانیہ کی ملکہ معظمہ کے دربار میں فریاد کرنے کے لیے لندن جانے کا فیصلہ کر لیا، مگر حالات کچھ ایسے رونما ہوئے کہ وہ خود تو لندن نہ جاسکے، خود کلکتہ میں قیام کیا اور اپنی والدہ، چھوٹے بھائی اور ولی عہد پر مشتمل ایک وفد ضروری کاغذات اور بہت بڑے عملے کے ساتھ لندن روانہ کر دیا۔ کلکتہ میں بادشاہ نے جہاں قیام کیا وہ بعد میں مٹیا برج کے نام سے مشہور ہوا، جو دراصل ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھا۔ بادشاہ کے ساتھ لکھنو سے ان کے جو مصاحب اور اعزا، کلکتہ آئے۔ ان کی تعداد پانچ سو تھی، لیکن جب واجد علی شاہ نے انتقال فرمایا اس وقت تک مٹیا برج کی آبادی چالیس ہزار کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ یہاں صرف واجد علی شاہ اور ان کے اہل خانہ آباد نہیں ہوئے، بلکہ پورا لکھنو اٹھ کر یہاں آگیا۔ یہاں آباد ہونے والے زیادہ تر اہل لکھنو اور وہاں کے منتخب اور

باکمال ہنرمندوں نے بھی یہاں اپنا ڈیرا جمالیا۔ اس طرح یہ علاقہ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرا لکھنو بن گیا۔ بادشاہ نے اپنے ذوق کے مطابق اسے خوب بنایا، سنوارا اور اسے قابل دید مقامات میں لاکر کھڑا کیا۔ بادشاہ واجد علی شاہ یہاں کل بتیس سال رہے۔ اس میں دو سال کی وہ مدت بھی شامل ہے جب وہ فورٹ ولیم میں انگریزوں کی نظر بندی میں رہے۔ اس کے بعد انہوں نے 21 ستمبر 1887 بمطابق 3 محرم 1305 ھ کو انتقال فرمایا۔

ان کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے اعزا و مصاحبین کے لیے قیامت برپا ہو گئی اور افراد خانہ کے درمیان اتنے تضادات و اختلافات ابھرے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ عبدالحلیم شرر نے لکھا کہ "مٹیا برج مٹی میں مل گیا۔ کلکتے کا وہ گورنر لارڈ ڈفرن کی بے مہری پر قربان ہو گیا"۔ اس ضمن میں لارڈ ڈفرن یا انگریز حکمرانوں کو مورد الزام ٹھہرانا اس لیے درست نہیں ہے کہ واجد علی شاہ کے آنکھ بند ہوتے ہی ان کی جائیدادوں کے اتنے وارث نکل آئے کہ انگریز بہادر نے اس تنازعہ کو حل کرنے کا یہی طریقہ مناسب سمجھا کہ ساری جائیدادوں کو فروخت کر دیا جائے اور اس طرح جو رقوم ہوں وہ مرحوم بادشاہ کے ورثا میں تقسیم کر دی جائیں۔

اس دور کا مٹیا برج کیسا تھا یا شاہی محلات کیسے اور کتنے خوب صورت تھے۔ اس کا اندازہ اس دور کے ہفت روزہ اخبار "کارنامہ" کی فائلوں سے مطالعے سے ہوتا ہے، جو فرنگی محل، لکھنو سے نکلتا تھا اور جس کے مدیر مولوی محمد یعقوب انصاری (وفات 1908ء) تھے۔ اس تاریخی اور نادر اخبار میں مٹیا برج کی تباہی کے بارے میں جو کچھ شائع ہوا۔ اس سے اس دور کے سارے حالات و واقعات واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ مٹیا برج میں دریائے ہگلی کے کنارے لاکھوں روپے کی لاگت سے جو عمارات تعمیر ہوئیں وہ دریا کی طرف سے نہایت خوش نما اور پر فضا معلوم ہوتی تھیں اور ان مکانات میں جانوروں کے لیے علیحدہ علیحدہ کٹہرے اور جنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن میں ہزاروں قسم کے پرندے رہتے تھے اور یہ پنجرے طیور کی آوازوں سے گونجتے رہتے تھے۔ واجد علی شاہ کو صرف پرندے پالنے کا ہی شوق نہ تھا، انہوں نے مختلف قسم کے چرند بھی پال رکھے تھے، جن میں گھوڑے، ریچھ، چرخ، شیر اور ہاتھی کے علاوہ مختلف قسم کے جانور شامل تھے۔ یہ صرف محل نہ تھا۔ اچھا خاصا چڑیا گھر بھی تھا۔ بقول ہفت روزہ "کارنامہ" لکھنو۔

"وحشی جانور، جو خوشنما کٹہروں میں رہتے ہیں، وہ دیکھنے کے لائق ہیں اور بہت سے آبی جانور مرصع منزل کے سامنے حوض میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہاں صبح کو روشن چوکی بجتی تھی اور ان

جانوروں کی آبی خوش فعلی کی کیفیت دل کو بے چین کرتی تھی۔ سانپ "جبل ثعبان" میں ہیں اور ابھی نکالے نہیں گئے ہیں۔ سلطان خانہ کی عمارت نہایت خوش قطع اور وسیع ہے، جو اسباب عمدہ سے سجی ہوئی ہے۔ پانچ جھاڑ اس کوٹھی کے لیے استنبول سے ایک لاکھ روپے میں خریدے گئے ہیں۔ سلطان خانہ کا فرش سنگ مرمر کا ہے اور اس کے قریب سے دریا بہتا ہے۔ اس مکان کے متعدد کمرے ہیں اور سب میں ضرورت کا سامان یعنی کوچ اور پلنگ وغیرہ بچھے ہوئے ہیں اور شیشہ کے آلات خوب صورتی سے سجے ہوئے ہیں اور تصویروں کے مرقعے دیواروں پر آویزاں ہیں اور پنکھے منقش جھالروں کے ہیں اور کوٹھی شاہ منزل کی آرائش سرخ شیشہ آلات سے کی گئی ہے اور غلام گردش میں ہزار گملے چینی کے رکھے ہوئے ہیں"۔

اس اخبار سے معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ کی ادھر آنکھ بند ہوئی اور ادھر مٹیا برج کی پوری آبادی نظر بند کر دی گئی اور شاہی محل پر پہرہ بٹھا دیا گیا اور تین دن گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک آرڈی نینس کے ذریعے واجد علی شاہ کی تمام املاک پر حق صرف گورنر جنرل اور ان کی کونسل کو دے دیا گیا اور طے کیا گیا کہ قطع نظر اس کے کہ بادشاہ کا کوئی وصیت نامہ یا وارث ہے یا نہیں۔ گورنر جنرل املاک شاہی کے بارے میں جو بھی حکم دیں گے۔ اس کے خلاف کسی عدالت میں کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔ واجد علی شاہ کے ایک بیٹے صاحب عالم میرزا قمر قدر بہادر، جو فخر محل کے بطن سے تھے، افسر خاندان شاہی کے عہدے کے مدعی تھے۔ دوسری جانب بادشاہ کی ایک بیگم خاص محل کی کوشش تھی کہ وہ سربراہ خاندان مانی جائیں اور اولاد اور محلات ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ ان کی کوشش تھی کہ بادشاہ کا کل متروکہ و قرضہ حق مہر میں لے لیں اور ساتھ ہی گورنمنٹ سے اضافہ تنخواہ کے لیے دعویٰ بھی کریں۔ ایک جانب یہ سب کچھ رونما ہو رہا تھا۔ دوسرے جانب بادشاہ کے انتقال کی خبر سن کر چند شاہزادیوں نے، جو لکھنو میں قیام پذیر تھیں، رخت سفر باندھا اور مٹیا برج پہنچ گئیں اور انگریز بہادر سے اپنے حق کا دعویٰ کر دیا اور بادشاہ کے ترکے کی تقسیم کی درخواست کی۔ ادھر بادشاہ کے ترکے کی تقسیم کا مطالبہ ہو رہا تھا اور ادھر وائسرائے بہادر کے ایجنٹ کی جانب سے مٹیا برج کی تمام بیگمات شاہی کو شاہی محلات خالی کرنے کا نوٹس جاری کیا جا رہا تھا، چنانچہ کوٹھی رئیس منزل سے نواب زہرہ بیگم، نواب سحر نگاہ بیگم، نواب رقاصہ بیگم، نواب زینت بیگم، نواب حسن جہاں بیگم، نواب خورشید جمال بیگم محلوں سے اٹھا دی گئیں اور وہ خضر پور اور کلکتہ کے مختلف علاقوں میں مکانات کرائے پر لے کر رہنے لگیں۔

محلات کو خالی کرانے کا مقصد انہیں نیلام پر اٹھانا اور اس طرح نقد روپے جمع کرنا تھا، تاکہ ورثا میں

نقدی کی تقسیم ممکن ہو۔ اس مقصد کے لیے محلات اور اس کی نہایت قیمتی اور انمول اشیار کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔ اسے نیلام کہنے کی بجائے کھلی لوٹ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مثلاً شاہی چڑیا خانے کے جس پنجرے کی قیمت مع طیور چالیس روپے تھی وہ صرف چار روپے میں فروخت ہوا، چنانچہ 85 ہزار قیمتی جانور مع ساز و سامان صرف 85 ہزار روپے میں فروخت کر دیئے گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ ہر کوٹھی اور ہر کمرے سے نقری اور طلائی سامان اٹھا کر سلطان خانہ میں جمع کر دیا گیا، جن میں سوا سو نقری پلنگ اور نقری ظروف اور لاتعداد طلائی اور مرصع زیورات شامل تھے جو ہیملٹن کمپنی کو نیلام کی غرض سے دیئے گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں اسباب عزاداری بھی فروخت کر دیئے گئے۔ عام خیال یہ تھا کہ امام باڑہ سبطین آباد کی یہ اشیار فروخت نہیں کی جائیں گی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

واجد علی شاہ ایک اچھے شاعر اور مصنف تھے اور انہوں نے مٹیا برج میں بڑے اہتمام سے کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ پابندی کے ساتھ کتب خانہ جاتے اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ مٹیا برج کا زوال شروع ہوا تو شاہی کتب خانہ اور اس کی بیش قیمت کتابیں بھی نیلام پر چڑھا دی گئیں۔ ان کتابوں میں مذہبی کتب کے علاوہ تاریخی کتابیں، اساتذہ کے دواوین اور قلمی لغات وغیرہ بھی شامل تھیں۔ لوٹ مار کے علاوہ کتب خانے میں کھلے عام سرقہ بھی ہوا اور 10 فروری کو 20 مجلد کتب قلمی، جو سنہری حروف میں نہایت خوب صورتی سے لکھا ہوا ہے حکومت کے حکم سے ایجنٹ بہادر نے کتب خانہ شاہی سے گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیئے گئے۔ ان کتابوں میں ایک جلد حیات القلوب کا ترجمہ بھی تھا جسے بادشاہ واجد علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے ترجمہ کیا تھا اور اپنے دست و قلم سے بخط نستعلیق تحریر کیا تھا۔ ایک اور کلیات صائب جس کی ضخامت سو جز سے زیادہ تھی اور جسے بادشاہ نے ایک تاجر اصفہانی سے بہت کچھ دے کر خریدی تھی۔ وہ بھی گورنمنٹ کی نذر ہو گئی۔

محلات اور اسباب کے نیلام کے ساتھ ہی تمام کوٹھیوں کو مکینوں سے خالی کرا دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر جانب ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ محلوں کی صرف قیمتی اشیار ہی فروخت نہیں کی گئیں، بلکہ محل کے اندر لوہے اور لکڑیاں تک فروخت کر دی گئیں حتیٰ کہ مٹیا برج بھی، جس کی وجہ سے یہ علاقہ مشہور تھا۔ یہ برج سلطان خانہ کے احاطہ میں بالکل وسط میں فلک باغ میں واقع تھا۔ مشہور ہے کہ اس جگہ کسی زمانے میں برج خام تھا، جسے بادشاہ نے اس کو بلند کر کے ایک برج پختہ تعمیر کروایا اور دروازہ پر سیخ آہنی نصب کئے اور چاروں جانب سنگین زینے اور دونوں طرف ہر ایک زینے کے ساتھ نہایت خوشنما آہنی جنگلہ بنوایا، لیکن یہ تمام اشیار نہایت معمولی قیمت پر فروخت کر دی گئیں اور نیلام سے جو روپے جمع ہوئے۔

وہ واجد علی شاہ کے ورثا میں تقسیم کر دیئے گئے اور اس طرح تاریخ سلطنت اودھ کا ایک شاندار اور آخری باب اختتام پذیر ہوا۔ واجد علی شاہ کی بیگمات اور ان کی اولادیں کہاں گئیں؟ ان کا کیا بنا؟ کسی کو نہیں معلوم۔ البتہ ان کے وارثوں میں آج جو لوگ زندہ ہیں۔ وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

میں بہت دیر تک امام باڑے میں کھڑا زوال مٹیا برج کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر بھاری قدم اٹھاتا ہوا احاطے سے باہر نکل آیا۔

ستیہ جیت رائے نے مجھ سے جو پہلا سوال کیا وہ یہ کہ "اگر آپ پاکستان سے آئے ہیں تو بنگلہ میں کس طرح گفتگو کر رہے ہیں؟

میں نے جواب دیا، "میں پاکستان سے آیا ضرور ہوں، لیکن میں آپ کے شہر کا ہی رہنے والا ہوں اور بنگلہ زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں آپ سے ملنا اور آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں"۔

"انٹرویو تو ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے انٹرویو دینے سے منع کر دیا ہے۔ میرا ابھی بائی پاس آپریشن ہوا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ انٹرویو دینے سے اسائینیٹ منٹ ہو گا۔ اس لیے میں انٹرویو تو نہیں دوں گا، البتہ آپ سے بات چیت ہو سکتی ہے"۔

"آپ کوئی ایسا وقت دے دیجیے۔ جب آپ کو زحمت نہ ہو"۔

"آپ کل صبح دس بجے آجائیے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا"۔

"لیکن میں تو آپ کی رہائش گاہ سے واقف نہیں ہوں"۔

"میں ہوٹل ہندوستان انٹر نیشنل کے عقب میں رہتا ہوں۔ میرے گھر کا نمبر ہے۔۔۔۔"

ستیہ جیت رائے نے اپنے گھر کا پتہ اور لوکیشن سمجھا دیا۔

میں دوسرے روز صبح ساڑھے نو بجے ان کے گھر کے سامنے پہنچ چکا تھا، لیکن میں نے ان کے گھر میں داخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے پہلے ان کے گھر کا سراغ لگایا اور پھر ہوٹل ہندوستان انٹر نیشنل کے سامنے آدھ گھنٹے تک ٹہلتا رہا۔ میں ٹھیک وقت مقررہ پر ان کے دروازے پر دستک دینا چاہتا تھا۔ اس سے قبل نہیں۔ ان کا گھر برطانوی طرز کا بنا ہوا سفید رنگ کا مینشن تھا۔ اونچی اونچی دیواریں۔ بلند اور کشادہ دروازے اور قدیم طرز کی محرابیں اور کھڑکیاں۔ ایسے مکانات کراچی میں بہت کم

نظر آتے ہیں۔ البتہ کلکتے میں ایسی عمارتوں کی کمی نہیں۔ میں نے سب سے پہلے ان کے گھر کا جائزہ لیا۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں سے ان کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ تمام لوگ ان کے نام اور گھر سے واقف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شری رائے محلے میں بھی پہچانے جاتے ہیں۔

کلکتہ کے قیام کے دوران میں ستیہ جیت رائے کو کئی بار دیکھ چکا تھا اور سیمی ناروں اور مختلف تقریبوں میں ان کی تقریریں بھی سن چکا تھا لیکن کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس دفعہ جب کلکتہ گیا تو اس عالمی شہرت یافتہ نابغہ روزگار فلم ساز و ہدایت کار سے ملنے کو بڑا جی چاہا اور اس کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ ستیہ جیت رائے نے ایک اجنبی شخص کو جتنی آسانی کے ساتھ ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔ اس پر میں خود بہت حیران تھا۔

میں نے ستیہ جیت رائے کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ان کی زیادہ تر فلمیں دیکھ چکا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں کلکتہ کے قیام کے دوران ان کی تشکیل دی ہوئی تنظیم "کلکتہ فلم سوسائٹی" کا میں باقاعدہ رکن بھی تھا۔ ستیہ جیت رائے نے اپنے چند دوستوں کے اشتراک سے فلم آرٹ کے مطالعے اور فلم ایپری سیشن کے لیے ایک اسٹڈی سرکل قائم کیا تھا۔ جس کا نام "کلکتہ فلم سوسائٹی" تھا۔ میں اس کا واحد اردو داں رکن تھا۔ میں جب کلکتہ فلم سوسائٹی کا ممبر بنا اس وقت ستیہ جیت رائے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث اس سے عملی طور پر کنارہ کش ہو چکے تھے، البتہ وہ اس کے چیف پیٹرون تھے۔ اس وقت ان کے دیرینہ دوست، فلم ساز و ہدایت کار چیدانند داس گپتا صدر تھے۔ یہ وہی چیدانند داس گپتا ہیں جن کی بیٹی اپرنا سین کو ستیہ جیت رائے نے رابندر ناتھ ٹیگور کے مختصر افسانے پر بننے والی فلم "دئی کونا" (دو لڑکیاں) میں پیش کیا تھا جو بعد میں بنگلہ، ہندی اور انگریزی فلموں کی مشہور ہدایت کار بنی۔ جس کی انگریزی فلم "36 چورنگی لین" نے بڑی شہرت حاصل کی۔

فلم سازی کی تاریخ میں یوں تو ایک سے ایک بڑے فلم ساز و ہدایت کار گزرے ہیں، جنہوں نے فلم آرٹ کو ترقی دینے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور جن کی عظمت سے انکار ممکن نہیں، لیکن دنیائے فلم کی تاریخ میں صرف دو ایسی شخصیتیں گزری ہیں، جنہیں "اسکرین جینیس" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ ان میں ایک چارلس چیپلن اور دوسرے ستیہ جیت رائے ہیں۔ جارج برنارڈ شا فلم کے زیادہ قائل نہ تھے۔ اس لیے کہ ان کے ڈرامے "پیگ میلین" کو پردہ سیمیں پر اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ وہ فلمی صنعت کے سخت خلاف ہو گئے تھے، لیکن چارلس چیپلن اتنا بڑا فن کار تھا کہ شا کو بھی اس کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑا۔ شا نے ہی سب سے پہلے چیپلن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے

"اسکرین جنیس" قرار دیا تھا۔ اس کے ایک عرصے کے بعد دنیا کے بڑے بڑے فلمی ناقدوں اور فلمی مورخوں نے دوسری بار ستیہ جیت رائے کو ان کی شاہکار فلم "پوتھیر پانچالی" کے سلسلے میں اس خطاب سے نوازا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی اور نہ یہ کوئی معمولی اعزاز تھا۔

ستیہ جیت رائے کا شمار دنیا کے ہر دور کے دس بہترین ہدایت کاروں میں ہوتا ہے۔ ستیہ جیت رائے نے یہ اعزاز کیوں کر حاصل کیا؟ یہ بھی ایک دلچسپ اور ناقابل یقین قصہ ہے۔ دنیا میں بہت کم ایسے فلم ڈائریکٹر گزرے ہیں، جنہوں نے صرف ایک فلم بنا کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہو اور جن کا شمار دنیا کے عظیم ہدایت کاروں میں ہونے لگا ہو۔ ستیہ جیت رائے ان خوش قسمت ہدایت کاروں میں سے ایک ہیں، جنہیں ان کی پہلی فلم "پوتھیر پانچالی بنانے پر عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور وہ دنیائے فلم سازی میں جیتا جاگتا لیجنیڈ (داستانوی کردار) بن گئے، حالانکہ پوتھیر پانچالی بنانے سے قبل انہوں نے اسٹوڈیو کے اندر قدم تک نہیں رکھا تھا اور نہ انہوں نے کبھی مووی کیمرہ استعمال کیا تھا۔ فلم میں آنے سے قبل وہ ایک کمرشل آرٹسٹ تھے اور کتابوں کے سرورق اور بچوں کی کہانیوں کی کتابوں میں تصویریں اور خاکے بناتے تھے اور اسی کے ساتھ مشہور برطانوی اشتہاری ادارے "کریمر اینڈ کریمر" میں آرٹ ڈائریکٹر تھے۔

1948ء کا ذکر ہے کہ ایک روز ستیہ جیت رائے نے اپنے دوست چید انند داس گپتا سے کہا کہ "میں ایک دن دنیا کی عظیم ترین فلم بناؤں گا"۔

ستیہ جیت رائے کا یہ دعویٰ سن کر چید انند داس گپتا بے اختیار ہنس پڑے۔ بات ہنسنے کی ہی تھی، کیوں کہ اس وقت تک ستیہ جیت رائے کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ نہ فلم ڈائریکٹر کی حیثیت سے اور نہ کمرشل آرٹسٹ کی حیثیت سے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ستیہ جیت رائے نے چید انند داس گپتا اور اپنے دوستوں کے اشتراک سے "کلکتہ فلم سوسائٹی" کے نام سے ایک فلم اسٹڈی سرکل قائم کیا تھا جس کا مقصد دنیا کی شاہکار فلمیں حاصل کرنا اور انہیں دیکھنے کے بعد ان کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر غور کرنا تھا۔ فلم آرٹ کے سنجیدہ مطالعے کے لیے سوسائٹی نے ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم کی تھی۔ جس میں سارے جہاں سے فلم سازی سے متعلق کتابیں اور رسائل جمع کئے گئے تھے، چنانچہ ستیہ جیت رائے، چید انند اور دوسرے احباب کلکتہ فلم سوسائٹی کے دفتر میں جمع ہوتے، فلم آرٹ سے متعلق کتابیں پڑھتے۔ دنیا کی بہترین فلموں کی نمائش کا اہتمام کرتے اور ان فلموں اور ان کے ہدایت کاروں کے فن کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتے، اگر کوئی بڑا اور معروف بیرونی ہدایت کار ہندوستان کے

دورے پر آتا تو اسے لیکچر دینے کے لیے مدعو کرتے اور خود ایک روز دنیا کی شاہکار فلموں کے مقابلے میں اپنی فلم بنانے کا خواب دیکھتے۔ اس طرح فلم بنانے کے بارے میں سوچتے ہوئے پانچ سال اور فلم بنانے کی عملی تیاریاں کرتے ہوئے دس سال گزر گئے۔ بالآخر ستیہ جیت رائے نے 1956ء میں (جب ان کی عمر 34 سال تھی) اپنی پہلی عہد ساز فلم "پوتھیر پانچالی" مکمل کی۔ جس نے ہندوستانی صنعت فلم سازی کا رخ موڑ دیا اور جس نے بھارت کو دنیائے فلم سازی میں انتہائی بلند مقام پر پہنچا دیا، لیکن "پوتھیر پانچالی" اتنی آسانی سے مکمل نہیں ہوئی۔ اس کی ایک طویل اور نہایت دل چسپ داستان ہے۔

ستیہ جیت رائے نے اپنی فلم کے لیے بنگلہ زبان کے ایک ایسے ناول کا انتخاب کیا، جسے اگرچہ بنگلہ ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل تھا، لیکن جسے پردہ سیمیں پر پیش کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ناول شروع سے آخر تک بیانیہ انداز میں لکھا گیا تھا۔ اس میں کوئی افسانویت یا ڈرامائی عنصر نہ تھا، جسے متحرک تصویروں (امیجیز) کے ذریعے پیش کرنا آسان ہو۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ فلم ایک بصری فن (ویژول آرٹ) ہے جس میں کہانی یا واقعات متحرک تصویروں کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے صرف ایسی کہانیاں یا ناول پردہ سیمیں پر پیش کرنے کے لیے موزوں تصور کئے جاتے ہیں جن میں کہانی یا ڈرامائی عنصر موجود ہو، لیکن "پوتھیر پانچالی" ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کی طرح خالص بیانیہ انداز میں لکھا گیا تھا چنانچہ ستیہ جیت رائے سے قبل تقریباً دس ہدایت کاروں نے اس ناول کو فلمانے کا ارادہ کیا اور ارادہ ترک کر دیا، لیکن ستیہ جیت رائے نے اس بظاہر مشکل اور بہت ہی پیچیدہ ناول کو پردہ سیمیں پر پیش کرنے اور اس کا اسکرین پلے خود لکھنے کا تہیہ کیا۔ جو لوگ فلم آرٹ کے رموز و اسرار سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ فلم میں اسکرین پلے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور اچھا ہدایت کار سب سے پہلے فلم کی پوری کہانی کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ اسکرین پلے میں قلم بند کر لیتا ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ فلم میں اسکرین پلے کی وہی حیثیت ہے، جو عمارت کی تعمیر میں نقشے کی۔ ستیہ جیت رائے نے فلم سازی کا عملی تجربہ نہ ہونے کے باوجود فلم آرٹ کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی اور مشہور فلمیں دیکھی تھیں اور انہیں فلم سازی کی تکنیک اور تصویوڑی کا پورا ادراک تھا۔ اس لیے انہوں نے سب سے پہلے اس کا اسکرین پلے لکھا۔ آرٹسٹ ہونے کے ناتے انہوں نے ایک ایک سین اور ایک ایک شارٹ کا اسکیچ تیار کیا اور پھر فلم سازی کے لیے آگے قدم بڑھایا۔

ستیہ جیت رائے نے اتنے مشکل ناول کو کیوں منتخب کیا؟ میرے اس سوال کے جواب میں انہوں

نے کہا "میری زندگی میں فیصلہ کن لمحہ اس وقت آیا جب مجھے "پوتھیر پانچالی" کے ایک مصور ایڈیشن کے لیے خاکے بنانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ناول اگرچہ 1931ء میں شائع ہوا تھا، لیکن اس کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس کی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس میں بنگال کی دیہی زندگی کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی تھی۔ اس ناول کے لیے کام کرنے کے دوران میرے ذہن میں اسے پردہ سیمیں پر پیش کرنے کا خیال آیا اور میں اس کے لیے ذہنی تیاریاں کرنے لگا"۔

لکیر کے فقیر اور روایت پرست فلم سازوں کو جب معلوم ہوا کہ ستیہ جیت رائے نے ببھوتی بھوشن بینرجی کے اس ناول کو فلمانے کا فیصلہ کیا ہے تو انہوں نے پیشین گوئی کی کہ فلم ہرگز باکس آفس میں کامیاب نہیں ہوگی۔ ستیہ جیت رائے نے اس ناول کو پردہ سیمیں پر پیش کرنے کے بارے میں غور و خوض کرنے اور اس کا اسکرین پلے لکھنے میں پانچ سال کا عرصہ صرف کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ کلکتہ فلم سوسائٹی آگے چل کر بنگلہ فلم سازی کی صنعت میں ذہنی انقلاب کا باعث بنی۔ اس ادارے کے تحت فلم آرٹ کے کئی سچے پرستار ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ جن میں مصور بھی تھے اور شوقیہ فوٹو گرافر اور دوسرے پیشے سے وابستہ لوگ بھی۔ یہ لوگ بعد میں ستیہ جیت رائے کی یونٹ کے مستقل رکن بن گئے۔ ان میں مصور بنسی چندر گپتا اور شوبرو تو دت کے نام قابل ذکر ہیں۔ بنسی چندر گپتا بنیادی طور پر مصور تھے اور جن کی خواہش فلم انڈسٹری میں آرٹ ڈائریکٹر بننے کی تھی۔ 1950ء میں جب فرانس کے شہرہ آفاق ہدایت کار ژاں رینوا اپنی فلم "دی ریور" کی لوکیشن شوٹنگ کے لیے کلکتہ آئے تو بنسی چندر گپتا کو اس فلم میں اسسٹنٹ آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع مل گیا۔ ستیہ جیت رائے کے دوستوں میں صرف بنسی چندر گپتا ہی واحد ایسے شخص تھے، جنہیں کسی فلم میں اسسٹنٹ آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا عملی تجربہ حاصل ہوا تھا، ورنہ نہ تو ستیہ جیت رائے کو ہدایت کاری کا تجربہ تھا اور نہ شوبرو تو دت کو عکاسی کا عملی تجربہ۔ ستیہ جیت رائے نے اپنی فلم "پوتھیر پانچالی" بنانے سے قبل ایک یا دو فلموں کا اسکرپٹ ضرور لکھا تھا، لیکن ان میں سے کسی بھی اسکرپٹ پر فلم مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"پوتھیر پانچالی" کا اسکرپٹ مکمل ہونے اور فلم یونٹ کی تشکیل کے بعد پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ فلم بنانے کے لیے سرمایہ کہاں سے اکٹھا کیا جائے۔ ستیہ جیت رائے اور ان کے ساتھ انیل چٹرجی نے اس مقصد کے لیے ایک درجن پروڈیوسروں سے رجوع کیا۔ ان پروڈیوسروں میں اورورا فلمز کے اجیت بوس بھی شامل تھے، جو بعد میں اس فلم کے تقسیم کار اور ستیہ جیت رائے کی دوسری فلم "اپراجیتو" کے

سرمایہ کار ہوئے۔ انہیں "پوتھیر پانچالی" کی کہانی پسند آئی اور وہ اس میں سرمایہ لگانے کے لیے آمادہ بھی ہو گئے، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی رکھی کہ یہ فلم کسی بڑے اور مشہور ہدایت کار کی نگرانی میں بنے گی۔ یہ ایک ایسی شرط تھی، جسے ستیہ جیت رائے کسی حال میں تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ ستیہ جیت رائے نے جب اس سلسلے میں دوسرے پروڈیوسروں سے رجوع کیا تو انہوں نے بھی یہ شرط عائد کی کہ وہ اسی شرط پر سرمایہ لگائیں گے جب فلم میں مشہور اور تسلیم شدہ فلم اسٹاروں کو لیا جائے گا۔ رائے آرٹسٹوں کے انتخاب میں کسی سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں کسی حال میں فلم سازوں سے سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ جیسا میں چاہتا ہوں۔ فلم اسی طرح بنے گی، ورنہ نہیں بنے گی"۔

ستیہ جیت رائے اور ان کی یونٹ کے ارکان فلم سازوں کی تلاش میں پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ انہیں فلم ساز نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ ہر طرف سے مایوسی اور ناکامی کے بعد بالآخر ستیہ جیت رائے نے اپنی بیمہ پالیسی کے عوض انشورنس کمپنی سے ساڑھے سات ہزار روپیہ قرض حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب سے مزید دو ہزار روپے قرض لیے اور اس طرح کل ساڑھے نو ہزار روپے سے "پوتھیر پانچالی" کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ رائے نے سب سے پہلے 16 ملی میٹر کا کیمرہ حاصل کیا اور آزمائشی طور پر فلم کی خود عکاسی کی۔ ستیہ جیت رائے نے اتنے قلیل سرمائے سے اس فلم کی قطعی غیر معمولی انداز میں شوٹنگ شروع کی۔ اس کے تمام اداکار سوائے کانو بینرجی کے، شوقیہ فن کار تھے، چنانچہ انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اسٹوڈیو کے اخراجات سے بچنے کے لیے فلم کی تمام تر شوٹنگ آؤٹ ڈور کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شوٹنگ کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب تمام سرمایہ ختم ہو گیا اور یونٹ کے پاس لوکیشن شوٹنگ میں آرٹسٹوں کو دوپہر کا کھانا تک کھلانے کے لیے پیسہ نہ تھا۔ ستیہ جیت رائے کی بیوی بجویا کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً پروڈکشن مینیجر انیل چودھری کو اپنے ہاتھوں سے سونے کا کنگن اتار کر دے دیا بجویا نے جوش میں آکر کنگن دینے کو تو دے دیا، لیکن بجویا اور انیل کو اس کا احساس تھا کہ اگر ستیہ جیت رائے کی ماں کو اس کا علم ہو گیا تو انہیں بہت دکھ ہو گا۔ ان کی والدہ پرانے زمانے کی عورت تھیں اور خاندانی روایات کی سخت پابند۔ کنگن کو بنگال میں سہاگ کی علامت تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ ستیہ جیت رائے کی ماں سے حقیقت حال کو چھپانے کے لیے بالکل اسی قسم کے رولڈ گولڈ کے کنگن کا انتظام کرنا پڑا اور بجویا نے بہت دنوں تک نقلی سونے کا کنگن پہن کر ساس سے راز کو چھپائے رکھا۔

ستیہ جیت رائے نے فلم کی شوٹنگ جاری رکھنے اور سرمایہ حاصل کرنے کی غرض سے اپنی والدہ اور والد کی تمام قدیم اور نایاب کتابیں، آئیل پینٹنگز اور لانگ پلیئنگ ریکارڈوں کا سیٹ فروخت کر دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں ستیہ جیت رائے کو ایک تقسیم کار مل گیا۔ جس نے اس فلم کی تکمیل میں تھوڑا بہت سرمایہ لگایا، لیکن فلم ابھی نصف مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ مذکورہ تقسیم کار کی مالی حالت خراب ہو گئی اور فلم کی شوٹنگ رک گئی۔ ستیہ جیت رائے اور ان کی یونٹ کے ارکان نے ایک بار پھر نئے فلم سازوں کی تلاش شروع کر دی، لیکن انہیں کوئی سرمایہ کار نہیں ملا۔ بالآخر ہر جانب سے مایوس ہونے کے بعد رائے نے اپنی توجہ اکسپوز کی ہوئی فلم کی پروسیسنگ اور ایڈیٹنگ کی جانب مبذول کر دی۔

ایسے وقت جب ہر جانب مایوسی اور ناکامی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک امید کی ایک کرن نظر آئی۔ امریکہ کے مشہور و معروف ہدایت کار جون ہوسٹن، کیپلنگ کی کہانی پر مبنی فلم "دی مین ہو وانٹیڈ ٹو بی کنگ" کی لوکیشن شوٹنگ کے لیے کلکتہ آئے۔ ستیہ جیت رائے کے دوست آر۔ پی گپتا نے ہوسٹن کو بتایا کہ ستیہ جیت رائے نامی ایک کمرشل آرٹسٹ ایک بہت ہی دلچسپ فلم بنا رہا ہے اگر ہوسٹن اس فلم کا تیار شدہ حصہ (رش پرنٹ) دیکھنا پسند کریں تو اس کی نمائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ہوسٹن اس کے لیے آمادہ ہو گئے۔ جون ہوسٹن نے جب یہ فلم دیکھی تو انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ بلاشبہ ایک غیر معمولی فلم ہے جسے ہر حال میں مکمل ہونا چاہیے۔ انہوں نے ستیہ جیت رائے کو یقین دلایا کہ اس فلم کی تکمیل میں ان سے جہاں تک ہو سکے گا، مدد کریں گے۔ انہوں نے رائے کو یہ مشورہ بھی دیا کہ جب فلم مکمل ہو جائے تو وہ اسے ضرور کسی بین الاقوامی فلمی میلے میں بھیجیں۔ جون ہوسٹن کی ان باتوں سے ستیہ جیت رائے کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان میں اپنے فن کے بارے میں خود اعتمادی پیدا ہوئی، لیکن ان باتوں سے سرمائے کی فراہمی میں کوئی مدد نہیں ملی۔ جس کے باعث ان کی بے چینی روز بروز بڑھتی گئی۔

ستیہ جیت رائے کی والدہ شوپربھا رائے کو (جو خود بھی بنگلہ زبان کی مشہور مصنفہ تھیں) اپنے بیٹے کی سرگرمیوں کا پورا علم تھا، لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ستیہ جیت رائے ایک ایسے پیشے میں داخل ہو، جس میں ہمیشہ غیر یقینی صورتحال رہتی ہو، لیکن انہیں ستیہ جیت رائے کے جذبہ شوق کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اتفاق سے ایک روز ان کی سہیلی مسز ایس ان سے ملنے کے لیے آئیں۔ انہوں نے مسز ایس کو ستیہ جیت رائے کے بارے میں تمام ماجرا کہہ سنایا۔ مسز ایس کے مشہور کانگرسی لیڈر اور مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے سے دیرینہ مراسم تھے۔ انہوں نے شوپربھا رائے

سے وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے سے ان کے بیٹے کی غیر مکمل فلم کے بارے میں باتیں کریں گی۔

اتفاق سے ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے ستیہ جیت رائے کے والد شو کمار رائے اور ان کے خاندان سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ ڈاکٹر رائے کو جب معلوم ہوا کہ سرمائے کی کمی کے باعث ستیہ جیت رائے کی فلم غیر مکمل پڑی ہوئی ہے تو انہوں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر رائے ایک سیاست داں اور میڈیکل پریکٹیشنر تھے۔ انہیں فلم آرٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی چنانچہ انہوں نے اسے فوراً ایک دستاویزی فلم تصور کیا اور فلم کی تکمیل کے لیے حکومت کی جانب سے سرمایہ فراہم کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے عوض حکومت نے اس کی تقسیم کے حقوق حاصل کر لیے۔ اس طرح دو لاکھ کی لاگت سے یہ عہد ساز فلم پایہ تکمیل کو پہنچی۔

اس داستان کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس سے حکومت مغربی بنگال کو لاکھوں روپے کی آمدنی ہوئی، لیکن ستیہ جیت رائے کو سوائے ان کی جانب سے لگائی ہوئی رقم کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ جون ہوسٹن کے مشورے کے مطابق ستیہ جیت نے اس فلم کو فرانس کے مشہور عالمی فلمی میلے "کان فلم فیسٹیول" میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں اسے پہلا بین الاقوامی ایوارڈ حاصل ہوا، لیکن اس ایواڈ کے ملنے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ تاریخ پوشیدہ ہے۔

کان کا بین الاقوامی فلمی میلہ دنیا کے دوسرے فلمی میلوں کی بہ نسبت اس اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس میلے میں کسی فلم کے انعام حاصل کرنے کا مطلب فلم کی عالمی منڈی میں اس فلم کے لیے مستقل مقام حاصل کر لینا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر کے فلم ساز اور ہدایت کار اور فلمی تجارت کے ماہرین کان کے فلمی میلے میں خاص طور پر شرکت کرتے ہیں اور جس فلم کو بین الاقوامی ایوارڈ ملتا ہے، اسے فوری طور پر بین الاقوامی منڈی کے لیے بک کر لیتے ہیں۔ اس فلمی میلے میں دنیا بھر کے نئے اور پرانے فلم ساز اور ہدایت کار اپنی فلمیں بھیجنا باعث فخر تصور کرتے ہیں، لہٰذا لاتعداد فلموں میں سے کسی ایک بہترین فلم کا انتخاب بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔

ستیہ جیت رائے کی فلم "پوتھیر پانچالی" کی نمائش کے لیے دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تھا، جو کسی اعتبار سے مناسب نہ تھا۔ اس لیے کہ جیوری صبح سے یکے بعد دیگرے فلمیں دیکھتے دیکھتے تھک جاتی تھی۔ لنچ کے فوراً بعد فلموں کی نمائش پھر شروع ہو جاتی تھی۔ دوپہر والے شو میں جیوریوں کی بہت کم تعداد شرکت کرتی تھی اور جو کرتی تھی، ان میں بھی بہت سے جج صاحبان ہال میں اونگھتے رہتے تھے یا پھر سو جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوپہر کو دکھائی جانے والی فلموں سے بہت کم انصاف ہوتا تھا۔ "پوتھیر

پانچالی" کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ فلم جس وقت دکھائی گئی۔ اس وقت جیوریوں کی اکثریت سینماہال سے غائب تھی اور جو تھوڑے بہت جج موجود تھے ان میں سے بعض بے دلی سے فلم دیکھ رہے تھے اور بعض اونگھ رہے تھے۔ جیوریوں میں فرانس کے مشہور و معروف فلم ساز اور ہدایت کار اور "نیو ویو اسکول آف فلم میکرز" کے ایک اہم رکن فراں سواتروسو بھی شامل تھے، جنھوں نے چند فلمیں بنا کر اپنے لیے دنیا کے بڑے فلم سازوں میں مقام بنالیا تھا۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ فراں سواتروسو نے ستیہ جیت رائے کی اس فلم کو بکواس قرار دیا اور وہ فلم ختم ہونے سے قبل ہال سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا "فلم اس قدر بور تھی کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا"۔

اس کے برعکس فرانس کے مشہور فلمی مورخ اور نقاد جارج سادول کو یہ فلم بہت پسند آئی اور انہوں نے فسٹیول کمیٹی سے کہہ کر "پوتھیر پانچالی" کی دوبارہ نمائش کروائی اور جیوریوں کے فل بینچ نے اس فلم کو دیکھ کر بین الاقوامی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ ستیہ جیت رائے کی فلموں نے دنیا کے مختلف فلمی میلوں میں جتنے انعامات اور اعزازات حاصل کئے ہیں اس کی دنیا کی فلمی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ دنیا میں ایک سے ایک عمدہ فلمیں بنی ہیں اور دنیا میں ایک سے ایک بڑے اور عہد ساز ہدایت کار پیدا ہوئے ہیں، لیکن ستیہ جیت رائے کو انفرادی طور پر جتنے انعامات حاصل ہوئے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔

میں نے ٹھیک دس بجے ستیہ جیت رائے کے دروازے پر دستک دی۔ ان کے بیٹے نے دروازہ کھولا۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ ستیہ جیت بابو سے اپنے اپوائنٹمنٹ کا ذکر کیا اور اپنا ویزیٹنگ کارڈ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے چونکہ ان کے صاحب زادے کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے انہیں فوری طور پر پہچان نہ سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ فلم اور ٹی وی کے لیے آزادانہ طور پر فلم بنانے کے علاوہ اپنے والد کی فلموں میں بھی معاون کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر میں وکٹورین اسٹائل کا بہت بڑا دروازہ کھلا اور میں دو بڑے اور کشادہ کمروں سے گزرتا ہوا اس کمرے میں پہنچا جہاں رائے بابو ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھے۔ ان کی گود پر کاغذات پڑے ہوئے تھے اور ایک ہاتھ میں قلم تھا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ وہ میری آمد سے قبل مسودے کی تصحیح میں مصروف تھے۔ میں نے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ شیلف کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس میں دنیا کے بڑے بڑے مصوروں کے بارے میں جہازی سائز کی رنگین کتابوں کے علاوہ موسیقی اور سنگ تراشی سے

متعلق کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

میں نے ان سے دوبارہ اپنا تعارف کرایا۔ انہیں بتایا کہ میں ان کا بڑا مداخ ہوں۔ میں کلکتہ فلم سوسائٹی کا رکن رہ چکا ہوں۔ پوتھیر پانچالی" سے لے کر "مہا نگر" اور شطرنج کے کھلاڑی" تک دیکھ چکا ہوں، البتہ ان کی فلم "گھورے بائیرے" "گھر میں اور گھر کے باہر" نہیں دیکھ سکا۔ اس لیے کہ میری کلکتہ آمد سے ایک ہفتہ قبل یہ فلم سینما گھروں سے اتر چکی ہے"۔

وہ میری لکنت آمیز ٹوٹی پھوٹی بنگلہ زبان سن کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے پوچھا "آپ نے بنگلہ زبان کہاں اور کیسے سیکھی؟"

میں نے جواب دیا، "رابندر ناتھ ٹھاکر اور قاضی نذرالاسلام کو ان کی اصل زبان میں پڑھنے کے لیے۔ یوں بھی میں کلکتے کا رہنے والا ہوں۔ بنگلہ زبان دن رات بولتا اور سنتا رہتا تھا۔ مجھے بنگلہ رسم الخط سیکھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی"۔

بنگالیوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی زبان ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کسی بنگالی کے دل میں اترنا مقصود ہو تو اس سے اس کی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے۔ وہ فوراً اپنا دل نکال کر آپ کے قدموں میں رکھ دے گا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ستیہ جیت رائے بڑے اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، لیکن میری ٹیپ ریکارڈر پر نظر پڑتے ہی وہ ناراض ہو گئے۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں انٹرویو نہیں دوں گا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ پھر بھی آپ ٹیپ ریکارڈر لے کر آ گئے؟"

میں نے بات بگڑتی ہوئی دیکھ کر فوراً اپنا پینترا بدلا اور ٹیپ ریکارڈر کو ایک جانب سرکاتے ہوئے کہا، "میں ٹیپ آپ سے انٹرویو کرنے کے لیے نہیں لایا۔ یہ ٹیپ ریکارڈر تو سفر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں تو آپ سے صرف گفتگو کرنے آیا ہوں"۔

"تو پھر فرمائیے، آپ کیا چاہتے ہیں؟" ستیہ جیت رائے نے مسودہ اپنے قریب رکھی ہوئی ٹی پوئے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی فلموں اور آپ کے آرٹ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں، لیکن میں آپ کے گھرانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں آپ کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں"۔ میں نے ہمت کر کے دریافت کیا۔

ستیہ جیت بابو نے کہا۔ "میرے دادا مصور اور شاعر تھے۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کا ایک ماہنامہ

"سندیش" بھی نکالتے تھے جو بنگلہ زبان میں بچوں کا پہلا رسالہ تھا۔ جس میں ہندوستان میں پہلی بار ہاف ٹون اتصویریں شائع ہوئیں۔ میرے والد شوکمار رائے بھی بہت مشہور ادیب تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے ابتدا میں مجھے طبعیات اور اقتصادیات سے دلچسپی تھی اور میں نے ان دونوں مضامین میں کلکتہ یونیورسٹی سے آنرز کیا تھا۔ اس کے بعد میں مزید تعلیم کی غرض سے شانتی نیکتن چلا گیا، جو ہندوستان کی ایک غیر معمولی دانش گاہ ہے۔ اسے آج سے ایک صدی قبل روبندر ناتھ ٹھاکر نے قائم کیا تھا۔ روبی ٹھاکر اور میرے گھرانے میں گہرے مراسم تھے۔ اس لیے میرا شانتی نیکتن جانا فطری امر تھا۔ وہاں جانے کے بعد مجھے میں پہلی بار جمالیاتی ذوق پیدا ہوا اور مجھے مصوری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں ایک شخصیت کا عمر بھر شکر گزار رہوں گا، جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ ہیں میرے پینٹنگ کے ٹیچر اتولیہ بوس۔ جو خود بھی اپنے دور کے مشہور اور بڑے مصور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہی مجھ میں تخلیقی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا کیا"۔

"کیا آپ نے شانتی نیکتن سے کوئی ڈگری حاصل کی؟"

"جی نہیں، میں نے وہاں اپنا کورس تک مکمل نہیں کیا۔ وہاں فلم آرٹ کا کوئی چرچا نہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیوں کر ہوا، البتہ فلم نے مجھے بہت اپیل کی۔ روبی ٹھاکر کے انتقال کے بعد (روبی ٹھاکر کا انتقال 1941 ء میں ہوا) میں نے وہاں چینی خطاطی اور ہسٹری آف آرٹس کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد کلکتہ واپس آگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ فائن آرٹس میں میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے 1943 ء میں ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں ملازمت کر لی۔ جہاں میں آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا اور وہاں بہت عرصے تک رہا"۔

ستیہ جیت رائے نے چونکہ انٹرویو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے میں ان کی ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔ کاغذ و قلم کو ہاتھ تک نہ لگایا تاکہ ستیہ جیت بابو برا نہ مان جائیں۔ اس موقع پر میرا اخبار نویس ہونا کام آیا۔ ستیہ جیت رائے اب گفتگو کے موڈ میں آ چکے تھے۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

1950 میں میں اپنی فرم کی طرف سے ایک کام سے انگلینڈ گیا وہاں مجھے تین ماہ رہنے کا موقع ملا۔ میں نے اس اثنا میں یکے بعد دیگرے تقریباً 90 فلمیں دیکھیں۔ میں نے وہاں ہر چیز کا بلا تھکن مطالعہ کیا۔ وکٹوریو۔ دا۔ سکا کی فلم "بائیسکل تھیف" وہ فلم تھی جس نے مجھے سکھایا کہ مجھے اپنی مجوزہ فلم کس طرح بنانی چاہیے، یعنی فلم میں کسی بھی اسٹار کو نہ لیا جائے اور پوری فلم لوکیشن میں اتاری جائے۔

میں جب وطن واپس آیا اور فلم بنانے کی کوشش کی تو مجھے کوئی ترک سرمایہ کار نہیں ملا یہ بڑی طویل داستان ہے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہوگا مختصر یہ کہ فرانس کے مشہور فلم ساز اور ہدایت کار ژاں رینوا (jean renoir) کو اپنی مجوزہ فلم کے بارے میں بتایا (جن سے میرے دوست اور ان کی فلم کے اسسٹنٹ آرٹ ڈائریکٹر بنسی چند داس گپتا نے تعارف کرایا تھا) تو انہوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ میں اس منصوبے پر ضرور کام کروں، چنانچہ میں 1952ء سے اس فلم کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور بڑی تگ و دو کے بعد یہ فلم مکمل ہوئی۔ اس فلم کی پس پردہ موسیقی مشہور ستار نواز روی شنکر نے 14 گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد مرتب کی۔

ستیہ جیت رائے نے بتایا "میں اس فلم پر جلد از جلد کام شروع کر دینا چاہتا تھا، تاکہ میں اس کے لیے سرمایہ کار تلاش کر سکوں، چنانچہ میں نے سب سے پہلے ایک ٹیم بنائی۔ جس میں تمام تر شوقیہ فن کار تھے۔ ٹیم کے تمام ارکان مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتے تھے اور تمام ارکان کہیں نہ کہیں ملازم تھے۔ اگر فلم کے شوق میں یہ لوگ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیتے تو بڑی حماقت ہوتی، چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم صرف اتوار یا تعطیل کے روز شوٹنگ کریں گے۔ جب تمام دفاتر بند ہوں۔ آخر کار ہم نے چند ہزار فیٹ فلم اکسپوز کر لی، لیکن ہمیں کہیں سے مدد نہ ملی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد حکومت مغربی بنگال نے ہمیں ڈوبنے سے بچایا۔ اس زمانے میں ملک میں خام فلموں کی راشننگ تھی۔ اس لیے فلم کا بے دریغ استعمال ممکن نہ تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے شوقیہ فن کاروں سے زیادہ ریہرسل بھی نہ کرائی۔ میں نے اداکاروں کے اولین تاثرات اور جذبات کے اظہار کو اطمینان بخش پایا اور میں نے اسے ہی فلم بند کر لیا۔ ہمیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہم لوگ اس میدان میں طالب علم ہیں اور سیکھ رہے ہیں چنانچہ ہم سکوئنس پر سکوئنس فلماتے چلے گئے۔ بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا جب ہمیں فلم کا ڈرامائی کلائمکس فلمانا پڑا"۔

"کیا آپ نے فلم کی اصل کہانی میں رد و بدل بھی کی؟"

"پوتھیر پانچالی" میں بہت کم۔ البتہ "اپراجیتو" میں بہت زیادہ ترمیم کرنی پڑی۔ انڈیا میں "اپراجیتو" پر شدید نکتہ چینی ہوئی۔ کیونکہ اس میں میں نے ناول سے کئی مقامات پر انحراف کیا تھا۔ بنگالی قارئین اس ناول سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں امید تھی کہ فلم ناول کے عین مطابق فلمائی جائے گی۔ میں نے "پوتھیر پانچالی" میں بھی بعض فنی تقاضوں کے تحت ناول سے انحراف کیا تھا اور کرداروں کی تعداد کم کر دی تھی۔ ناول میں کم و بیش تین سو کردار تھے۔ میں نے ناول میں فلم میڈیا کے تقاضے کے

تحت ترمیم کی۔ میں نے ناول کے صرف ادبی ہیئت سے انحراف کیا تھا، کہانی سے نہیں۔ فلم کا اپنا طرز اظہار ہوتا ہے جو ناول سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ فلم میڈیا کو اس کے تقاضے کے مطابق پوری آزادی ملنی چاہیئے۔ میں فلم کو اول تا آخر فن فلم سازی کے مطابق بنانے سے دلچسپی رکھتا ہوں"۔

میں نے دریافت کیا "کیا آپ کے خیال میں فلم کسی قسم کا فلاحی یا سماجی پیغام بھی پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ بنگلہ اور ہندوستانی فلموں میں ضروری تصور کیا جاتا ہے؟"

ستیہ جیت رائے نے جواب دیا "میں فلم میں سماجی پیغام کا قائل نہیں۔ میں نے جس ناول کا انتخاب کیا تھا۔ اس میں دراصل ہندوستان کی بڑی سچی عکاسی کی گئی تھی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس میں Quality of Truth تھی اور یہ کوالیٹی مجھے ہمیشہ پسند رہی ہے۔ میں اسے جہاں بھی پاتا ہوں۔ اس کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتا ہوں"۔

ستیہ جیت رائے کو بمبئی اور ہالی ووڈ سے فلم بنانے کا کئی بار آفر مل چکا ہے، لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ خود اپنی راہ پر چلنے کے قائل ہیں۔ کسی دوسرے کی رہنمائی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ وہ فلم سازی میں لاگت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی فلمیں بہت کم لاگت میں بنتی ہیں۔

میں نے بات کا رخ ان کی ہندوستانی فلموں کی جانب موڑتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں بنگلہ زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں فلمیں نہیں بناؤں گا جب تک کہ مجھے اس زبان پر عبور نہ ہو۔ آپ نے منشی پریم چند کے افسانے پر فلم "شطرنج کے کھلاڑی" کس طرح بنائی؟

ستیہ جیت رائے میرا سوال سن کر چند لمحوں کے لیے خاموش رہے۔ پھر بولے "بات دراصل یہ ہے کہ بنگلہ فلموں کا سرکٹ بہت محدود ہے۔ اس قدر محدود کہ اس سے فلم سازی کی لاگت پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے مجبوراً ہندوستانی فلم بنانی پڑی"۔

میں نے زمانہ طالب علمی میں پریم چند کا یہ افسانہ پڑھا تھا۔ اس وقت سے مجھے یہ افسانہ ہنٹ کر رہا تھا، چنانچہ میں نے جب ہندوستانی زبان میں فلم بنانے کا فیصلہ کیا تو اسے سب سے پہلے منتخب کیا"۔

"آپ نے امجد خاں جیسے خالص ولن کو اتنے اہم کردار کے لیے کیسے منتخب کر لیا؟"۔

"میں نے اس کی فلم "شعلے" دیکھی تھی۔ اس کی اداکاری پسند آئی اور میں نے اسے اپنی فلم کے لیے لینے کا فیصلہ کر لیا"۔

"آپ نے "شطرنج کے کھلاڑی" کے علاوہ بھی کوئی ہندوستانی فلم بنائی ہے؟"

"جی ہاں۔ "سوگتی" بنائی ہے۔ جس میں سمیتا پاٹل اور اوم پوری نے کام کیا ہے"۔

"سنا ہے آپ نے "شطرنج کے کھلاڑی" بنانے سے قبل اودھ کی تہذیب کے بارے میں بہت ریسرچ کیا تھا،"

"جی ہاں، تاریخی فلم بنانے کے لیے تو ریسرچ کرنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر کی کتاب "لکھنو کی آخری تہذیب" کے انگریزی ترجمے سے بڑی مدد ملی۔ اس کا انگریزی اسکرپٹ شمع زیدی نے لکھا ہے اور جاوید صدیقی نے اسے اردو میں منتقل کیا ہے"۔

"آپ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟"

"فارغ ہوں۔ "گھورے بائیرے" بنانے کے بعد ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان دنوں میں صرف نوجوانوں کے رسالہ "سندیش" کو ایڈیٹ کر رہا ہوں"۔

"اگر آپ اپنی کوئی تصویر عنایت فرمائیں تو بڑا کرم ہو گا۔ یہ یادگار تصویر میرے پاس محفوظ رہے گی"۔

ستیہ جیت رائے نے دراز سے ایک تصویر نکال کر میرے حوالے کر دی۔

"اس طرح نہیں۔ اسے میرے نام معنون کیجیے اور ساتھ ہی اپنا دستخط بھی"۔

ستیہ جیت رائے نے ایسا ہی کیا اور میں ان کا شکریہ ادا کر کے ان سے رخصت ہو گیا۔

بنگلہ تھیٹر

کلکتے کے قیام کے دوران میں نے خاص طور پر شمالی کلکتہ میں شام بازار کے علاقے میں واقع تھیٹروں کا اس غرض سے دورہ کیا کہ میں بنگلہ ڈرامے دیکھ سکوں۔ میں جب کلکتے میں تھا وہاں جب بھی کوئی نیا اور مشہور بنگلہ ڈراما اسٹیج ہوتا اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھنے کے لیے ضرور جاتا۔ کلکتے کی تہذیبی زندگی میں اسٹیج کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ کلکتے میں ایک سو سے زیادہ سینما گھروں اور بنگلہ اور ہندوستانی فلموں کی انتہائی مقبولیت کے باوجود وہاں تھیٹر پر فلم کا کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوا۔ وہاں کم از کم تین چار ایسے پیشہ ور تھیٹر موجود ہیں۔ جہاں روزا یک شو اور اتوار اور تعطیل کے دنوں میں دو شوز ہوا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بنگالیوں کا اپنی تہذیب اور ڈرامے کی روایت سے والہانہ لگاؤ تھا، جس نے کبھی فلم اور تھیٹر کے درمیان تصادم کا موقع فراہم نہیں کیا۔ فلم ایک جدید اور مقبول عام ماس میڈیا تھی، جس نے بنگالی عوام کی تہذیبی زندگی میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ڈرامے کی بہت قدیم اور طویل روایت موجود تھی، خصوصاً بنگال میں عوامی ناٹک "جاترا" کی روایت کئی ہزار سال قدیم تھی اور جدید اسٹیج ڈراما اسی کا ترقی یافتہ روپ تھا اور اب تھیٹر بنگالی عوام کی تہذیبی زندگی کا جزبن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے برصغیر میں صرف بنگلہ اور مراٹھی زبانیں ہی ایسی تھیں، جن میں ڈرامے کی روایت بہت مستحکم ہے اور جہاں اسٹیج ڈراما (تھیٹر) آج بھی مقبول ترین ذریعہ اظہار ہے۔

میں نے کلکتہ کے وشوا روپا، مینروا تھیٹر اور اسٹار اتھیٹر میں آج کے دور کے مشہور و معروف اداکاروں، مثلاً شیشر کمار بھادوڑی، اتپل دتہ، ابھی بھٹاچاریہ اور اسٹیج کے مشہور جوڑے شومین مترا اور ترپتی مترا کو اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے بعض نے بنگلہ اور ہندوستانی فلموں میں

کام کر کے بڑی شہرت حاصل کی تھی، لیکن ان کی اصل شناخت اسٹیج اداکار کی تھی۔ یہ لوگ بہت ہی پڑھے لکھے تھے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی اسٹیج کے لیے وقف کر دی تھی، خصوصاً شیشر کمار بھادوڑی اور اتپل دتہ کا شمار بنگال کے بڑے اور عہد ساز لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان میں بعض کالج میں پروفیسر تھے اور بعض اداکار، ڈراما نگار اور ڈراما پروڈیوسرز۔ اسٹیج سے ان کے لگن اور انہماک نے انہیں بنگالی معاشرے میں بہت بلند مقام عطا کیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سارے اداکار نہ صرف پیشہ ور آرٹسٹ تھے، بلکہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے اور بعض کا تو کمیونسٹ پارٹی اور نکسل باڑی تحریک سے براہ راست تعلق تھا مثلاً اتپل دتہ کو اندرا گاندھی کے دور میں اس لیے جیل میں نظربند کر دیا گیا تھا کہ ان کا تعلق کمیونسٹ تحریک سے تھا۔ اس وقت وہ آر۔ کے۔ نرائن کے ناول پر مبنی ایک امریکی فلم "گرو" میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کی نظربندی کی وجہ سے فلم ساز کو بہت نقصان ہو رہا تھا کیونکہ فلم کی شوٹنگ رک گئی تھی چنانچہ فلم ساز نے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے درخواست کی کہ اتپل دتہ کو پیرول پر رہا کیا جائے، تاکہ وہ فلم میں اپنا نامکمل کردار ادا کر سکیں، لہذا اندرا گاندھی کی خصوصی اجازت سے اتپل دتہ کو کلکتہ سے بمبئی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ وہ روز صبح کو پولیس کی نگرانی میں اسٹوڈیو آتے اور اپنا کام ختم کر کے جیل واپس چلے جاتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک مذکورہ فلم میں ان کا کام مکمل نہیں ہو گیا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بنگال کے اسٹیج اداکار نہ صرف فن کار بلکہ سیاسی کارکن بھی تھے اور اسٹیج ایکٹر بھی۔

میں جب اسٹار تھیٹر پہنچا تو وہاں بنگلہ کے عظیم شاعر مائیکل مدھو سودن دت کی زندگی پر مبنی ڈراما اسٹیج ہو رہا تھا۔ مائیکل مدھو سودن دت انیسویں صدی کے عظیم بنگالی شاعر تھے، جنہوں نے برصغیر میں پہلی بار نظم آزاد کی ابتدا کی اور ایک طرز کی اپنی طویل نظم "میگھ ناتھ بودھ کادیہ" لکھ کر اس دور کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانش وروں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ان کی زندگی شروع سے آخر تک بڑی ڈرامائی تھی۔ انہوں نے فرنگیوں کی آمد کے بعد ہندو دھرم سے بغاوت کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی اور اس طرح سناتن دھرم کے ماننے والوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بنگلہ کے مشہور مصنف "بن پھول" نے ان کی زندگی پر بہت ہی خوب صورت ڈراما لکھا تھا اور اس کا مرکزی کردار اتپل دتہ ادا کر رہے تھے۔ میں ڈراما دیکھتے دیکھتے سترھویں اور اٹھارویں صدی کے کلکتے میں پہنچ گیا۔

کلکتہ میں تھیٹر (یعنی انگلش تھیٹر) کی ابتدا یوں تو اٹھارویں صدی سے ہوتی ہے، لیکن بنگالی

تھیٹر کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر اور اردو تھیٹر کا آغاز انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا۔ دوسری بہت ساری چیزوں کی طرح ہندوستان میں جدید اسٹیج بھی فرنگیوں کا لایا ہوا ہے۔ انگریزوں نے کلکتہ میں پہلا تھیٹر 1756 ء میں قائم کیا، یعنی جنگ پلاسی سے ایک سال قبل۔ اس سے قبل اسٹیج ڈرامے یا تھیٹر کا کوئی وجود نہ تھا۔ انگریزوں نے جب بنگال میں اپنی بستیاں آباد کرنے کے بعد اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تو انہیں لندن کی طرح جدید تھیٹر قائم کرنے کا خیال آیا۔ اس سے قبل ان کے پاس تفریح طبع کا اور کوئی آسان ذریعہ نہیں تھا۔ تھیٹر کے قیام سے قبل صرف بال ڈانس ہی ایک ایسا سماجی اجتماع تھا، جہاں انگریز مرد اور عورتیں موسیقی کی لے پر رقص کیا کرتے تھے، لیکن اس قسم کی محفلیں بہت محدود ہوتی تھیں۔ ایسی محفلوں کا انعقاد صرف امراء ہی کر سکتے تھے اور ان محفلوں میں مخصوص لوگوں کو ہی مدعو کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی محفلوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عام انگریز ملازمین کا داخلہ ممکن نہ تھا، چنانچہ جب انگریزوں نے محسوس کیا کہ انہیں یہاں مستقل طور پر رہنا ہے تو انہوں نے یہاں تھیٹر قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن ابتدا میں انہیں ڈراما اسٹیج کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں، کیونکہ یہاں کوئی تجربہ کار اسٹیج ایکٹر نہیں تھا۔ ایک دو انگریز ایکٹروں کا انتظام ہوتا بھی تھا تو کوئی ایکٹرس دستیاب نہ تھی۔ ایسے عالم میں فرانسیس رینڈ نامی ایک انگریز، ایسٹ انڈیا کمپنی میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے کلکتہ پہنچا۔ یہ شخص پیدائشی اداکار تھا، چنانچہ اس نے چند ماہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس دور کے کلکتہ کے پہلے "پبلک تھیٹر" سے وابستہ ہو گیا۔ اس وقت تک پیشہ ور تھیٹر قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ تھیٹر فرنگیوں کے چندے سے چلتا تھا۔ فرانسیس رینڈ کی کوششوں سے نہ صرف نئے اداکار مہیا ہو گئے بلکہ اس نے کئی انگریز خواتین کو زنانہ کردار ادا کرنے پر آمادہ کر لیا اور کلکتہ کے اسٹیج پر پہلی بار "ہیملیٹ" پیش کیا اور اس کے بعد "کنگ لیر"۔ "اوتھیلو" اور پھر "رچرڈ دی تھرڈ"۔ اس طرح کلکتہ میں باقاعدہ ڈراما اسٹیج ہونے لگا۔

ابتدا میں امیچر تھیٹر ہی عام تھا جو مختلف کلبوں کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا۔ پھر 1813 ء میں "چورنگی تھیٹر" قائم ہوا۔ اس کے بعد "دی کلکتہ تھیٹر"۔ اس کے بعد "سان سوچی تھیٹر" وغیرہ متعدد تھیٹر وجود میں آئے۔ کلکتہ میں پیشہ ور تھیٹرز کے قیام کے بعد لندن سے بہت سے پیشہ ور اداکاروں، اداکاراؤں، اسٹیج ڈیزائنروں اور پروڈیوسروں نے آنا شروع کر دیا اور کلکتہ میں نہایت تیزی سے تھیٹر مقبول ہونے لگا۔ جیسا کہ دستور ہے کہ۔ رعایا ہمیشہ بادشاہ وقت کی وضع کردہ روایتوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہندوستان کے ابھرتے ہوئے طبقہ اشرافیہ نے جب دیکھا کہ انگریزوں میں

تھیٹریکل آرٹ مقبول ہو رہا ہے تو ان میں بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انہوں نے بھی باقاعدگی سے تھیٹر جانا شروع کر دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ ان کی تقلید میں پرسنا ناتھ ٹیگور نے 1831 ء میں "ہندو تھیٹر" قائم کیا اور شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" کا ایک حصہ بنگلہ میں ترجمہ کر کے پیش کیا۔ اس طرح انگریزوں کے ساتھ بنگالیوں میں بھی تھیٹر سے دلچسپی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی شوقیہ تھیٹر قائم ہو گئے۔ کلکتہ میں پہلا بنگلہ تھیٹر لیبیڈیف (لیبے ڈیف) نامی ایک روسی نے 1795 ء میں موجودہ کنینگ اسٹریٹ اور عذرا اسٹریٹ (مرغی ہٹہ) کے نکڑ پر قائم کرنے کی کوشش کی اور پنڈت گولک ناتھ داس کی مدد سے ایک دو بار ڈراما اسٹیج بھی کیا، لیکن اس کی کوشش ناکام ہو گئی۔ بنگالی اشرافیہ میں بنگلہ اسٹیج کو جڑ پکڑنے میں قدرے دقت لگا۔ ابتدا میں بنگلہ تھیٹروں میں شیکسپیئر کے ڈرامے ہی ترجمہ کر کے پیش کئے جاتے رہے۔

ابتدا میں یہ سارے تھیٹرز مغربی کلکتہ کے چورنگی، پارک اسٹریٹ، چائنا بازار کے علاقے میں قائم ہوئے کیوں کہ یہی وہ علاقے ہیں، جہاں انگریز آباد تھے، البتہ شوقیہ بنگلہ تھیٹرز شمالی کلکتہ، یعنی شام بازار اور سوا بازار کے علاقے میں قائم ہوئے، کیوں کہ اس علاقے میں زیادہ تر انگریزی تعلیم یافتہ متمول بنگالی زمیندار آباد تھے۔ اس طرح جنوبی کلکتہ کا کلچر خالصتاً یوروپین کلچر اور شمالی کلکتہ کا کلچر خالص بنگالی اشرافیہ کا کلچر کہلایا۔ اس دور سے لے کر آج تک سارے بنگالی تھیٹرز شمالی کلکتہ خصوصاً شام بازار کے علاقے میں واقع ہیں۔

اس دور کے بنگالیوں میں تھیٹر کس قدر مقبول ہوا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس دور کے کالجوں میں انگریزی تعلیم یافتہ بنگالی نوجوانوں نے باہم چندہ جمع کر کے متعدد تھیٹریکل کلب قائم کر لیے تھے اور شیکسپیر کے ڈرامے اسٹیج کرنے شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے 1851 ء میں "ڈیوڈ ہیئر اکیڈیمی" قائم کی اور 1853 ء میں شیکسپیئر کا ڈراما "مرچنٹ آف وینس" اسٹیج کیا۔ اسے دیکھ کر اورینٹل سیمینری کے طلبا نے "اوتھیلو" اسٹیج کیا۔ اسی دور میں مدرسہ عالیہ کے شعبہ انگریزی کے سربراہ نے اداکاری کی باقاعدہ تربیت دینی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز اداکاروں اور ہدایت کاروں نے اس دودر کے امیر بنگالی طالب علموں کو (جنہیں اداکاری کا شوق تھا) خطیر معاوضہ لے کر اداکاری کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے بنگالیوں میں بہت سارے اداکار پیدا ہو گئے۔ ابتدا میں شیکسپیئر کے ڈراموں کو بنگلہ میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا۔ پھر سنسکرت کے مشہور ڈراموں مثلاً شکنتلا وغیرہ بنگلہ میں ترجمہ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر 1857 ء میں شملہ بازار کے ساتو بابو کے گھر پر

باقاعدہ بنگلہ تھیٹر قائم ہو گیا۔ اس کے بعد اسی سال چڑک ڈانگہ کے رام جئیٹھ بیساک کے گھر پر پہلا بنگلہ معاشرتی ڈراما اسٹیج ہوا۔ اس کے بعد 1860ء میں ہری ٹولہ کے رام مادھب ہلدار اور جوگندر ناتھ نے مل کر "دی کلکتہ پبلک تھیٹر" کے نام سے باقاعدہ تھیٹر قائم کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ اس کے بعد 1872ء میں چیت پور کے مدھو سودن سانیال کے گھر میں "کلکتہ نیشنل تھیٹریکل سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی جو کامیاب رہی۔ جہاں بنگلہ کا مشہور ڈراما "نیل درپن" اسٹیج کیا گیا۔

کلکتہ کے بنگالیوں میں اسٹیج ڈرامے کی مقبولیت کی اصل وجہ قدیم ہندوستان میں ڈرامے کی روایت ہے۔ قدیم یونان کے بعد ہندوستان ہی دنیا کا وہ ملک ہے جہاں ڈرامے کی روایت بہت قدیم اور مستحکم ہے اور سنسکرت میں دنیا کے بہترین اور مشہور ڈرامے لکھے گئے ہیں اور پھر سوانگ، رام لیلا، نوٹنکی اور جاترا وغیرہ ڈرامے کے وہ قدیم اور کھردرے عوامی روپ ہیں جو صدیوں سے دیہی ہندوستان میں رائج رہ چکے ہیں، چنانچہ انگریزوں نے جب جدید اسٹیج کا تصور پیش کیا تو انہیں ناٹک کے جدید ترین روپ کو اختیار کرنے میں دیر نہیں لگی اور تھیٹر ان کی تہذیبی روایت کا لازمی حصہ بن گیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو میں جدید اسٹیج انیسویں صدی کے وسط میں پارسی تھیٹر کے توسط سے کلکتہ اور بمبئی میں معرض وجود میں آیا، جسے آغا حشر کاشمیری جیسے نابغہ روزگار ڈراما نگار نے چار چاند لگا دیا، لیکن تھیٹر کبھی مسلمانوں اور اردو داں طبقے کی تہذیبی روایت کا حصہ نہ بن سکا۔ اس لیے کہ ساسانی تہذیب یعنی عربوں، ترکوں اور ایرانیوں میں ڈرامے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ جب کلکتہ کے کورنتھین اور الفریڈ تھیٹروں میں اردو ڈرامے پیش کیے گئے تو ابتدا میں بہت مقبول ہوئے لیکن جوں جوں فلم انڈسٹری ترقی کرتی گئی لوگوں میں تھیٹرز سے دلچسپی کم ہوتی گئی اور بالآخر ایک دن کمرشل تھیٹر نے دم توڑ دیا۔ اس کے برعکس بنگلہ تھیٹر پر فلموں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

کلکتے کے قیام کے دوران میں ایک دن چپکے سے داناپور ایکسپریس سے پٹنہ روانہ ہو گیا۔ دستور کے مطابق مجھے اپنے دوست احمد یوسف کو اطلاع دینی چاہیئے تھی۔ انہوں نے کئی بار پٹنہ آنے کی دعوت دی تھی اور میں ان کے ہاں ہی قیام کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا لیکن میں اچانک وارد ہو کر انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اطلاع دیئے بغیر خاموشی سے روانہ ہو گیا۔

پٹنہ میرے لیے اجنبی شہر تھا۔ کلکتہ سے اتنے قریب ہونے کے باوجود میں کبھی وہاں نہیں گیا۔ حالانکہ وہاں میرے دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ وہاب اشرفی ایک عرصے تک ماہنامہ "صنم" کے مدیر رہے۔ ش مظفر پوری کا بھی پٹنے میں ہی مستقل قیام تھا۔ لیکن بوجوہ اس شہر کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس دفعہ جب ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوا تو میں نے خاص طور پر پٹنے کا ویزا حاصل کیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اول، احمد یوسف کی محبت اور پرکشش شخصیت اور دوم، خدا بخش لائبریری دیکھنے کی خواہش۔ کلکتہ میں رہتے ہوئے احمد یوسف سے میرا تعارف نہیں تھا۔ اگرچہ میں ان کے افسانے پڑھتا رہا۔ ان سے تعارف کراچی میں ہوا اور وہ بھی علی حیدر ملک کے ذریعے۔ جو ان کے پرانے دوست تھے۔ کراچی میں تعارف ہونے کے بعد وہ اتنے قریب آ گئے کہ محسوس ہی نہ ہوا کہ ان سے متعارف ہوئے چند روز ہوئے ہیں۔ احمد یوسف کا تقاضا تھا کہ میں جب بھی ہندوستان جاؤں تو پٹنہ ضرور آؤں، چنانچہ میں نے پٹنہ جانے کا تہیہ کر لیا۔

خدا بخش لائبریری کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ چکا تھا اور اس کی اتنی تعریفیں سن چکا تھا کہ پٹنہ جا کر خدا بخش لائبریری کی زیارت کرنا میں اپنا اولین فرض تصور کرتا تھا۔ میں نے یہاں لفظ "زیارت" اس لیے استعمال کیا ہے کہ لوگ اولیائے کرام کی درگاہوں اور مزاروں کی زیارت کرتے ہیں۔ میں کتب

خانے کو درگاہ کا درجہ دیتا ہوں (اور وہ بھی خدا بخش لائبریری جیسے عظیم الشان کتب خانے) کو میں درگاہ سے کم تصور نہیں کرتا، چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ اس بار پٹنہ جاؤں گا تو احمد یوسف کے گھر پر حاضر ہونے کے فوراً بعد خدا بخش لائبریری میں ضرور حاضری دوں گا۔

میں شام چھ بجے ہوڑہ سے داناپور ایکسپریس میں روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ بہت بھیڑ ہوگی۔ لہٰذا میں نے برتھ ریزرو کروالیا لیکن خلاف توقع مسافروں کا رش نظر نہیں آیا۔ داناپور ایکسپریس کی خوبی یہ ہے کہ یہ پٹنہ سٹی پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس پر صرف وہ لوگ سوار ہوتے ہیں، جنہیں صرف پٹنہ یا داناپور تک جانا ہوتا ہے۔ میری ٹرین صبح دس بجے پٹنہ اسٹیشن پہنچی۔ میں اسٹیشن سے رکشا پر گاندھی پارک پہنچا۔ مجھے بتادیا گیا تھا کہ صدر گلی تک پہنچنے کے لیے مجھے پہلے سائیکل رکشا پر گاندھی پارک پہنچنا ہوگا اور پھر وہاں سے آٹو رکشا لے کر (جسے وہاں کی اصطلاح میں ٹیمپو کہا جاتا ہے) صدر گلی جانا ہوگا۔ پٹنے میں مجھے کہیں ٹیکسی نظر نہیں آئی (اگر ہوتی تو سہ روزہ قیام کے دوران کہیں نہ کہیں نظر ضرور آتی) میں نے گاندھی پارک پہنچ کر ٹیمپو لیا اور صدر گلی روانہ ہو گیا۔ قدیم شہر پٹنے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک لمبی سی سڑک کی دونوں جانب واقع ہے۔ سڑک کا نام بدلتا رہتا ہے، لیکن سڑک ختم نہیں ہوتی۔ ایک کے بعد ایک محلہ آتا اور گزر جاتا ہے۔ جسے جہاں جانا ہوتا ہے۔ وہ وہاں اتر جاتا ہے۔ سواریوں میں اسٹیٹ بس اور آٹو رکشاس نظر آئیں۔ اسٹیٹ بسیں نہایت بوسیدہ اور ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں اور وقت مقررہ پر ٹرمینس سے روانہ ہوتی ہیں اور ہر دس پندرہ قدم کے بعد رک جاتی ہیں اور سواریوں کو لیتی ہیں، البتہ ٹیمپو تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے، لیکن اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ وہ صرف پوائنٹ سے پوائنٹ تک چلتی ہے۔ مسافر کی خواہش کے مطابق نہیں چلتی۔ جس کی وجہ سے اجنبیوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا دشوار ہوتا ہے۔

رکشا والے نے ٹھیک صدر گلی کے چوراہے پر ٹیمپو روک دیا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور ٹیمپو کا کرایہ ادا کر کے اتر گیا۔ احمد یوسف کا گھر تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ وہ پٹنہ کے پرانے باشندے ہیں اور ادیب ہونے کے باعث بہت معروف ہیں۔ احمد یوسف کی پٹنہ میں عین بازار میں بہت بڑی سی حویلی ہے۔ جو کم از کم ہزار گز اراضی سے زیادہ پر ایستادہ ہے۔ قدیم طرز کی اتنی بڑی حویلی کراچی یا کلکتے میں نظر نہیں آتی۔ کراچی جدید شہر ہے اس لیے یہاں حویلی کا تصور مفقود ہے، البتہ پٹنہ (خصوصاً قدیم پٹنہ) ابھی تک بہت ماڈرن نہیں ہوا ہے۔ اس لیے وہاں ایسی حویلیاں آج بھی مل جاتی ہیں۔

مجھے فوراً مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ بھابی سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام۔ بھابی سال دو سال میں ایک بار کراچی کا دورہ ضرور کرتی ہیں اور کراچی آتی ہیں تو تین اور چھ مہینے سے پہلے نہیں لوٹتیں۔ یہاں ان کے سارے عزیز و اقارب موجود ہیں۔ احمد یوسف دو سال میں ایک بار کراچی ضرور آتے ہیں۔ ان کی آمد سے شہر کی ادبی دنیا میں رونق آجاتی ہے۔

احمد یوسف کی سب سے بڑی خوبی ان کی کم سخنی اور انکساری ہے۔ وہ ہر شخص سے بڑی محبت اور خلوص سے ملتے ہیں اور ان کی شخصیت میں بڑی کشش ہے۔ ان سے جو شخص بھی ایک بار ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ احمد یوسف کا شمار 60 ء کے عشرے میں ابھرنے والے ہندوستان کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ یوں تو وہ حصول آزادی کے بعد سے افسانے لکھ رہے ہیں، لیکن انہوں نے درمیان میں دس سال تک افسانہ نگاری قطعاً ترک کر دی تھی جس کی وجہ سے ان کی ادبی زندگی میں دس سال کا خلاء پیدا ہو گیا۔ جس سے انہیں بہت نقصان پہنچا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ قارئین کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگر کوئی مصنف لکھتے لکھتے منظر سے اچانک غائب ہو جائے تو اسے قارئین بہت جلد فراموش کر دیتے ہیں۔ اردو کے کتنے اچھے افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ جو اپنے دور میں بہت مشہور اور مقبول تھے۔ پھر انہوں نے لکھنا ترک کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ ادبی منظر نامے اور قارئین کے حافظے سے ہمیشہ کے لیے محو ہو گئے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ احمد یوسف کا یہ دور صرف دس سال پر محیط رہا۔ ابتداء میں وہ بیانیہ اور وضاحتی طرز کے افسانے لکھتے تھے۔ انہوں نے دس سال کے وقفے کے بعد جب دوبارہ لکھنا شروع کیا تو علامتی طرز اظہار اختیار کر لیا۔ دراصل 1960 ء کے عشرے میں ہندوستان اور پاکستان میں جدیدیت کی جو لہر اٹھی۔ اس نے افسانے کے موضوعات کے ساتھ ساتھ طرز اظہار کو بھی بدل دیا اور اردو افسانے میں ایک نیا اسلوب متعارف ہوا۔ یہ اسلوب علامتی افسانے کا تھا۔

احمد یوسف نے علامتی طرز اظہار کو نہایت سنجیدگی سے اختیار کیا۔ اس لیے انہوں نے علامتی افسانہ نگاروں میں بہت جلد اپنا مقام بنا لیا اور سنجیدہ قارئین اور ناقدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ ان کے افسانوں کے اب تک تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور وہ اس وقت اردو ناول نگاری پر ڈاکٹریٹ

کا مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں۔

احمد یوسف نے میرے پٹنہ پہنچتے ہی آناً فاناً اپنے دوستوں کو میری آمد کی اطلاع دے دی چنانچہ ظہیر صدیقی۔ علی امام اور مصطفیٰ کریم مجھ سے ملنے کے لیے احمد یوسف کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ ظہیر صدیقی کے نام سے میں پہلے ہی واقف تھا، لیکن ان سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ علی حیدر ملک کے بڑے گہرے دوست تھے اور حیدر ملک عموماً ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اس لیے میں تعارف سے قبل ہی ان کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر اور ناقد ہیں اور ان کا شمار بہار کے چند بہت اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے اور ان کا کلام ہندوستان کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ علی امام بھی بہار کے نئے افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مصطفیٰ کریم بہار اردو اکیڈیمی سے وابستہ ہیں اور کئی بار پاکستان آ چکے ہیں اور ان کے ذریعے بہار میں اردو زبان و ادب کی سرگرمیوں کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ وہ اگرچہ ادیب، و شاعر نہیں ہیں، لیکن ادب کا بہت ہی شستہ ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے دوسرے دن دوپہر میں بہار اردو اکیڈیمی میں آنے اور دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی جسے میں نے اور احمد یوسف نے قبول کر لیا۔

شام ہوتے ہی میں احمد یوسف کے ساتھ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ممتاز احمد سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ پروفیسر ممتاز احمد، کلیم الدین احمد کے نہ صرف لائق اور چہیتے شاگرد تھے، بلکہ یونیورسٹی میں ان کے صحیح جانشین بھی تھے۔ کلیم الدین احمد کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ علی حیدر ملک نے ہدایت کی تھی کہ پٹنہ میں ان سے ضرور ملوں۔ اس نے ان کے نام ایک خط بھی دیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علی حیدر ملک، پروفیسر ممتاز احمد اور اختر اورینوی کے عزیز شاگرد رہ چکے تھے اور وہ ان کا بڑی محبت اور احترام کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ جس کے باعث میرے دل میں بھی ان سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ کلیم الدین احمد کا مشہور جریدہ "معیار" ان دنوں پروفیسر ممتاز احمد کی زیر نگرانی نکل رہا تھا اور وہ "معیار" کا کلیم الدین نمبر مرتب کرنے میں مصروف تھے۔

میں جب احمد یوسف کے ساتھ ان کے گھر پہنچا تو ان کا مکان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس لیے کہ مین روڈ پر واقع ان کا گھر نصف پختہ اور نیم کھپریل کا بنا ہوا تھا (جیسا عموماً کلکتہ اور بہار کے گھر ہوتے ہیں) مکان کوئی بہت بڑا نہیں تھا۔ بہت ہوا تو ایک سو بیس گز کا ہو گا۔ انہوں نے اپنی خواب گاہ میں ہم دونوں کو بٹھایا۔ جو ان کے پڑھنے کا کمرہ بھی تھا اور سونے کا بھی۔ احمد یوسف نے ان سے میرا تفصیلی تعارف کرایا۔ پھر کراچی کے ادیبوں اور ادبی سرگرمیوں اور چہیتے شاگرد علی حیدر ملک کا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے انہیں ان کے نام علی حیدر ملک کا خط پیش کیا اور ساتھ ہی اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جدید اردو افسانہ" کا ایک نسخہ بھی۔ انہوں نے کلیم الدین احمد کی ادارت میں شائع ہونے والے تحقیقی مجلے "معیار" کے کئی پرانے شمارے دیئے۔ اس کے ساتھ کلیم صاحب کی خود نوشت سوانح عمری کی تیسری

جلد بھی عنایت کی اور دوسرے روز پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں آنے اور طلبا سے پاکستان میں جدید اردو افسانے کے موضوع پر خطاب کرنے کی دعوت دی۔

میں بڑا گھبرایا۔ اس لیے کہ میری زبان میں لکنت ہونے کے باعث میں گفتگو کے دوران اکثر رک جایا کرتا تھا۔ اس لیے میں نے پریشانی کے عالم میں احمد یوسف کی جانب دیکھا۔ انہوں نے میری مدد کرنے اور میری جانب سے معذرت کرنے کے بجائے فوراً ہامی بھر لی اور وقت اور دن دریافت کر لیا۔ میں نے سوچا کہ مارے گئے! اب فرار کی کوئی راہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں وقت مقررہ پر حاضر ہو کر جو ذہن میں آئے، بیان کر دوں۔

پروفیسر ممتاز احمد سے رخصت ہونے کے بعد ہم دونوں مشہور ناقد عبدالمغنی سے ملنے کے لیے چل پڑے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

ڈاکٹر عبدالمغنی بھی اسی راستے پر رہتے تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرتے ہی ان کا گھر آگیا۔ وہ اپنے کمرے میں استراحت فرما رہے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں کو اپنی خواب گاہ میں بلا لیا۔ جو ان کے آرام کرنے اور پڑھنے لکھنے کا کمرہ تھا۔ وہ چارپائی پر نیم دراز تھے۔ قریب ہی ان کی اور چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ان کی چارپائی کے قریب دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، جن پر ہمیں بٹھایا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ان کا گھر بھی پروفیسر ممتاز احمد سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ان دونوں کا گھر دیکھ کر مجھے پاکستان کے پروفیسروں، خصوصاً کراچی یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کے گھر یاد آگئے۔ جن کے آراستہ اور پیراستہ ڈرائنگ اور بیڈ رومز کو دیکھ کر پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی امیر کبیر شخص کے محل سرا میں داخل ہو گئے ہیں۔ گھروں کی سجاوٹ صرف اساتذہ تک محدود نہیں ہے کراچی کے زیادہ تر متوسط طبقہ کے گھر تقریباً ایسے ہی ہیں۔ کراچی میں متوسط طبقے کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں ڈرائنگ روم نہ ہو (خواہ یہ ڈرائنگ روم رات کو بیڈ روم میں تبدیل کیوں نہ ہو جاتا ہو) اس کے برعکس مجھے ہندوستان کے سفر کے دوران متوسط طبقہ کے گھرانوں میں بہت کم ڈرائنگ روم نظر آیا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی دور حاضر کے چند بہت اچھے ناقدوں اور جید عالموں میں سے ہیں۔ ان کا مشرقی اور مغربی ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق ہے۔ انہوں نے انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی کی بھی اعلیٰ ترین اسناد لے رکھی ہیں۔ اس لئے ان کی نظر کے سامنے مشرق و مغرب کا جدید ترین ادب رہتا ہے اور وہ ان زبانوں کے عصری رجحانات سے کماحقہ واقف ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ادب میں انہیں اگر کوئی غلط بات نظر آتی ہے تو وہ فوراً اس کا محاسبہ کرتے ہیں وہ علامہ اقبال کے

نظریئے اور فن کے بڑے قائل ہیں، چنانچہ ڈاکٹر کلیم الدین احمد نے جب اقبال کو عالمی سطح کا شاعر تسلیم کرنے سے انکار کیا تو انہوں نے نہ صرف اس کے جواب میں ایک پوری کتاب لکھ ڈالی، بلکہ اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کے بارے میں نصف درجن کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔ جماعت اسلامی کے زبردست حامی ہونے کے باوجود وہ پاکستان کے اسلام پسند ادیبوں کی طرح نہ تنگ نظر ہیں اور نہ دقیانوسی، وہ قرۃ العین حیدر کے بڑے معتقد ہیں اور وہ عینی کے بارے میں ایک مکمل کتاب لکھ چکے ہیں۔ وہ صرف درس و تدریس اور قلم کے دھنی نہیں، اردو کے نڈر اور جری مجاہد بھی ہیں اور قطعی عملی انسان ہیں۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کروانے میں جن دوسرے اکابرین کا حصہ ہے۔ وہاں ڈاکٹر عبدالمغنی کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے وہ اس وقت بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے رہنما اور صدر ہیں۔

میری خوش قسمتی تھی کہ وہ مجھ سے اور میری تحریروں سے اچھی طرح واقف تھے میں ان کے جریدے "مریخ" کا مستقل قلمی معاون تھا۔ ان سے میری باقاعدہ خط و کتابت تھی اور وہ میری پہلی کتاب "جدید اردو افسانہ کا مطالعہ کر چکے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں ان سے پہلی بار مل رہا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان سے مل کر اجنبیت کا قطعی احساس نہ ہوا۔ جیسے ہم عرصے سے شناسا ہوں، پہلی نظر میں وہ کسی مسجد کے پیش امام نظر آئے۔ کیوں کہ بڑی بڑی داڑھی اور اس پر دبیز شیشے کی عینک نے بڑا رعب طاری کیا۔ لیکن ان سے ملنے کے بعد ان کی عمر کے بارے میں مغالطہ ختم ہو گیا اور میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ مغنی صاحب عمر میں مجھ سے بڑے نہیں تو چھوٹے بھی نہیں ہیں یعنی ہم دونوں تقریباً ہم عمر ہیں"

تعارف اور مزاج پرسی کے بعد میں نے انہیں اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "رد عمل" کی فوٹو کاپی پیش کرتے ہوئے کہا "میری خواہش ہے کہ آپ اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھ دیں تاکہ میں اسے اپنی کتاب میں فلیپ کے طور پر شامل کر سکوں"

انہوں نے اس پر فوراً آمادگی ظاہر کی۔ انہوں نے چائے اور ناشتے کے بعد کہا کہ کل انجمن ترقی اردو (بہار) کے دفتر میں امیر عارفی کے افسانوں کے مجموعہ کی تقریب اجرا ہے جس میں میں ضرور شرکت کر دوں۔ اس طرح شہر کے دوسرے ادیبوں سے بھی میری ملاقات ہو جائے گی انہوں نے احمد یوسف سے کہا کہ وہ مجھے دوسرے روز شام کے وقت انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ضرور لے کر پہنچ جائیں۔

پٹنہ یونیورسٹی میں

دوسرے روز میں صبح دس بجے احمد یوسف کے ساتھ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پہنچا تو پروفیسر مختار احمد اور دوسرے اساتذہ کو منتظر پایا۔ اس روز یونیورسٹی میں اگرچہ تعطیل تھی لیکن پروفیسر ممتاز احمد نے طلبار کو کلاس میں جمع کر رکھا تھا۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی کر رہے تھے۔ احمد یوسف مہمان خصوصی تھے۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ممتاز احمد نے طلبار اور اساتذہ سے مجھ ناچیز کا تعارف کراتے ہوئے میرے تنقیدی مضامین کے مجموعہ "جدید اردو افسانہ" کا خاص طور پر ذکر کیا۔ صدر جلسہ کی درخواست پر میں نے اپنی کتاب "جدید اردو افسانہ" سے پاکستان میں اردو افسانہ نگاری کے بارے میں جستہ جستہ اقتباسات پڑھ کر سنایا۔ احمد یوسف نے میری تنقید نگاری اور افسانہ نویسی کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد سوال و جواب کا دور شروع ہوا۔ طلبار نے پاکستان میں افسانہ نگاری، خصوصاً جدید اور علامتی افسانے اور افسانہ نگاروں کے بارے میں سوالات کئے۔ جن کا میں نے تفصیل سے جواب دیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی نے اس موقع پر راقم الحروف کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر اسلم آزاد نے طلبار و طالبات اور اساتذہ کی جانب سے کلمہ تشکر ادا کیا۔ اس نشست میں جن اساتذہ نے شرکت کی۔ ان میں ڈاکٹر حمیرا خاتون، اسرائیل رضا، ڈاکٹر اعظم الحق دادودی، ایم اے پروفیسر برکات، پروفیسر شکیب ایاز اور پروفیسر تنویر شہاب وغیرہ شامل تھے۔

ڈاکٹر خورشیدی کے گھر پر

ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی نے نشست کے اختتام پر دوسرے دن شام کو اپنی رہائش گاہ پر ناچیز کو چائے پر مدعو کیا۔ جہاں یونیورسٹی اور شہر کے دوسرے کالجوں کے اساتذہ اور ادبا بھی شریک ہوئے۔ پٹنہ کے ادیبوں اور دانشوروں کے اس اجتماع میں یوں تو بہت سی علمی و ادبی باتیں ہوئیں لیکن زیادہ تر صوبائی سیاست اور پاکستان سے آنے والے ادیبوں خصوصاً شاعرات کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ پروفیسر خورشیدی نے بتایا کہ عام انتخابات میں شرفا بہت کم تعداد میں ووٹ ڈالتے ہیں۔ اس لئے کہ پولنگ اسٹیشنوں میں بہت زیادہ غنڈہ گردی ہوتی ہے اور گروہی تصادم اور اس کے نتیجے میں تشدد عام بات ہے۔ اس لئے امن پسند شہری ووٹ ڈالنے کے لئے بہت کم جاتے ہیں ان کے ووٹ غنڈہ عناصر ان سے قبل ڈال دیتے ہیں اور جو جماعت جس قدر جعلی ووٹ ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہی کامیاب ہوتی ہے۔

شرکائے محفل نے پاکستان سے آئی ہوئی شاعرات کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ میرے لئے گہرے صدمے اور ندامت کا باعث ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "صاحب، ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ پاکستان میں خالص اسلامی نظام قائم ہو چکا ہے۔ عورتیں سخت پردے میں رہتی ہیں اور جو عورتیں برقعہ کے بغیر باہر نکلتی ہیں ان کی چوٹیاں کاٹ دی جاتی ہیں، لیکن ہمیں دور درشن میں پاکستان کے ادبا کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب کی جو فلم رپورٹ دکھائی گئی وہ تو اس کے بالکل برعکس تھی، مثلاً آپ کے ہاں کی ایک مشہور شاعرہ بغیر آستین کے بلاؤز میں پارٹی میں اس طرح شراب نوش فرما رہی تھیں کہ کوئی مرد بھی کیا نوش کرے گا۔ ہمیں تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم جو کچھ ٹیلیویژن پر دیکھ رہے ہیں، وہ حقیقت ہے۔"

میں بھلا اس کا کیا جواب دیتا۔ میں نے کہا "آپ نے ٹی وی پر جن کو دیکھا ہے وہ پاکستانی

خواتین کی اکثریت کی نمائندہ نہیں ہیں۔ ہماری خواتین تو بڑی پردہ نشین اور قدامت پسند ہیں۔

ڈاکٹر کلیم عاجز کو جب میری آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھی مجھ سے ملنے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ وہ بڑی محبت سے ملے اور بہت دیر تک پاکستان کے ادبا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کلیم عاجز پاکستان میں، خصوصاً کراچی کے اردو دان طبقے میں بہت مقبول ہیں اور وہ جب بھی کراچی آتے ہیں ان کی بڑی پذیرائی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔

دوسرے روز انجمن ترقی اردو بہار کے دفتر میں امیرالدین عارفی کے افسانوں کے مجموعے کی تقریب اجرا منعقد ہوئی جلسہ شروع ہونے سے پہلے احمد یوسف مجھے انجمن ترقی اردو کی کانفرنس روم میں لے گئے۔ جہاں ڈاکٹر عبدالمغنی، بہار کے سابق وزیر اعلیٰ جگناتھ مشرا اور دوسرے عمائدین شہر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر سے میں ناواقف تھا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے بڑھ کر میرا استقبال کیا اور بہ آواز بلند شری جگناتھ مشرا اور دوسرے لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور اعلان کیا کہ آج کی نشست کے مہمان خصوصی پاکستان سے آئے ہوئے مشہور ادیب اور نقاد شہزاد منظر ہیں جو کل ہی پٹنہ تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے اسی کے ساتھ میرے مضامین کے مجموعہ "رد عمل" کے مسودے کے ساتھ ایک فل اسکیپ پر مشتمل اپنا وہ مضمون بھی میرے حوالے کر دیا، جسے انہوں نے رات بھر کتاب کے مسودے کے مطالعے کے بعد لکھا تھا۔

ڈاکٹر مغنی کے اعلان کے ساتھ ہی ایک معمر بزرگ اپنی نشست سے اٹھ کر نہایت تیزی سے میری جانب بڑھے اور مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا ارے شہزاد صاحب، آپ کب تشریف لائے؟"

میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور بہ وقت انہیں پہچانا۔ یہ رضا علی نقوی واہی عظیم آبادی تھے۔ جو اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ پہلی نظر میں انہیں پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ میں بھی ان سے والہانہ انداز میں ملا۔ وہ میری اچانک پٹنہ آمد پر حیرت کا اظہار کرتے رہے۔ میری جائے رہائش کے بارے میں دریافت کیا اور دوسرے روز احمد یوسف کے گھر پر آنے اور مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کا وعدہ کیا۔

واہی صاحب سے میرے بڑے پرانے مراسم تھے۔ وہ جب 62ء میں کلکتہ میں آل انڈیا اردو کانفرنس کے سلسلے میں آئے تو میں ہی ان کا گائیڈ تھا۔ یہ کانفرنس پارک سرکس میدان میں ہوئی تھی۔ وہ جب تک کلکتہ میں رہے۔ میں ان کے ساتھ رہا، پھر میں جب ہفت روزہ "آثار" کے ادارتی

عملے میں شامل ہو گیا تو اس ہفت روزے میں میں نے نہ صرف ان کی نظمیں شائع کیں، بلکہ ان سے مضامین اور خاکے بھی لکھوائے۔ وہ ایک زبردست اور قادر الکلام شاعر ہیں وہ ابتدا میں صرف نظمیں کہتے تھے۔ لیکن میں نے آثار کی ادارت کے دوران ان سے فرمائش کر کے مضامین بھی لکھوائے۔ خصوصاً اختر اورینوی کی حیات اور کارناموں کے بارے میں مضامین اور خاکے۔ واہی صاحب، اختر اورینوی کے زمانہ طالب علمی کے نہایت گہرے دوست تھے۔ اس لئے وہ اختر اورینوی کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں جانتے تھے، جو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ تھیں۔ "آثار" کے بند ہو جانے اور میرے مشرقی پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد ان سے قطعی رابطہ نہیں رہا۔ اس دوران دنیا ہی بدل گئی، ہم دونوں تقریباً اکیس یا بائیس سال کے بعد ملے اور مل کر اس قدر خوش ہوئے کہ جس کا الفاظ کے ذریعے اظہار ممکن نہیں ہے۔ افسوس، عین وقت پر جلسے کے آغاز کا اعلان ہو گیا اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ بوجوہ مجھ سے ملنے کے لئے نہ آسکے۔

انجمن ترقی اردو کے دفتر میں منعقدہ جلسہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے سیشن میں بہار کے سابق وزیر اعلیٰ جگناتھ مشرا صدر اور ناچیز مہمان خصوصی تھا۔ اس سیشن میں زیادہ تر تقاریر بہار میں اردو زبان کے مسائل، خصوصاً اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے متعلق ہوئیں۔ دوسرے سیشن میں امیر الدین عارفی کی کتاب کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ پہلا سیشن چونکہ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے رات کو ختم ہوا۔ اس لئے میں ڈاکٹر اسلم آزاد کے ساتھ احمد یوسف کے گھر لوٹ آیا۔ میں دوسرے سیشن میں شریک نہ ہو سکا۔ معلوم ہوا کہ دوسرا سیشن رات ساڑھے دس بجے ختم ہوا اور ڈاکٹر مغنی مجھے ہر جگہ تلاش کرتے رہے۔

پٹنہ میں نماز

احمد یوسف صوم و صلواۃ کے بڑے پابند ہیں اور پنج گانہ نماز بہت باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور جمعہ کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھتے ہیں۔ پٹنہ میں سہ روزہ قیام کے دوران مجھے بھی ان کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا۔ مسجد ان کے مکان (واقع صدر گلی) میں ہی تھی، لیکن ان دنوں وہاں ہندوؤں کا سات روزہ یگیہ جاری تھا جو دن رات جاری رہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے محلے میں دور دور تک لاوڈ سپیکر لگائے گئے تھے اور یگیہ اسی پر مسلسل جاری رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اسی علاقہ میں مسجد بھی واقع تھی۔

سات دنوں تک مسلمانوں نے مسجد میں پنج گانہ نماز کس طرح ادا کی اس کا تو مجھے علم نہیں تھا۔ البتہ میں جب احمد یوسف کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے پہنچا تو بھی یگیہ پوری شدت سے جاری تھا۔ ایک لاوڈ سپیکر عین مسجد کے سامنے نصب تھا۔ جس کی وجہ سے نہ موزن کی اذان واضح طور پر سنائی دے رہی تھی اور نہ امام صاحب کا خطبہ سمجھ میں آرہا تھا میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ مسلمان اس بات پر احتجاج کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ متحدہ ہندوستان میں ایسا ہوتا تو فوراً ہندو مسلم فساد شروع ہو چکا ہوتا۔ انگریزوں کے دور میں اولاً تو لاوڈ سپیکر لگا کر یگیہ کرنے کی اجازت ہی نہیں ملتی اور اگر اجازت مل جاتی تو یقینی طور پر ہندو مسلم فساد شروع ہو چکا ہوتا۔ انگریزوں کے عہد کو جانے دیجئے۔ حصول آزادی کے بعد ایک دفعہ ہولی کے موقع پر کلکتے میں ناخدا مسجد (زکریا اسٹریٹ) کے قریب سے ایک کھلی ہوئی ٹرک پر ہندو کرتن گاتے ہوئے گزر رہے تھے کہ میں نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو گریبان سے پکڑ کر نیچے اتار لیا اور ان کی خوب دھلائی کی۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے مسجد کا احترام نہیں کیا تھا اور مسجد کے سامنے ڈھول بجانا شروع کر دیا تھا لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ مسلمان نہایت خاموشی کے ساتھ

نماز پڑھ رہے تھے اور کہیں سے بھی احتجاج کی لہر نہیں اٹھی تھی۔

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب بہار کے مسلمان حالات کے تحت بہت حد تک بدل چکے تھے اور اب ان میں اسلام کے سلسلے میں وہ جوش و خروش نہیں رہا تھا۔ جو آزادی سے قبل ان کا طرہ امتیاز تھا۔ یہی وہ شہر پٹنہ تھا جہاں مسلم لیگ کی تحریک سب سے زیادہ زور دار تھی اور بہار کے مسلمان قیام پاکستان کے لئے سب سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہی وہ شہر تھا جہاں 1946ء میں کھلنا کے بعد ہندو مسلم فساد شروع ہوا تھا۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں انگریزوں نے سب سے پہلے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے کر دونوں فرقوں کے درمیان منافرت کا بیج بویا تھا اور یہی وہ صوبہ ہے جہاں کے رہنے والے اس وقت سابق مشرقی پاکستان میں محض وفاقیت پسند اور پاکستان نواز ہونے کے جرم میں غیر انسانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ اسی کے ساتھ بہار کے مسلمان بھی۔

خدابخش لائبریری

دوسرے روز میں احمد یوسف کے ساتھ خدابخش لائبریری دیکھنے اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے ملنے کے لئے ان کے دفتر پہنچا بیدار صاحب اس وقت اپنے اسٹینو کو خطوط املا کروانے میں مصروف تھے۔ رسمی تعارف اور علیک سلیک کے بعد ہم دونوں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ ہم سے معذرت طلب کر کے اسٹینو کو خطوط املا کرواتے اور ساتھ ہی انٹر کام پر لائبریری کے عملے کو ضروری ہدایات دیتے رہے۔ اس کام میں کافی وقت لگ گیا اور ہم دونوں بہت دیر تک بور ہوتے رہے۔ انہوں نے ہماری جانب اس وقت تک توجہ نہیں دی جب تک تمام خطوط املا نہیں کروالئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ مہمانوں کی بہ نسبت دفتری کام کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بعد میں لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ دفتر کے کاموں کے سلسلے میں بہت ہی سخت گیر ایڈمنسٹریٹر واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ان تمام بے قاعدگیوں سے پاک ہے جو عام طور پر اس قسم کے اداروں میں پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا تعلق یوں تو رام پور سے ہے، لیکن انہوں نے ایم اے پی ایچ ڈی اور بیچلر آف لائبریری سائنس کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی سے اور بی ایل کی سند مگدھ یونیورسٹی سے حاصل کی ہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف بھی ہیں، جن میں "نئے اور پرانے چراغ" (تنقید) "اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبارات" "عظیم اور لازوال" "علی گڑھ کا مسئلہ" "ہندوستانی مسلمان، قیادت کی تلاش میں" "سیما کی تلاش" "ہندوستان کی عربی اسلامی درسگاہیں" "ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ریفارم کے مسائل" قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان غالبیات نو (دو حصہ) علوم اسلامیہ کی اردو انسائیکلو پیڈیا۔ دیوان تسکین دہلوی۔ انتخاب قائم چاند پوری وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے فارسی اور اردو کے کئی شعرائے قدیم

کے دوادین کی تدوین کا کام بھی انجام دیا ہے۔ ان ک ۹ علاوہ مرزا جان طپش دہلوی کی تصنیف "شمس البیان فی مصلحات الہندوستان"۔ "پرشمس الدین فقیر دہلوی" کی نے فارسی "مثنوی تصویر محبت داستان رام چندر" وغیرہ شامل ہیں۔

عابد رضا بیدار بہت دیر تک باتیں کرتے رہے انہوں نے بتایا کہ اس سال کے اواخر یا آئندہ سال کی ابتدا میں پٹنہ میں ایک انڈو پاک سیمینار ہونے والا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ میرے خیال میں کراچی سے کن کن ادبا اور محققین کو مجوزہ سیمینار میں مدعو کرنا مناسب رہے گا۔ میں نے کہا کہ آپ مجھ سے کیوں دریافت کر رہے ہیں اس بارے میں آپ خود فیصلہ کیجئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستان سے جو بھی ادیب آتا ہے۔ میں ان سے اس بارے میں ضرور دریافت کرتا ہوں تاکہ ایک متفقہ نام منتخب کرنا آسان ہو۔

میں نے اپنی صوابدید کے مطابق چند ادیبوں اور محققوں کا نام بتایا جسے انہوں نے نوٹ کر لیا بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس سیمینار میں صرف ان لوگوں کو بلایا جو یا تو ایک سرے سے ادیب ہی نہیں تھے یا پھر جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے (یا جنہوں نے ان کے دورہ پاکستان میں ان کی دل کھول کر خاطر مدارت کی تھی) یا جن کا ریاست رام پور سے تعلق تھا۔ ایسے جعلی ادیبوں کا نام لینا ضروری نہیں ہے ایسے لوگوں سے تمام لوگ واقف ہیں۔

عابد رضا بیدار نے دوسرے روز ناچیز کو خدا بخش لائبریری میں "پاکستان میں افسانے کی صورتحال" کے موضوع پر لیکچر دینے کی دعوت دی، جسے میں نے منظور کر لیا۔ انہوں نے خدا بخش لائبریری کی مطبوعات اور جرنل کے کئی نئے اور پرانے شمارے بھی عنایت کئے اور میں ان سے رخصت ہو کر احمد یوسف کے ساتھ لائبریری دیکھنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

عابد رضا بیدار نے خدا بخش لائبریری کے بارے میں بڑی معلومات فراہم کیں۔ خدا بخش لائبریری ہندوستان اور پاکستان میں اپنے علمی خزانے کے اعتبار سے بلاشبہ قطعی منفرد اور بیمثال ہے اس میں نہ صرف عربی، فارسی، اردو اور مغربی زبانوں کی نادر و نایاب مطبوعات و مخطوطات جمع ہیں، بلکہ مختلف ادوار کے سکے اور روغنی تصاویر بھی محفوظ ہیں، جن سے اس دور کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے مجھے خدا بخش لائبریری کو مکمل طور پر دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا، البتہ میں نے اس کے جن گوشوں کو دیکھا انہیں دیکھ کر متاثر ہوئے بنا نہ رہا، میں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور کلکتہ کی نیشنل لائبریری بھی دیکھی ہے۔ لیکن خدا بخش لائبریری ان دونوں سے قطعی مختلف اور منفرد

ہے۔ میں جب ریڈنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں ایک چھوٹی سی میز پر ایک بہت ہی معمر بزرگ کو کام کرتے ہوئے پایا۔ احمد یوسف نے ان سے تعارف کرایا "آپ عطا کاکوی ہیں" میں نے تعجب سے ان کی جانب دیکھا۔ انہیں پہچاننے میں خاصی دشواری ہوئی۔ میں چند سال قبل ان سے کراچی میں مل چکا تھا۔ لیکن اب وہ اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ انہیں پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے صاحب زادے ارشد کاکوی مرحوم سے میرے گہرے مراسم تھے میں ان کے ماہنامہ "ندیم" (ڈھاکہ) میں بڑی باقاعدگی سے لکھا کرتا تھا۔ اس حوالے سے میں کراچی میں عطا صاحب سے مل چکا تھا، لیکن اس دفعہ انہیں مجھے پہچاننے میں خاصی دشواری ہوئی، ہم دونوں بہت عرصے کے بعد ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ اس عمر میں علمی کام سے ان کے انہماک اور استغراق کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

میں نے خدابخش لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین کو بتایا کہ میں راجندر سنگھ بیدی پر کام کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ بیدی صاحب پر اب تک اردو میں کتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے ابھی اپنا جملہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے اجازت لے کر دوسری منزل پر چلے گئے۔ میں احمد یوسف کے ساتھ لائبریری کے مختلف حصوں کا معائنہ کرتا رہا۔ اور ابھی دس پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ لے کر آئے اور انہوں نے اسے میرے حوالے کر دیا۔

میں نے کاغذ کی جانب دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس میں اردو کے مختلف رسائل میں آج تک بیدی پر شائع ہونے والے مضامین کی مکمل تفصیل موجود تھی۔ جن رسالوں میں بیدی پر مضامین شائع ہوئے تھے ان کے عنوانات اور مصنف کے نام کے ساتھ ماہ و سال اور شمارہ اور جلد نمبر تک درج تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنی ساری تفاصیل کا جمع کر دینا اپنی جگہ خود تعجب خیز بات تھی۔ میں جب رخصت ہونے لگا تو میں نے ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے درخواست کی کہ مجھے راجندر سنگھ بیدی پر لکھے ہوئے مضامین کی اشد ضرورت ہے۔ اگر وہ اس کی فوٹو کاپیاں فراہم کر دیں تو بڑا کرم ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک کاغذ پر مضامین کے عنوانات اور مصنف کے نام لکھ دوں۔ یہ سارے مضامین مجھے پاکستان میں مل جائیں گے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مجھے لائبریری کے بانی مولوی خدابخش کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ اپنی جگہ خود حیران کن اور دلچسپ داستان ہے۔ خدابخش، پٹنہ کے معروف قانون دان تھے۔ وہ 2 اگست 1842 کو میں ضلع چھپرا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد بخش خاں مصنف اور کتابوں کے بڑے رسیا

تھے۔ ان کی نگرانی میں خدا بخش خاں کی پرورش ہوئی، ابتدائی تعلیم مکمل ہونے کے بعد انہیں پٹنہ ہائی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں وہ 1859ء تک زیر تعلیم رہے اس کے بعد انہیں مزید تعلیم کے لئے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ انہوں نے 1861ء میں کلکتہ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد وہ قانون پڑھنے کے لئے کالج میں داخل ہو گئے اور وہاں سے قانون دان بن کر نکلے۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز پیش کار کی حیثیت سے کیا۔ پھر وہ ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے 1868ء میں پٹنہ بار میں شمولیت اختیار کر لی۔ چند برسوں میں وہ ایک ممتاز وکیل کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ان میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں، جو ایک کامیاب قانون دان کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وہ بلدیہ پٹنہ کے وائس چیئرمین اور اس کے بعد پٹنہ ڈسٹرک بورڈ کے وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1880ء میں وہ پٹنہ میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ 1881ء میں انہیں ان کی سماجی خدمات کے پیش نظر خان بہادر کا خطاب عطا کیا گیا۔ انہوں نے 1891ء میں اورنیٹل پبلک لائبریری قائم کی۔ وہ 1903ء میں نظام ہائیکورٹ میں تین سال کے لئے چیف جسٹس بھی مقرر کئے گئے۔

خدا بخش خاں کو پیشہ ورانہ کتابوں کے علاوہ شعر و ادب سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ حافظ اور رومی ان کے پسندیدہ شعرا میں شامل تھے۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی اور وہ گھنٹوں عربی اور فارسی شعرا کا کلام سنا سکتے تھے۔ وہ فارسی بھی بہت اچھی لکھتے تھے اسلامی کتب قانون اور دوسرے موضوعات پر ان کے مضامین ملک کے معروف جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے ان کے عہد کے ممتاز ادبا و شعرا سے ان کے گہرے مراسم تھے جن میں پروفیسر براؤن بھی شامل تھے۔ جن کی "تاریخ ادبیات ایران" نے انہیں بڑی شہرت بخشی تھی۔ انہیں عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انگریزی شاعروں میں بیرن، شیلی، کیٹس اور ٹینی سن ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔

وہ اسلام کے سچے خادم تھے اور انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے گہری محبت اور عقیدت تھی۔ ان کے فرزند صلاح الدین خدا بخش جب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلینڈ روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے انہیں نصیحت کی تھی کہ وہ مغرب کے علوم کی گہرائی میں اتر کر مطالعہ کریں، خصوصاً اسلام کے بارے میں مغربی مستشرقین نے جو کام کیا ہے اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صرف اسی طرح تاریخ اسلام کا صحیح اندازہ ہو گا۔ وہ اگرچہ ایک سچے مسلمان تھے۔ لیکن دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی ان کے دل میں احترام تھا۔ وہ 3 اگست 1908ء کو بروز پیر اس دنیائے فانی سے کوچ کر

گئے۔ اور ان کے جسد خاکی کو لائبریری کے احاطے میں سپرد خاک کیا گیا۔

خدا بخش خاں کا خاندان اس اعتبار سے بڑی عزت واحترام کا مستحق ہے کہ ان کے خاندان میں تین پشت تک بڑے بڑے عالم اور فاضل پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد بخش خود ادیب تھے اور وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ مخطوطات کی خریداری پر صرف کرتے تھے۔ 1876 میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے پاس ایک ہزار چار سو نایاب و نادر مخطوطات محفوظ تھے۔ انہوں نے انتقال سے قبل یہ سارے مخطوطات خدا بخش کے حوالے کر دیے اور انہیں عوام الناس کے مطالعے کے لئے پبلک لائبریری قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کو آخری شکل دی جو بعد میں برصغیر میں عربی اور فارسی کی نادر و نایاب مخطوطات کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔

مشہور مورخ جادو ناتھ سرکار نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ چونکا دینے والا ہے۔ ہندوستان میں دور مغلیہ کے کتب خانوں میں بلاشبہ سولہویں اور سترھویں صدی تک مشرق کی تمام اہم عربی اور فارسی کتابیں دہلی میں جمع ہو چکی تھیں۔ ان میں کچھ کتابیں خریدی گئی تھیں۔ کچھ خود مصنفوں نے جمع کی تھیں اور کچھ فتوحات کے نتیجے میں مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگی تھیں اور بعض امرا اور روسا کے انتقال کے بعد ان کے ذاتی کتب خانوں سے حاصل کر لی گئی تھیں۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں وسطی ایشیا، ایران اور عرب میں مسلسل جنگ وجدل جاری تھا۔ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے مغل ہندوستان میں مکمل امن و امان قائم تھا چنانچہ ان ممالک کے علمار و فضلا سمٹ کر ہندوستان آگئے تھے اور اس دور کے اودھ کے نوابین کے کتب خانے ان قیمتی کتابوں سے بھر گئے۔ 1847 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد جب دہلی اور اودھ کی سلطنتیں ختم ہو گئیں تو شاہی اور نوابی کتب خانے بھی نابود ہو گئے۔ اس دور میں رام پور کے نواب نے برطانوی حکومت کا ساتھ دیا تھا چنانچہ اس دور میں فاتح انگریز سپاہی ان کتب خانوں سے جو بھی کتابیں اور مخطوطات لوٹ کر لائے۔ وہ ہر مخطوطہ کو ایک روپیہ کے حساب سے خریدتے رہے۔ خدا بخش خاں نے بہت بعد میں مخطوطہ خریدنا شروع کیا لیکن مخطوطات کی خریداری میں خدا بخش، نواب آف رام پور سے بازی لے گئے۔ خدا بخش نے محمد مکی نامی ایک عرب کو صرف کتب کی خریداری کے لئے پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ پر ملازم رکھا تھا۔ وہ اٹھارہ سال تک یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیتے رہے محمد مکی کا کام شام، عرب، مصر، ایران کے وسیع تر علاقوں کا دورہ کر کے صرف نادر و نایاب مخطوطات خریدنا تھا۔ یہ خدا بخش ہی تھے جو مخطوطات لے کر بانکی پور (پٹنہ) آنے والوں کو نہ صرف مخطوط کی

معقول قیمت ادا کرتے تھے، بلکہ انہیں ریل کا دو طرفہ کرایہ بھی دیتے تھے اس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہو گیا تھا اور لوگ مخطوطات کی فروخت کے لئے ان کے پاس جوق در جوق آنے لگے تھے جوں جوں وقت گزرتا گیا خدا بخش خاں کے پاس مخطوطات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ لہذا انہیں لائبریری کی نئی عمارت کی ضرورت محسوس ہوئی، 1888ء میں لائبریری کی نئی عمارت مکمل ہوئی تو انہوں نے ساری کتابیں نئی عمارت میں منتقل کر دیں اور اس کا نام "خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری" رکھا۔

کسی فرد واحد کے لئے اتنی بڑی لائبریری کا انتظام و انصرام سنبھالنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پٹنہ میں مقیم افیون کے ایجنٹ مسٹر کیمبل سے درخواست کی کہ وہ اس بات کو حکومت کے نوٹس میں لائے۔ اس دوران عربی کے مشہور انگریز اسکالر سر چارلس لائل نے لائبریری کا معائنہ کیا تو وہ عربی و فارسی کے نادر و نایاب مخطوطات دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے گورنر بنگال کی توجہ اس لائبریری کی جانب مبذول کرائی اور ان سے اس لائبریری کا سرپرست بننے کی درخواست کی۔ بالاخر 1891ء میں لیفٹننٹ گورنر سر چارلس ایلیٹ نے لائبریری کا رسمی طور پر افتتاح کیا۔ اس وقت لائبریری میں مجموعی طور پر ساڑھے چھ ہزار کتابیں تھیں جن میں مخطوطات کی تعداد چار ہزار تھی۔ باقی ماندہ کتابیں انگریزی میں تھیں۔

صلاح الدین خدا بخش بھی اپنے زمانے کے مانے ہوئے اسکالر تھے۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح کتابوں کے بڑے رسیا تھے اور ان میں ان کے والد کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی لائبریری کی ترقی و توسیع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر لائبریری کو بڑی ترقی دی۔ وہ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبان کے بھی اسکالر تھے اور انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں اور کئی ترجمے کئے تھے۔ ان کے پاس یورپی زبانوں میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوی نے یہ ساری کتابیں خدا بخش لائبریری کو دے دیں۔

1891ء میں جب حکومت بنگال نے لائبریری کا نظم و نسق سنبھال لیا تو اس نے ایک مجلس انتظامیہ مقرر کی۔ اس لائبریری کی ایک بڑی خوبی مشہور مستشرقین Sir Gore Ouslly-Day sacy اور Blochman کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات ہیں اس لائبریری کی اہمیت کو ساری دنیا کے مستشرقین نے تسلیم کیا ہے اس لائبریری کے ذخیرے میں 1961ء

میں اس وقت بیش بہااضافہ ہوا۔ جب الاصلاح لائبریری دیسنہ کی سات ہزار کتابیں شامل کر دی گئیں ان کتابوں کو رکھنے کے لئے ایک الگ ڈیپارٹمنٹ تعمیر کرنے کی ضرورت ہوئی۔ جو بعد میں "دیسنہ کلیکشن" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ درست ہے کہ اس کلیکشن میں مخطوطات کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن جو بھی مخطوطات ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ البتہ اس کا سب سے بڑا حصہ انیسویں صدی کی ابتدا میں شائع ہونے والے جرائد ہیں، جواب کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ خدا بخش لائبریری میں اس وقت کتابوں کی صورت میں جو ادبی خزینہ موجود ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا۔ کہ صرف اس کی فہرست 32 جلدوں پر مشتمل ہے۔ جن میں تمام عربی و فارسی ہے

اس وقت لائبریری میں مخطوطات، مطبوعہ کتابوں، جرائد اور جرنلز کی مجموعی تعداد 42298 ہے۔ جس کی تفصیل یوں ہے۔

1۔	عربی مخطوطات۔	4106
2۔	فارسی مخطوطات۔	3883
3۔	اردو مخطوطات۔	243
4۔	ترکی مخطوطات	20
5۔	ہندی اور سنسکرت مخطوطات۔	25
6۔	کھجور کے پتے پر لکھے ہوئے۔	200
7۔	عربی، فارسی اور اردو کی مطبوعہ کتابیں	23946
8۔	انگریزی کی مطبوعہ کتابیں۔	91882
9۔	فرانسیسی کی مطبوعہ کتابیں۔	877
10۔	جرمن کی مطبوعہ کتابیں۔	982
11۔	اسپینی کی مطبوعہ کتابیں۔	2
12۔	لاطینی کی مطبوعہ کتابیں۔	12
13۔	اطالوی کی مطبوعہ کتابیں۔	3
14۔	جرائد اور جرنلز۔	5911

خدا بخش لائبریری کی تاریخ میں 16 اکتوبر 1962ء اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس دن لائبریری کی سابق مجلس انتظامیہ کی جگہ اعلیٰ اختیاراتی بورڈ آف مینجمنٹ قائم ہوا اور لائبریری

میں موجود عربی، فارسی اور اردو مخطوطات اور آرٹ اور دیگر انمول ذخیرے کو قومی ورثہ قرار دیا۔ اسی کے ساتھ مرکزی حکومت نے لائبریری کے تمام اخراجات پورے کرنے کا فیصلہ کیا اور لائبریری کو بالکل جدید اور سائنسی خطوط پر از سر نو منتظم کیا گیا۔ 1979ء میں ہندوستانی پارلیمینٹ نے خصوصی ایکٹ کے تحت اسے قومی اہمیت کا حامل ادارہ قرار دیا۔ عابد رضا بیدار کے بیان کے مطابق اس وقت مرکزی حکومت پچیس لاکھ روپے گرانٹ دیتی ہے جو امید ہے آئندہ سال بڑھ کر پینتس لاکھ روپیہ ہو جائے گا۔ عابد رضا بیدار کی نگرانی میں ہر سال لائبریری میں محفوظ چار مخطوطات کا متن شائع ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ لائبریری کے مخطوطات اور کتابوں کے ہر سال اردو کیٹلاگ شائع ہوتے ہیں۔ ہر سال ایک کل ہند مشاعرہ اور ایک یادگاری لیکچر ہوتا ہے اس کے علاوہ سیمینار وغیرہ باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔ لائبریری نے ریسرچ فیلو شپ دینا بھی شروع کیا ہے جو صرف مخطوطات پر کام کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔

عابد رضا بیدار صاحب کی دعوت پر میں دوسرے روز احمد یوسف کے ساتھ ٹھیک پانچ بجے خدا بخش لائبریری پہنچا۔ وہاں پہلے ہی پچیس تیس افراد موجود تھے۔ لائبریری میں ایک روز قبل ہی میرے لیکچر کا اعلان نامہ نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جو بھی لائبریری میں آتا تھا وہ اس میں ضرور شامل ہو جاتا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار پچاس ساٹھ اسکالروں اور صاحبان ذوق کے سامنے "پاکستان میں اردو افسانہ" کے موضوع پر تقریر کی اور "زندہ سلامت" واپس آگیا۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا دور شوع ہوا۔ جو نصف گھنٹے تک جاری رہا۔ اس اجتماع میں پٹنہ کے معروف اور کم معروف ادبا کے علاوہ کالج اور یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ بھی شامل تھے۔

اے، کلکتہ، الوداع

اب میرے آبائی شہر سے رخصت ہونے کا وقت قریب آچکا تھا۔ میں نے کلکتہ پہنچتے ہی واپسی کے لئے راج دھانی ایکسپریس کا ٹکٹ ریزرو کروالیا تھا۔ اس لئے مجھے دہلی واپسی میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ راج دھانی ایکسپریس اس وقت ہندوستان کی سب سے اچھی، عمدہ اور نہایت آرام دہ ٹرین ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کا کرایہ عام ٹرینوں کی بہ نسبت دوگنا ہے، لیکن اس میں سفر کے دوران جو سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے ٹرین کے کرائے میں تینوں وقت کا کھانااور دو وقت کی چائے مع ناشتہ شامل ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے مسافر راستے کے گندے اور غیر صحت مند کھانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے زائد کرائے کا خیال کئے بغیر اپنی نشست ریزرو کروالی تھی۔

مجھے کلکتہ سے روانہ ہوتے وقت صرف ایک بات کا افسوس تھا وہ یہ کہ اکیس سال کے بعد اپنے آبائی شہر آیا اور صرف نو روز قیام کیا۔ اس میں سے تین روز پٹنے میں گزر گئے۔ اس طرح میں صرف چھے روز کلکتے میں رہا اور یہ چھے روز بھی پلک جھپکتے اس طرح گزر گئے کہ احساس ہی نہ ہوا۔ میں مزید چند روز قیام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دفتر سے چھٹی صرف ایک ماہ کے لئے ملی تھی اور دن اتنی تیزی سے گزر رہے تھے، جیسے وقت کو پر لگ گئے ہوں۔

ہوڑہ اسٹیشن میں مجھے رخصت کرنے کے لئے میرے بھائی سلیمان عارف اور برادر نسبتی محمد اسلم آئے تھے اور مجھے رخصت کرتے ہوئے دونوں آبدیدہ تھے۔ معلوم نہیں اب کب ملنا ہو اور ملنا بھی ہو کہ نہیں، کسے معلوم، بہر حال میں ان سے رخصت ہو کر اور اپنا سوٹ کیس لگیج میں رکھنے کے بعد اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور کلکتے کے بارے میں سوچنے لگا۔

کلکتہ گذشتہ اکیس برسوں کے دوران کس قدر بدل چکا ہے اس کی آبادی کتنی بڑھ چکی ہے اور وہ پہلے کے مقابلے میں کس قدر گندا ہو چکا ہے میں جب کلکتے میں تھا اس وقت بھی اس کا شمار دنیا کے غلیظ ترین شہروں میں ہوتا تھا اور آئے دن اخبارات میں اس کے بارے میں خبریں اور فیچرز شائع ہوتے رہتے تھے، لیکن اب اس کی گندگی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں جب روزنامہ "آزاد ہند" کے رپورٹر کی حیثیت نے کلکتہ کارپوریشن کے کونسلروں کی ہفت روزہ میٹنگ میں جایا کرتا تھا تو اس وقت بھی ان میٹنگوں کا موضوع بحث کلکتے کی سڑکوں کی صفائی ہوا کرتا تھا۔ اس وقت کلکتے کی آبادی چالیس سے پنتالیس لاکھ کے درمیان تھی۔ یہ اکیس سال قبل کی بات ہے۔ اب اس کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ آبادی کی مناسبت سے صفائی کے نظام میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ جس کے باعث صفائی ستھرائی کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا اور پھر اقتصادی بدحالی کے باعث بنگال کے دیہات اور شمالی ہند کے دیہی علاقوں سے بیروزگار لوگوں کی یلغار نے صورت حال کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ اب کلکتے میں مزید توسیع کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کلکتہ بڑھتے بڑھتے جادو پور اور بج بج تک پھیل چکا ہے۔ دوسری جانب ہوڑہ اور ہگلی ضلع میں بھی (جو کلکتہ کے مضافاتی اضلاع ہیں) آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے

کلکتے کی آبادی اور سواریوں میں غیر معمولی اضافے کے باعث صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک اور شام پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک سڑکوں پر گاڑیوں کا اس قدر تانتا بندھا رہتا ہے کہ سڑک پر سے گزرنا دوبھر ہو جاتا ہے ٹرامیں، بسیں اور ٹیکسیاں اس طرح رینگ رینگ کر چلتی ہیں کہ اگر مسافر پیدل چلے تو وہ سواری سے پہلے منزل مقصود تک پہنچ جائے شہر کی شاہراہوں پر تمام سست رفتار گاڑیوں پر پابندی عائد ہے اس کے باوجود یہ عالم ہے

ہندوستانی عوام کی غربت اور افلاس کو اگر اپنی نظروں سے دیکھنا مقصود ہو تو سیاحوں کو کلکتہ ضرور جانا چاہئے۔ (لیکن غیر ملکی سیاح ان ہولناک مناظر کو دیکھنے کے لئے کلکتہ کیوں جائیں؟ ہندوستان کے دیگر خوبصورت اور صحت بخش مقامات پر کیوں نہ جائیں؟ ہندوستان میں ایسے مقامات کی کوئی کمی نہیں ہے) کلکتے کی موجودہ ناگفتہ بہ صورت حال کے باعث مغربی بنگال میں سیاحت کی صنعت بالکل تباہ ہو چکی ہے اب بہت کم غیر ملکی سیاحت کی غرض سے کلکتہ اور دارجلنگ آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب پہاڑ "کنچن چگا" کے قدرتی مناظر کو دیکھنے کیلئے غیر ملکی سیاح دور دور سے دارجلنگ میں امنڈے چلے آتے تھے۔ لیکن جب سے ضلع دارجلنگ میں "گورکھا لینڈ" کے قیام کی

پر تشدد تحریک شروع ہوئی ہے، غیر ملکیوں نے یہاں آنا کم کر دیا ہے یہی عالم کلکتے کا ہے۔ کلکتہ شہر اور اس کی شاہراہیں اور عمارتیں اس قدر میلی اور بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی شہر ہے جس پر انگریز حکمرانوں کو بڑا فخر تھا اور جو نہایت افتخار کے ساتھ اس کا لندن سے موازنہ کرتے تھے۔

آبادی کا یہ عالم ہے کہ بے گھر لوگوں نے فٹ پاتھوں اور خالی مقامات پر بعض اوقات سڑکوں کے عین درمیان میں اپنی جھوگیاں بنا لی ہیں۔ جس کی وجہ سے سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر سے گزرنا دشوار ہو چکا ہے کانگرس کے دور حکومت میں پولیس ان لوگوں کو زبردستی وہاں سے ہٹا دیتی تھی، لیکن جب سے کمیونسٹ حکومت برسر اقتدار آئی ہے۔ اس نے انہیں بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ یہ حکومت خود کو غریبوں کی بہی خواہ کہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ حکومت میں یہ لوگ شہر کے بالکل وسط میں قیام پذیر ہیں، ورنہ کوئی دوسری حکومت ہوتی تو انہیں بہت دن قبل اٹھا کر پھینک چکی ہوتی۔ سابقہ حکومت نے ان بے گھر لوگوں کو شہر سے دور مضافات میں آباد کرنے کی کوشش کی تھی اور انھیں زمین دینے کے علاوہ مکانات بھی بنا کر دیئے تھے لیکن انہوں نے وہاں منتقل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ان کی رہائش گاہ ان کے روزگار کیجگہ سے اتنی زیادہ دور تھی کہاں کا وہاں رہ کر روزگار حاصل کرنا قطعی ممکن نہ تھا، چنانچہ جو لوگ زمین اور مکان کے لالچ میں مضافاتی بستیوں میں گئے انہوں نے چند دنوں کے قیام کے بعد اسے چھوڑ کر پھر شہر کے درمیان میں ڈیرہ جمالیا۔ اس طرح حکومت کی جانب سے شہر کو بے گھر لوگوں کے غیر قانونی قبضے سے آزاد کرنے کی ساری تدابیر ناکام ہو گئیں چنانچہ کمیونسٹ حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس بات کی کوشش ہی نہیں کی، اس کے برعکس اس نے انہیں اس بات کی چھوٹ دے دی کہ جو جس جگہ چاہیں جھونپڑی بنا کر رہنا شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سارے شہر میں (خصوصاً وسطی کلکتہ میں) جگہ بجگہ جھگیاں ہی نظر آتی ہیں۔ شام ہوتے ہی سارا شہر دھوئیں میں گھر جاتا ہے، کیوں کہ یہ لوگ دن بھر جو کچھ کما کر لاتے ہیں۔ اس سے دال چاول خرید کر کھلے آسمان کے نیچے لکڑی کے چولہے پر کھانا پکاتے ہیں۔ اس طرح شام ہوتے ہی کلکتہ کی فضا میں گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔

کلکتے کی عمارتوں کی بوسیدگی اور شکستگی کی ایک وجہ مالکان کی لاپروائی بھی ہے۔ کلکتے میں مکانات کے کرائے میں اضافے پر کڑی پابندی عائد ہے حکومت کرایہ داروں کے مفادات کی پوری نگرانی کرتی ہے رینٹ کنٹرول ایکٹ کے تحت کسی مکان مالک کو اپنے کرایہ دار کو بے دخل کرنے کا

س وقت تک اختیار نہیں، جب تک وہ مالک مکان کو باقاعدگی کے ساتھ وقت پر کرایہ ادا کر رہا ہو۔
کلکتہ کے مکانات کا کرایہ عام طور پر وہی ہے جو آزادی کے وقت تھا۔ اس دوران اگرچہ کہیں کہیں کرائے میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ پھر بھی کرایہ اس قدر کم ہے کہ اس کے بارے میں پاکستانی عوام تصور تک نہیں کر سکتے۔ کرائے میں اضافہ نہ کر سکنے کے باعث مالکان مکان نے اس کی مرمت اور رنگ وروغن کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے اور وہ اس دن کا بے چینی کے ساتھ منتظر ہیں جب یہ مکانات اپنی عمر طبعی گزارنے کے بعد گر جائیں گے اور ان کی جگہ نئی کثیر المنزلہ عمارتیں تعمیر کرنے کا موقع ملے گا اور اس طرح مالکان اراضی اور مالکان مکانات کو دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کا موقع ملے گا، لیکن انگریزوں کے دور میں تعمیر ہونے والی یہ عمارتیں اتنی مضبوط اور مستحکم ہیں کہ اپنی جگہ اسی طرح سربلند ہیں، جس طرح آج سے سو یا ڈیڑھ سو سال قبل تھیں۔

اس دفعہ میں کلکتہ گیا تو میں نے کلکتہ کے سلم ایریا (یعنی پس ماندہ بستیوں) میں جھونپڑیوں کی جگہ بلند و بالا کثیر المنزلہ عمارتیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس کی وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بڑے بڑے مارواڑی سیٹھوں نے بہت سی تعمیراتی کمپنیاں قائم کر رکھی ہیں جو پس ماندہ بستیوں کے مالکان اراضی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ انہیں یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر وہ ان کی زمین پر بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنے کی اجازت دے دیں تو وہ ان کی زمین پر عمارتیں تعمیر کر کے ان کے حوالے کر دیں گے اس عمارت کا جو بھی کرایہ ہو گا اس پر بھی ان کا حق ہو گا، البتہ کرایہ داروں سے وہ جو سلامی وصول کریں گے وہ ان کو ملے گی۔ ان بستیوں کے غریب مالکان اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ فریقین کے درمیان باقاعدہ معاہدہ ہوتا ہے اور تعمیراتی ادارے عمارت کی تعمیر کے بعد کرایہ داروں سے ایک ایک فلیٹ کا پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے تک سلامی وصول کرتے ہیں۔ اس طرح پس ماندہ بستیوں کا کل کا غرب مالک راتوں رات امیر اور دولت مند بن جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں رہائش کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ اس سے ہر شخص واقف ہے اور جس شہر کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہو، وہاں مکانات کی کتنی قلت ہو گی۔ یہ بھی بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے۔

میں اس دفعہ کلکتے گیا تو وہاں کی مساجد کی سج دھج دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ کلکتہ میں شاید ہی کوئی ایسی مسجد ہو گی جس کا رنگ وروغن نہ کیا گیا ہو۔ بعض مساجد کے بارے میں شبہ ہوا کہ وہ بالکل نئی تعمیر ہوئی ہیں، لیکن اہل محلہ نے بتایا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بہت پرانی مسجد ہے۔ البتہ اس پر حال ہی میں رنگ کیا گیا ہے اس بارے میں مزید معلوم ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں حالیہ برسوں میں اسلام

کے سلسلے میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے اس کے تحت وہ مساجد کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور ہر سال اس کی مرمت اور رنگ و روغن کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے مسجد کی خوبصورتی قائم رہتی ہے۔ کلکتے کی بوسیدہ عمارتوں کے درمیان چمکتی دمکتی ہوئی مسجدیں اور بھی پر کشش نظر آتی ہیں۔

کلکتے کی حالت دیکھ کر واقعی بہت دکھ ہوا اور مجھے اس دور کے وزیراعظم راجیو گاندھی کا وہ بیان یاد آیا جس میں انہوں نے انڈین پارلیمینٹ میں واشگاف الفاظ میں کلکتے کو ایک "مردہ شہر" قرار دیا تھا۔ جس پر اہل کلکتہ اور مغربی بنگال کی کمیونسٹ حکومت نے سخت احتجاج کیا تھا۔

میں اپنے خیالات میں گم کلکتے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ٹرین چل پڑی اور میں نے ایک بار پھر نظر بھر کر پلیٹ فارم کو دیکھا اور دل ہی دل میں کہا "اے کلکتہ، الوداع"

ٹرین کے رفتار پکڑنے کے بعد میں نے اپنے گردو پیش پر نظر دوڑائی۔ میری نشست کے بغل میں ایک ادھیڑ عمر کی بنگالی خاتون بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے خاندان کے دیگر افراد دوسری جانب نشسوں پر براجمان تھے۔ درمیان میں کوریڈور تھا۔ وہ لوگ آپس میں بنگلہ میں گفتگو کر رہے تھے جس سے معلوم ہوا کہ سب دہلی جارہے ہیں۔ میری گود پر بنگلہ کے مشہور ہفت روزہ "دیش" کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا۔ جو میں نے روانہ ہونے سے قبل اسٹیشن سے خریدا تھا، خاتون نے مجھ سے اجازت لے کر "دیش" اٹھالیا اور ورق گردانی شروع کردی۔ تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد انہوں نے رسالہ لوٹا دیا۔ میں نے ان سے بنگلہ میں گفتگو شروع کی۔ اپنا تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ میں ایک پاکستانی ادیب اور صحافی ہوں اور تقریباً دو جگ کے بعد اپنے آبائی شہر کلکتہ آیا ہوں، لیکن کلکتہ کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔"

"کیوں؟" انہوں نے دریافت کیا۔

میں نے کہا، "کلکتہ بہت زیادہ گندا ہے اور لوگوں نے سڑکوں کے درمیان جھگیاں بنالی ہیں۔"

انہوں نے فوراً جواب دیا "اس کے لئے جیوتی باسو کی حکومت ذمے دار ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کے لئے صرف کمیونسٹ حکومت ذمہ دار ہے"

انہوں نے بڑے وثوق اور خود اعتمادی کے ساتھ کمیونسٹ حکومت پر الزام عائد کیا۔ میں نے ایک اخبار نویس کی طرح ان کی جرح کی، "آپ یہ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟ میری معلومات کے مطابق تو مرکزی حکومت نے صوبے کی ساری امداد بند کر رکھی ہے۔ اس لئے کہ وہاں کانگرس کی مخالف پارٹی حکمران ہے۔

انہوں نے کہا "میرے میاں اجیت کمار پانجا کانگریس کے ایم پی ہیں اور وہ لوک سبھا میں مغربی بنگال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مرکز ہر سال مغربی بنگال کی حکومت کو ترقیاتی منصوبوں کے لئے جو رقم فراہم کرتا ہے۔ اسے عمداً ترقیاتی کاموں میں صرف نہیں کیا جاتا، تاکہ عوام میں راجیو گاندھی کی حکومت کو بدنام کیا جا سکے۔ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے۔"

میں ان سے ہندوستان کی سیاست پر اس طرح گفتگو کر رہا تھا، جیسے میں خود کوئی ہندوستانی شہری ہوں اور ملک کی سیاسیات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ان سے گفتگو کے نتیجے میں سفر بہت آسانی سے کٹ گیا۔ بوریت قطعی نہیں ہوئی اور اندازہ ہوا کہ بنگال کی تعلیم یافتہ خواتین عملی سیاست میں کتنی زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔ سیاست یوں بھی بنگالیوں کی گھٹی میں پلی ہوئی ہوتی ہے۔ مرد ہو یا عورت سیاست پر بے دریغ گفتگو کرتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ کانگرسی لیڈر اجیت کمار پانجا سے ملنے کے لئے فی الحال دہلی جا رہے ہیں۔ بچوں کے اسکول اور کالج بند ہیں۔ اس لئے وہ موسم گرما گزارنے کے لئے کشمیر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے دہلی جائیں گے۔ وہاں سے مسٹر پانجا کے ساتھ سری نگر روانہ ہو جائیں گے۔

خاتون یہ ساری باتیں اتنی بے تکلفی سے بتا رہی تھیں، جیسے میں ان کا بڑا پرانا شناسا ہوں۔ ان کی بے باکی پر میں خود حیران تھا اور دل ہی دل میں ہندوستان کی جدید عورت کو داد دے رہا تھا۔

مجھے کھڑکی کے کنارے والی نشست ملی تھی۔ جس کی وجہ سے میں باآسانی باہر کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔ راج دھانی ایکسپریس کی رفتار عام ٹرینوں کی بہ نسبت بہت تیز تھی۔ اس کے باوجود میں باہر کی غربت بہ آسانی دیکھ رہا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کے چہرے تپ دق کے مریضوں کی طرح مدقوق تھے آنکھیں اور گال اندر کی جانب دھنسے ہوئے تھے ہاتھ کی چمڑی ہڈی سے لگی ہوئی تھی۔ بال خشک اور اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے مہینوں سے ان میں تیل نہ پڑا ہو۔

میں دل ہی دل میں ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے مابین موازنہ کر رہا تھا۔ دونوں کے معیار زندگی میں کتنا زیادہ فرق تھا۔ پاکستان میں بھی غریبوں اور فلاکت زدہ لوگوں کی کمی نہیں تھی، لیکن وہ غریب اور مفلس ہوتے ہوئے بھی مجموعی طور پر بھارت کے عوام سے بہتر تھے اور ان کا کم سے کم معیار زندگی بھی بھارت کے عوام سے بلند تھا۔

میں ریلوے بک سٹال سے خریدا ہوا بنگلہ ہفت روزہ "دیش" کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میری

نظر ایک تبصرے پر رک گئی، جو ایک مشہور ہندوستانی ماہر اقتصادیات کی کتاب پر تھا۔ میں جس بارے میں چند لمحے قبل سوچ رہا تھا اتفاق سے کتاب اسی موضوع پر تھی۔ کتاب کا موضوع تھا "ہم غریب کیوں ہیں؟" مصنف کا نام سور تھا۔ اس میں مصنف نے ہندوستانی عوام کی غربت کے اصل اسباب سے بحث کی تھی۔ مصنف نے لکھا تھا کہ ہندوستانی عوام کا خیال تھا کہ سیاسی آزادی ملتے ہی عوام کے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں گے لیکن چار دہائی گزر جانے کے بعد بھی ان کی غربت نہ صرف قائم ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس دوران ملک میں زبردست صنعتی ترقی ہوئی، بلکہ ایک نئے صنعتی دور کا آغاز بھی ہوا۔ صنعت ہو یا زراعت، ہر شعبے میں پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود عوام کی غربت میں کمی ہونے کے بجائے۔ اس میں اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ مصنف کے خیال میں ابتدا سے ہی منصوبہ بندی میں خامی ہے۔ نہرو نے اپنے دور اقتدار میں بھاری صنعتوں کے قیام پر زور دیا اور زراعت کو نظرانداز کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل ثروت طبقے کے ہاتھ میں تمام وسائل جمع ہو گئے اور غریب مزید غریب ہو گیا۔ مصنف کا خیال تھا کہ گذشتہ چالیس سال کے دوران ہندوستان میں جو بھی اقتصادی ترقی ہوئی، وہ آبادی میں بے پناہ اضافے کے باعث ملیا میٹ ہو گئی۔ بیروزگاروں کی ایک فوج ہے جو ہر طرف منڈلاتی ہوئی نظر آتی ہے افراط زر میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور اشیائے ضرورت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور فی الحال ان کے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا ہے۔ سوشلسٹ راج قائم کرنے کا خواب چکنا چور ہو چکا ہے۔

میں نے دل میں سوچا کہ مصنف نے تمام باتوں سے بحث کی ہے، لیکن اصل پہلو کو نظرانداز کر دیا ہے۔ وہ ہے ہندوستان کا فوجی بجٹ۔ ہندوستان اپنی مجموعی قومی پیداوار کا جتنا بڑا حصہ جنگی سازوسامان کی خریداری پر صرف کرتا ہے۔ اس میں اگر کمی کر دی جائے تو عوام کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں، لیکن ہندوستان کا کوئی سیاست دان اور ماہر اقتصادیات اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کیوں کہ ہندوستان کے حکمرانوں کے سر میں عظیم تر ہندوستان کا سودا سمایا ہوا ہے، جسے وہ کسی حال میں ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے اس کے لئے اپنے پڑوسی ملکوں سے دوستی اور حالات کو معمول پر لانا ضروری ہے اور یہ کام آسان نہیں ہے۔

میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گیا، ائرکنڈیشنڈ کوچ ہونے کی وجہ سے نیند کا غالب آجانا

نظری تھا۔ میری جب آنکھیں کھلیں تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ٹرین کا ویٹر مجھے بیدار کر کے ڈنر کا انتظام کر رہا تھا۔ ہوائی جہاز کی طرح میرے سامنے کی نشست کے عقب سے ایک چھوٹی سی فلیکسی بل میز لگی ہوئی تھی جو ضرورت کے وقت لگائی اور ضرورت ختم ہونے کے بعد تہہ کر کے رکھی جاسکتی تھی۔ اس نے میز لگانے کے بعد دریافت کیا کہ میں ویجی ٹیبل کھانا پسند کروں گا یا نان ویجی ٹیبل۔ میں سفر کے دوران ہمیشہ ویجی ٹیبل کھانے کو ترجیح دیتا رہا تھا۔ لہذا میں نے ویجی ٹیبل کھانا لانے کی ہدایت کی، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً دس بجے رات کو کمپارٹمنٹ کی زیادہ تر بتیاں گل ہو گئیں اور کوریڈور میں صرف مدہم سی بتی جلتی رہی، تاکہ آنے جانے میں کسی کو دقت نہ ہو۔ اسی کے ساتھ لوگ سونے کی تیاراں کرنے لگے۔ میں چیئر کار میں تھا جو ہوائی جہاز کی نشستوں کی طرح سوتے وقت پھیل جاتی تھی اور مسافر نیم دراز ہو کر بڑے آرام سے سو سکتا تھا، چنانچہ مں نے بھی اپنی چیئر لمبی کر لی، مسز پانجا نے مشورہ دیا کہ اگر میرے پاس کوئی چادر یا کمبل ہو تو نکال لوں۔ اس لئے کہ رات کو ائیر کنڈیشنگ کی وجہ سے ٹھنڈک زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

میرے پاس چادر یا کوئی کمبل نہ تھا۔ اس لئے ناچار خاموش بیٹھا رہا۔ مسز پانجا نے مشورہ دیا کہ میں اٹین ڈینٹ گارڈ سے جا کر کمبل لے آؤں۔ ریلوے کی طرف سے ان مسافروں کو کمبل فراہم کیا جاتا ہے جن کے پاس اس کا بندوبست نہیں ہوتا۔ راج دھانی ایکسپریس کے تمام ڈبے ایک دوسرے سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ جسے انٹی گرل کوچ کہتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہوتی ہے کہ مسافر ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتا ہے۔ میں لپک کر سلیپنگ کیبن میں گیا اور اٹینڈینٹ سے کمبل طلب کیا۔ اس نے کمبل دینے سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ کمبل صرف سلیپنگ کوچ کے مسافروں کے لئے مخصوص ہے۔ چیئر کار کے مسافر اس کے مستحق نہیں۔ چنانچہ میں مایوس ہو کر اپنی نشست پر واپس آگیا۔ مسز پانجا کے دریافت کرنے پر میں نے انہیں ساری باتیں بتا دیں۔ وہ چونکہ "راجدھانی ایکسپریس" میں عموماً دہلی آتی جاتی رہی ہیں۔ اس لئے انہیں تمام باتوں کا علم تھا۔ ان کے ساتھ چونکہ پوری فیملی تھی۔ اس لئے پہلے ہی اپنے بستر بند میں کئی عدد چادریں اور کمبل باندھ لئے تھے۔ انہوں نے بستر بند سے ایک کمبل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے کمبل لینے سے لاکھ انکار کیا۔ لیکن وہ مسلسل اصرار کرتی رہیں۔ انہوں نے کہا کہ "آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ رات گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈک کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ آپ پردیسی ہیں۔ اس لئے آپ کو زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے مزید کہا اگر آپ

کمبل نہ اوڑھیں گے تو صبح تک قلفی بن جائیں گے۔"

میں نے ان کے خلوص کو دیکھتے ہوئے ان کا کمبل قبول کر لیا۔ واقعی رات کے بھیگنے کے ساتھ ہی ٹھنڈ اتنی بڑھ گئی کہ میں کمبل کے اندر بھی کانپنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں اس ہمدرد خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ اگر وہ مجھے کمبل نہ دیتیں تو نہ معلوم ٹھنڈ کے مارے میرا کیا حال ہوتا۔ میں کمبل کو ہر جانب سے جسم کے ساتھ لپیٹ کر سو گیا۔

صبح میری آنکھیں اس وقت کھلیں جب ٹرین کے لاوڈ اسپیکر پر لتا منگیشکر کا بھجن شروع ہوا۔ اس کے فوراً بعد آل انڈیا ریڈیو سے خبروں کا بلیٹن نشر ہونا شروع ہو گیا۔ اس وقت تک ٹھنڈک میں کمی آ چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے منہ ہاتھ دھونے، برش کرنے، داڑھی بنانے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لئے ٹائیلٹ جا رہے تھے۔ ہر ڈبے میں کئی کئی ٹائیلٹ تھے اور اسی کے ساتھ الگ سے غسل خانے بھی، اس لئے کسی مسافر کو قطاریں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ ہوئی۔ عورتوں اور مردوں کا ٹائیلٹ اور غسل خانہ الگ الگ تھا۔

تھوڑی دیر میں ویٹر نے تھرمس میں پیالی کے ساتھ بیڈ ٹی لا کر رکھ دی، اس کے ساتھ دو عدد بسکٹ بھی، میں بیڈ ٹی کا عادی نہ تھا۔ لیکن چونکہ رات بھر ٹھنڈک سے کانپتا رہا تھا۔ اس لئے میں نے اسے نعمت غیر مترکہ تصور کیا اور یکے بعد دیگرے دو کپ چائے پی لی اور ساتھ ہی بسکٹ بھی ہضم کر گیا۔ ٹھیک آٹھ بجے بریک فاسٹ صرف کیا گیا۔ جس میں دو سلائیں ڈبل روٹی۔ ایک اونس مکھن، ایک انڈا پوچ، ایک عدد کیلا اور اس کے ساتھ تھرمس میں بند چائے۔ جن لوگوں کو انڈے سے پرہیز تھا ان کے لئے میٹھائی کا انتظام تھا۔ راج دھانی ایکسپریس میں ہوائی جہاز کا لطف آ رہا تھا اور میں زائد کرایہ ادا کر کے بھی خوش تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹرین کے کنڈیکٹر نے لاوڈ اسپیکر پر انگریزی اور ہندی میں اعلان کیا کہ راستے میں ٹرین ایکسیڈنٹ کی وجہ سے راج دھانی ایکسپریس چار گھنٹے لیٹ ہے۔ لہذا ٹرین دہلی دو بجے دوپہر کو پہنچے گی۔ اس کا مقررہ وقت صبح دس بجے تھا۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میں نے شمس الزمان کو اپنی دہلی آمد کی تاریخ اور وقت سے مطلع کر دیا تھا۔ اگر وہ مقررہ وقت پر اسٹشن پہنچ گا تو اسے کتنی پریشانی ہو گی، لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ خاموشی سے صبح کا اخبار اور رسالہ پڑھتا رہا۔ گزشتہ اسٹیشن سے ہی ہاکر ہندی، اردو، انگریزی کے تازہ اخبارات اور رسائل لے کر ٹرین پر سوار ہو چکا تھا۔ اور لوگ دھڑا دھڑ مختلف زبانوں کے اخبارات

اور رسائل خرید رہے تھے اس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستانی عوام اخبارات کے کتنے رسیا ہیں اور اگر ہندوستان میں پاکستان کی بہ نسبت زیادہ اخبارات شائع ہوتے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دوپہر ہو گئی اور ایک بجتے ہی دیٹر لنچ لے کر حاضر ہو گیا۔ شیڈول کے اعتبار سے راج دھان ایکسپریس کو صبح دس بجے دہلی اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ٹرین چونکہ لیٹ ہو گئی تھی اس لئے ریلوے کا فرض تھا کہ وہ اپنے مسافروں کو دوپہر کا کھانا بھی کھلائے۔ چنانچہ دیٹر نے بڑی عاجزی کے ساتھ اطلاع دی کہ "جو کچھ کھانا بچ گیا ہے وہ آپ لوگوں کو پیش کیا جارہا ہے۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

میں نے بخوشی دوپہر کا کھانا تناول کیا اور دل ہی دل میں انڈین ریلوے کی خوش انتظامی کو سراہا۔ راج دھانی ایکسپریس ٹھیک دو بجے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے آ کر لگ گئی۔

خلیق انجم

دہلی کے قیام کے دوران میں نے جن علاقوں کا خاص طور پر دورہ کیا۔ ان میں پرانی دہلی کے مسلمانوں کے محلے خاص طور پر چاندنی چوک بلیماراں" حویلی حسام الدین، گلی قاسم؟ان،لال کنواں؟ رودگراں، فراش خانہ، زینت محل، مٹیا محل، حویلی اعظم خاں، چرخے والاں، پھاٹک حبش خاں، بارہ دری اور کلاں محل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ محلے ہیں جہاں پہلے بھی مسلمان آباد تھے اور آج بھی مسلمان ہی آباد ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے وہاں مسلمان امرا اور روسا آباد تھے اور آج مسلمان غربا آباد ہیں یعنی ان محلوں مں اب صرف وہ مسلمان رہ گئے ہیں جو معاشی اعتبار سے قلاش ہیں۔ صاحب حیثیت مسلمان یا تو پاکستان ہجرت کر چکے ہیں یا نئی دلی کے "پوش" علاقوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستان، خصوصاً کراچی میں بھی ایسے محلے آباد ہیں جہاں صرف امرا رہتے ہیں مثلاً کلفٹن اور ڈیفنس سوسائٹی وغیرہ۔ کسی ددر میں پی ای سی ایچ سوسائٹی طبقہ امرا کے لئے مخصوص تھی، لیکن اب وہ محض کمرشل ایریا اور شاپنگ سنٹرز بن کررہ گئی ہے کراچی کے پرانے محلوں میں خداداد کالونی، اور پیر الٰہی بخش کالونی کسی زمانے میں ترک وطن کر کے آئے ہوئے مہاجروں کا "پوش" محلہ تھا جہاں اردو کے بڑے بڑے اور معروف ادیب، شاعر اور صحافی رہا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ پیر الٰہی بخش کالونی سے نارتھ ناظم آباد اور ڈیفنس سوسائٹی منتقل ہو چکے ہیں۔ یہی حال پرانی دلی کے مسلمان محلوں کا ہے۔ ان محلوں میں اگرچہ ہندوؤں اور سکھوں کی اچھی خاصی آبادی آکر بس چکی ہے لیکن یہ محلے مسلمان محلے ہی کہلاتے ہیں، چنانچہ دہلی میں جب بھی فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوتے ہیں۔ یہ مسلمان مرتے اور مار کھاتے ہیں۔ مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ اطمینان کے ساتھ "پوش" علاقوں میں چین کی بنسری بجاتا رہتا ہے انہی محلوں میں ایک محلہ کلاں محل بھی ہے۔ جہاں ڈاکٹر خلیق انجم رہتے ہیں۔

میں دہلی پہنچنے کے بعد جن لوگوں سے ملنے کا خواہش مند تھا ان میں خلیق انجم بھی شامل تھے۔ خلیق انجم سے میں پاکستان میں مل چکا تھا۔ جب وہ اپنی اہلیہ موہنی انجم اور اپنے بچوں کے ساتھ کراچی آئے تھے اور حسین ڈی سلوا ٹاؤن میں ٹھہرے تھے علاوہ ازیں میں اس سے قبل انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان، ہفت روزہ "ہماری زبان" میں کئی ماہ "پاکستان کی ادبی ڈائری" بھی لکھ چکا تھا۔ اس طرح ان سے میری پہلے سے شناسائی تھی۔ وہ اپنے نام کی طرح بڑے خلیق واقع ہوئے تھے اور ہر کسی سے نہایت خنداں پیشانی اور جوش و خروش سے ملتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سیاسی اور ادبی لحاظ سے بھی بہت سرگرم اور متحرک رہتے تھے۔ جنہیں صحیح معنوں میں ڈائنا مک کہا جا سکتا ہے۔ میں ان کے برتاؤ اور بے تکلفانہ انداز سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ میں جب دہلی پہنچا تو پہنچنے کے چند روز کے بعد ان سے ملا۔ ان کی خواہش تھی کہ دہلی کے قیام کے دوران میں دو چار روز ان کے ہاں بھی گزاروں چنانچہ میں جب کلکتے سے لوٹا تو اسٹیشن سے سیدھے اپنے سوٹ کیس کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے دفتر پہنچ گیا۔

میں نے اپنی آمد سے قبل انہیں کلکتے سے خط کے ذریعے اطلاع دے دی تھی۔ انجمن کا دفتر "اردو گھر" نئی دہلی کے وسط میں سینٹرل ٹیلی گراف آفس (سی ٹی او) کے قریب راؤز ایونیو پر واقع ہے اور کئی منزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی، دوسری اور چوتھی منزل کرائے پر دی گئی ہے اور تیسری منزل میں انجمن کا دفتر، کتب خانہ اور سماعت گاہ واقع ہے۔ انجمن کی عظیم الشان عمارت دیکھ کر میں واقعی بہت متاثر ہوا۔ انجمن ترقی اردو ہند کی عمارت انجمن ترقی اردو پاکستان کی عمارت سے کہیں زیادہ بہتر اور عالی شان تھی۔ مجھے یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ انجمن اپنی عمارت سے حاصل ہونے والے کرائے کے باعث مالی اعتبار سے نہ صرف خود کفیل ہے، بلکہ حکومت سے لڑ جھگڑ کر مالی امداد بھی حاصل کرتی رہتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ایک نہات فعال اور سرگرم عمل ادارہ ہے اور وہ حکومت کی لسانی پالیسی کے باعث اس کے خلاف تحریک بھی چلاتی رہتی ہے اور ساتھ ہی امداد بھی وصول کرتی رہتی ہے۔

یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم سیاسی اعتبار سے کانگرس (آئی) کے آدمی ہیں اور دہلی کانگرس کمیٹی کے سرگرم رکن بھی ہیں۔ اس کے باوجود وہ انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے حکومت کی اردو کے بارے میں پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کا مقصد حکومت پر جمہوری رائے عامہ کے ذریعے دباؤ ڈال کر اردو کے سلسلے میں حق

المقدور مراعات حاصل کرنا ہے اور وہ اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔

خلیق انجم مجھے اپنے ساتھ انجمن کے دفتر سے اپنے اسکوٹر پر لے کر سیدھے کلاں محل میں اپنے آبائی مکان پہنچے جو دریا گنج کے قریب پرانی دلی میں ایک پتلی سی گلی میں واقع تھا اور شکل و صورت اور بود باش سے مسلمانوں کا محلہ معلوم ہو رہا تھا۔ انہیں یہ گھر بہت عزیز تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے اس میں اپنا بچپن گزارا تھا۔ اور وہ یہیں پل کر جوان ہوئے تھے۔ ان کی والدہ کو یہ مکان بہت عزیز تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنا نیا مکان بنوانے کے باوجود اس گھر کو ابھی تک نہیں چھوڑا ہے۔ ان کا مکان اگرچہ پرانی طرز کا تھا۔ لیکن بہت کشادہ تھا۔ ایسا گھر کراچی میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے یہ گھر بہت پہلے تعمیر ہوا تھا۔ جب لوگوں نے کابوکوں کی طرح فلیٹ میں رہنا نہیں سیکھا تھا۔ میں جب خلیق انجم کے ساتھ وہاں پہنچا تو موہنی بھابی کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ رات کے کھانے پر رحمان نیر ان کی اہلیہ شمع افروز زیدی اور بیگم ساغر نظامی مدعو تھیں، جو اپنے دور کی مشہور مصنفہ تھیں اور ان کے مضامین ماہنامہ "ایشیا" بمبئی میں بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ رات کے کھانے پر بھابی نے چینی کھانا بنایا تھا جو بہت ہی لذیذ تھا۔

خلیق انجم نے سب سے پہلے بھابی اور بچوں سے میرا تعارف کرایا۔ جن سے میں پہلے ہی پاکستان میں مل چکا تھا، اس روز رات کے کھانے پر جو مہمان تشریف لائے اور ان سے جو گفتگو ہوئی، اس سے اندازہ ہوا کہ خلیق انجم صرف سیاسی اور ادبی سرگرمیوں سے ہی دلچسپی نہیں رکھتے، وہ سماجی اور فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مجھے ان کی سرگرمیاں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ شخص کس قدر فعال اور متحرک ہے۔ خلیق انجم کی طرح بھابی موہنی بھی بڑی فعال نظر آئیں۔ اس کا اندازہ میرے تین روز کے قیام سے بخوبی ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے نیند سے بیدار ہونے سے قبل وہ تقریباً پانچ بجے صبح بیدار ہو جاتی ہیں اور اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر جوگنگ کے لئے نکل جاتی ہیں اور تقریباً دو ڈھائی میل پیدل چلنے کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک واپس آجاتی ہیں۔ اور آتے ہی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ گھر میں اگرچہ ایک ملازم بھی ہے لیکن کھانا پکانے کا کام وہ خود انجام دیتی ہیں، خصوصاً ناشتہ اور رات کے لئے کھانا پکانے کا کام۔ اس کے بعد وہ بچوں کو اسکول بھیج دیتی ہیں۔ اور خود کالج روانہ ہو جاتی ہیں۔ شام کو واپس آنے کے بعد پھر کھانا پکانے میں لگ جاتی ہیں۔ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ تمام گھریلو ذمے داریاں نبھانے کے بعد وہ پڑھتی بھی ہیں اور لکھتی بھی ہیں۔ صرف مضامین ہی نہیں کتابیں بھی۔ ان کا مضمون سوشیالوجی

ہونے کے باعث وہ اپنے موضوع سے متعلق انگریزی جرائد کے لئے مضامین بھی لکھتی ہیں اور سیمیناروں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔ انہوں نے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی عورتوں کے مسائل کے بارے میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں وہ سماجی اور سیاسی جلسے، جلوس اور مذاکرات میں بھی شریک ہوتی ہیں۔ وہ یہ سارا کام انجام دینے میں کس طرح کامیاب ہوتی ہیں؟ یہ ناقابل فہم ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ سارا کام انجام دینے میں اس لئے کامیاب رہتی ہیں کہ ان کی زندگی شیڈول اور قطعی ضبط و نظم کی پابند ہے اور اس میں انہیں خلیق انجم کا مکمل تعاون حاصل ہے۔ دونوں میاں بیوی مختلف ذوق کے حامل ہونے اور دونوں کی سرگرمیاں مختلف ہونے کے باوجود ان میں کامل افہام و تفہیم ہے۔

خلیق انجم، انجمن ترقی اردو کا سیکرٹری جنرل ہونے کے ناطے کانفرنسوں اور مذاکروں کے سلسلے میں سال بھر ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے رہتے ہیں، لیکن جب گرمیوں کی تعطیل ہوتی ہے اور بچوں کا اسکول اور بھابی کا کالج بند رہتا ہے تو وہ گرمی کا مہینہ اہل خانہ کے ساتھ دہلی سے باہر گزارتے ہیں اور کسی کو اس کی اطلاع نہیں دیتے ہیں، تاکہ وہ سارا وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزار سکیں اور ادبی اور علمی سرگرمیوں سے دور رہیں۔ وہ اور بھابی گرمی کی چھٹیوں میں عموماً کسی ہل اسٹیشن، مثلاً شملہ، میسوری یا کشمیر ضرور جاتے ہیں۔ اس دفعہ وہ مع اہل و عیال حیدر آباد جانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور اس کے لئے بہت پہلے سے ٹرین کی نشستیں بک کروالی تھیں۔

خلیق انجم خاص دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کا بچپن اور لڑکپن پرانی دہلی کی گلیوں میں کھیلتے اور پڑھتے ہوئے گزرا، اس اعتبار سے انہیں خالص "دلی وال" کہا جا سکتا ہے۔ خلیق انجم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ بہت دلچسپ ہے۔ مثلاً کہ یہ ان کا اصل نام خلیق احمد خاں ہے اور والد کا نام محمد احمد خاں۔ ان کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت، مشہور مصنف اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اسلم پرویز کے مشورے سے انہوں نے اپنا نام خلیق انجم رکھا۔ وہ 22 دسمبر 1935ء کو دلی میں پیدا ہوئے ابتدائی اور ثانوی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ 1954ء میں علی گڑھ سے بی اے اور 1957ء میں دہلی سے اردو میں ایم اے کیا۔ علاوہ ازیں لائبریری سائنس اور لسانیات میں ڈپلوما بھی لیا۔ اس کے بعد 1962ء میں مرزا مظہر خاں جاناں پر ڈاکٹریٹ کیا۔ وہ 1957ء میں دہلی کے کروڑی مل کالج سے بطور لیکچرر وابستہ ہو گئے اور وہاں 72ء تک پڑھایا۔ 72ء میں وہ وزارت تعلیمات میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات مقرر ہوئے اور 1975ء میں اس سے علیحدہ ہو کر انجمن ترقی اردو کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔

بعد میں وہ پروفیسر کے گریڈ میں اس کے تنخواہ دار سیکرٹری منتخب ہوئے۔

خلیق انجم نے بتایا کہ ان کے دادھیال میں دور دور تک شعروادب سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ پڑھنے پڑھانے کی روایت ابا اور چچا کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا پیشہ اگرچہ غالب کی طرح سپہ گری تھا، لیکن دادا جان نے وقت کی نزاکتوں کے پیش نظر تلوار چھوڑ کر قلم تھام لیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ والد صاحب لوکو موٹیو انجینئر بن گئے۔ ان کے نانا پروفیسر عزیز الرحمان بڑے باذوق واقع ہوئے تھے وہ انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے اور ان کا لال قلعہ میں بھی آنا جانا تھا وہ ایک زمانے میں اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے اردو کی تدریس کے لئے انگریزی میں کتاب بھی لکھی تھی اور اردو شعرا کے اشعار کو مضوع دار ڈکشنری کے طرز پر مرتب بھی کیا تھا۔ خلیق انجم دو یا تین سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اس کے بعد ان کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی حالت بہت بگڑ گئی اور کئی کئی وقت کے فاقے پڑنے لگے۔ ان کی والدہ نے سلائی کڑھائی کا کام کر کے نہ صرف گھر کا خرچ چلایا بلکہ انہیں اعلیٰ تعلیم بھی دلائی یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد کلاں محل میں واقع اپنے آبائی گھر کو نہیں چھوڑا اور شادی کے بعد بھی وہاں رہنا پسند کیا۔

خلیق انجم میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کے اسکول کے استاد رہبر پرتاپ گڑھی کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ روایتی طرز کے استاد تھے اور پڑھانے کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ خلیق انجم اور ان کے استاد رہبر میں وہی رشتہ تھا جو باپ بیٹے میں ہوتا ہے۔ ان کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں فرقت کاکوروی، شمیم کرمانی اور ان کے دوستوں کا بھی ہاتھ ہے۔ ان کے لڑکپن کے دوست اسلم پرویز نے بھی انہیں بنانے میں حصہ لیا ہے۔ وہ جب دسویں جماعت میں تھے اس وقت ترقی پسندوں کے زیر اثر آئے اور کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں ان پر احتشام حسین، سجاد ظہیر اور ہنس راج رہبر کا بڑا اثر تھا، چنانچہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا کام کرتے رہے لیکن انہوں نے جب دیکھا کہ عام کارکن تو قربانیاں دیتے رہتے ہیں اور لیڈر عیش کرتے ہیں، تو وہ کمیونسٹ پارٹی سے متنفر ہو گئے۔ پھر وہ اندرا کانگرس میں شامل ہو گئے۔ 1972ء کے عام انتخابات میں انہیں اندرا کانگرس کی جانب سے ٹکٹ ملا اور وہ دہلی کے مسلمان محلے سے کھڑے ہوئے، لیکن اس سے ایک سال قبل چونکہ انڈیا نے مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر کے پاکستان کو توڑ دیا تھا اور جس کی وجہ سے ہندوستانی

مسلمان کانگریس سے سخت ناراض تھے،اس لئے دہلی کے مسلمانوں نے خلیق انجم کو ووٹ نہیں دیااور وہ بری طرح ہار گئے۔

خلیق انجم کی موہنی بھابی سے شادی 1969ء میں عجیب و غریب انداز میں ہوئی۔ موہنی بھابی کا اصل نام موہنی راجا ہے اور وہ پنجاب کی رہنے والی ہیں خلیق انجم ان دنوں کروڑی مل کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا مضمون یوں تو اردو تھا، لیکن وہ ضرورت پڑنے پر دوسرے مضامین بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ موہنی بھابی ان دنوں سوشیالوجی میں ایم اے کر رہی تھیں۔ کسی وجہ سے سوشیالوجی کے ٹیچر طویل رخصت پر گئے ہوئے تھے اور سوشیالوجی کے طلبار کو پڑھانا خلیق انجم کے ذمے لگ گیا تھا۔ کلاس میں موہنی بھابی نہ صرف سب سے جاذب نظر تھیں، بلکہ غیر معمولی طور پر ذہین بھی تھیں پہلے تو خلیق انجم نے طور طریقے اور بات چیت کے انداز سے انہیں مسلمان سمجھا لیکن بہت دنوں کے بعد انہیں جب اصلیت کا علم ہوا تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی اور عشق کے امتحان گزر چکے تھے۔ حسب معمول ہندوستانی فلموں کی طرح ظالم سماج دونوں کے درمیان حائل ہو گیا لیکن دونوں نے بالآخر ظالم سماج کو شکست دے دی اب ان کی دو بچے ہیں ثمر انجم نو سال کا اور سیما انجم پندرہ سال کی۔ خلیق انجم اور موہنی بھابی سیکولر جمہوریت کے قائل ہیں۔ اس لئے ہندوستان میں سیکولرازم ہو یا نہ ہو ان کے گھر میں سیکولرازم ضرور ہے۔

ترقی اردو بیورو

میں نے دہلی پہنچتے ہی اپنے دوست شمس الزمان سے کہا کہ "بھئی، ترقی اردو بیورو کی بڑی تعریف سنی ہے۔ دلی کے قیام کے دوران وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ سنا ہے اس ادارے نے بڑی عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ مجھے ان میں سے بعض کتابوں کی ضرورت ہے۔

شمس الزماں، جو دلی کے قیام کے دوران میرے لئے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس پر آمادہ ہو گیا اور ایک روز اپنی کار پر نہ جانے کن کن راستوں سے گزرتا ہوا آر کے پورم پہنچ گیا۔ دہلی اتنا بڑا شہر ہے کہ اس کے جغرافیئے کو ذہن نشیں کرنا بہت مشکل ہے، خصوصاً میری طرح اجنبی شخص کے لئے، جو موٹر کاریں سر سپاٹے کر رہا ہو، کسی نئے شہر کو پہچاننے کا بہترین طریقہ پیدل سفر ہے، لیکن دہلی جیسے وسیع و عریض شہر میں پیدل چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے موٹر کی سواری ضروری تھی۔

شمس الزماں نے ترقی اردو بیورو جانے سے قبل اس کے دفتر کے سامنے کار روک لی اور مجھے ایک مدراسی ہوٹل میں لے کر داخل ہوا، تاکہ وہ لنچ میں مدراسی ڈش سے میری خاطر تواضع کرے۔ مدراسی کھانے میں ایڈلی اور ڈوسا بہت مشہور ہے۔ یہ جنوبی ہند کے لوگوں کا بہت ہی پسندیدہ کھانا ہے اور بہت ہی مشہور بھی، جنوبی ہند کا کلچر، شمالی ہند سے کس قدر مختلف ہے۔ اس کا اندازہ جنوبی ہند کے کھانے سے ہوتا ہے۔ شمالی ہند کے لوگ سرسوں کے تیل میں کھانا پکاتے ہیں، جبکہ جنوبی ہند کے لوگ ناریل کے تیل میں اور پھر دونوں کا ذائقہ بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتا ہے میں کلکتے میں تھا تو وہاں گاہے گاہے ایڈلی ڈوسا سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد اس لذیذ کھانے سے محروم تھا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں ترقی اردو بیورو کے دفتر پہنچے۔

بیورو کی ڈائریکٹر محترمہ فہمیدہ بیگم نے ہمارا خیر مقدم کیا اور بیورو کے بارے میں تفصیلی

علومات فراہم کی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ان سے قبل ڈاکٹر شارب ردولوی اور شمس الرحمان فاروقی یورد کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں، لیکن میں فہمیدہ بیگم کے بارے میں (خصوصاً ان کے ادبی کیریر کے رے میں) زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے بہت ہی ہوشیاری کے ساتھ ن کے ادبی کوائف معلوم کرنے کی کوشش کی، تاکہ انہیں میری ناواقفیت ناگوار نہ گزرے اور مجھے ماری معلومات بھی حاصل ہو جائے۔ فہمیدہ بیگم نے نہایت انکساری کے ساتھ اپنے بارے میں یکے بعد دیگرے معلومات فراہم کرنا شروع کیں۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جنوبی ہند میں لکھی جانے والی ردو مثنویوں پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے جن کے بارے میں شمالی ہند کے اہل ادب حیٰ کہ ادبی مورخوں تک کو بہت کم معلوم ہے۔ فہمیدہ بیگم صاحبہ کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔ اس کا اندازہ ان کے لہجے سے ہو رہا تھا۔ یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا جس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ان کی اور بھی بہت سی تصانیف ہیں جن کے نام میرے ذہن سے اتر گئے ہیں۔ سب سے خوشی کی بات یہ تھی کہ ترقی اردو بیورو میں ایک ایسی شخصیت اعلیٰ ترین عہدے پر فائز تھی جو خود بھی مصنفہ تھی اور ادبی برادری سے تعلق رکھتی تھی۔ پاکستان کی طرح اس قسم کے عہدے پر فائز ہونے کے لئے صرف بیورو کریٹ ہونا کافی نہ تھا۔ پاکستان میں نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے اداروں میں بہت کم کسی ادیب کو فائز کیا گیا۔ ابن انشا واحد مصنف تھے جو نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ اس کے بعد کسی ادیب کو یہ عہدہ نصیب نہ ہوا (بہت بعد میں فہمیدہ ریاض چند مہینوں کے لئے اس کی ڈائریکٹر جنرل ہوئیں)

ہندوستان میں حکومت اردو کے ضمن میں مخلص ہو یا نہ ہو اور وہ اسے اس کا جائز مقام دینے پر آمادہ ہو یا نہ ہو، لیکن اس نے اردو دان طبقے کی اشک شوئی کے لئے سہی وفاقی وزارت تعلیم کے تحت ترقی اردو بیورو جیسا زبردست علمی ادارہ قائم کر دیا ہے۔ جس کا اولین مقصد اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سائنسی اور درسی کتب تیار کرنا ہے۔ 1969ء میں ملک کے مشہور اہل قلم اور دانشوروں کی رائے سے ترقی اردو بیورو کا قیام مرکزی وزارت تعلیم کے تحت عمل میں آیا۔ اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے نامور اور ادیب، دانشور، پروفیسر اور مختلف علوم و فنون کے ماہر اس بورڈ کے ممبر نامزد کئے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد عوام کو ان کی اپنی زبان کے ذریعہ سائنسی، تکنیکی اور سبھی جدید علوم کی معلومات فراہم کرنا ہے۔ اس ادارے کو قائم ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اردو کے معروف ادیب پروفیسر ایم مجیب اور سکندر علی وجد اس کے نائب

صدر رہ چکے ہیں۔ بیورو نے اب تک مختلف علوم و موضوعات پر ساڑھے چار سو سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں اور تقریباً پانچ سو کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ بیورو نے آندھرا پردیش کی نصابی کتابیں اور کونسل آف ریسرچ اینڈ ٹریننگ کی نصابی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

اس ادارے کی مرتب کردہ کتابوں میں سب سے اہم کتابیں وضع اصطلاحات۔ اردو انسائیکلو پیڈیا۔ لغات (اردو، اردو لغت، انگریزی اردو لغت اور اردو انگریزی لغت) شامل ہیں۔ وضع اصطلاحات اس ادارے کی بہت اہم تصنیف ہے۔ اس لئے کہ مناسب اصطلاحات کے بغیر کسی بھی علم کے بارے میں کتاب لکھنا یا ترجمہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر بیورو نے وضع اصطلاحات کی کئی کمیٹیاں مقرر کی ہیں جو کیمیا، حیوانات، السانیات، معاشیات، زراعت، نباتیات، کامرس، تعلیم، فلسفہ، نفسیات، ارضیات تاریخ و سیاسیات، ریاضی، طبیعیات، سماجیات، لسانیات اور لائبریری سائنس کے بارے میں اصطلاحات کی فرہنگیں تیار کر رہی ہیں۔

محترمہ فہمیدہ بیگم نے ناچیز کو اپنے ادارے کی کئی کتابیں بھی عنایت کیں۔

شہاب جعفری

شہاب جعفری سے دہلی میں میری عجیب و غریب انداز میں ملاقات ہوئی۔ میں کلکتے سے واپسی میں چند روز دہلی میں اپنے بے تکلف دوست شمس الزماں کے ہاں ٹھہرا تھا۔ جس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے دہلی میں تنہا گھومنے اور سیر کرنے کا موقع ملا اور آزادی کے ساتھ جہاں جی چاہا جانے اور جب جی چاہے گھر لوٹنے کا موقع ملا۔ شمس اپنے کاموں میں مصروف رہتا اور میں تنہا دہلی کی سیر کرتا رہتا۔ ہم دونوں میں رات کے آٹھ نو بجے کے بعد ملاقات ہوتی، دوسرے دوستوں کے گھر پر رہنے سے ایک اخلاقی پابندی یہ ہوتی تھی کہ میں رات سات آٹھ بجے ہی گھروں میں بند ہو جاتا تھا اور آزادانہ موومنٹ ختم ہو جاتی تھی۔

ایک دن میں شام کو تنہا سیر کرتا ہوا غالب اکیڈیمی کی جانب نکل گیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں کسی غیر معروف سے ادبی ادارے کی جانب سے یوم اقبال کے موقع پر کوئی رسمی سا جلسہ ہو رہا ہے۔ میں قدرے تاخیر سے پہنچا تھا۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ میں پہلی صف میں خالی جگہ پا کر خاموشی سے بیٹھ گیا اور جلسے کی کارروائی دیکھتا رہا۔ اچانک مائیکروفون پر میرے نام کا اعلان ہوا اور درخواست کی گئی کہ میں ڈائس پر آجاؤں اور مہمانان خصوصی کی نشست پر بیٹھوں۔ معلن کوئی غیر معروف اور میرے لئے قطعی اجنبی تھے اور وہ تھے کہ حاضرین کو میرے بارے میں تفصیل بتا رہے تھے کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور میری کون کون سی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے دہلی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ "دہلی والے" سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں مجھے بحیثیت مہمان خصوصی دیکھ لیا تھا اور میرے بارے میں ساری معلومات وہیں سے اکٹھی کر لی تھیں۔ مائیک پر اعلان کے بعد میرے لئے ممکن نہ تھا کہ میں اپنی نشست پر بیٹھا رہتا بادل ناخواستہ میں اسٹیج پر جا کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ میرے علاوہ اور بھی بہت سے "مہمانان خصوصی" اسٹیج پر رونق افروز تھے۔ اتفاق سے میں ان میں سے کسی سے بھی صورتاً ناآشنا تھا اور سامعین میں بھی کوئی

معروف یا شناسا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اگرچہ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں آئے دن اس نوع کے ادبی اور ثقافتی جلسے اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں آخر کوئی کہاں تک ان محفلوں میں شرکت کرے۔ سامعین اور مقررین میں کسی معروف شخصیت کو نہ پاکر میں دل ہی دل میں بڑا مایوس ہوا۔

مقررین اسٹیج پر آتے رہے اور علامہ اقبال کو رسمی انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے کہ اچانک مائک پر شہاب جعفری کے نام کا اعلان ہوا۔ میں چونکا اور حیرت سے شہاب جعفری کی جانب دیکھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جس کے نام سے میں واقف ہوں۔ میں نے انہیں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ اسٹیج پر تشریف فرما ہیں اگر ان کا نام نہ پکارا جاتا تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ شہاب میرے اتنے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔

شہاب جعفری سے میری گذشتہ پچیس سال سے خط و کتابت تھی۔ جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شہریار کے ساتھ ایم اے کے آخری سال میں تھے۔ ہم دونوں اگرچہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے لیکن ہمارے درمیان خطوط کا عرصہ تک تبادلہ جاری رہا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک ہفت روزہ "آثار" (کلکتہ) بند نہیں ہو گیا۔ جس سے میں پہلے شمارے سے آخری شمارے تک وابستہ تھا اور شہاب جعفری، شہریار، خلیل الرحمان اعظمی اور ڈاکٹر محمد حسن سے اسی ہفت روزہ کے وسیلے سے مراسم قائم ہوئے اور میں ان سے مضامین اور نظمیں اور غزلیں منگوا کر "آثار" میں شائع کرتا رہا، یہ شہاب جعفری کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس وقت وہ اور شہریار خوب کہہ رہے تھے اور اردو کا شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو گا جس میں شہاب جعفری اور شہریار تواتر کے ساتھ شائع نہ ہو رہے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اتنے عرصے تک خط و کتابت رہنے کے باوجود میں نے ان کی تصویر کبھی نہیں دیکھی (اگر دیکھتا تو میں انہیں فوراً پہچان لیتا) "آثار" بند ہونے کے بعد میں 1946ء میں مشرقی پاکستان چلا گیا اور اس طرح ہندوستانی ادیبوں سے تقریباً دس پندرہ سال تک خط و کتابت قطعاً منقطع رہی۔ اس دوران شہاب جعفری ادبی رسالوں سے تقریباً غائب ہو گئے اور یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں۔ ایک بار مرحوم احمد جمال پاشا سے ان کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہوا تھا۔ جس کے بارے میں معاصر نقادوں نے کچھ ایسی آرا کا اظہار کیا کہ جس سے بددل ہو کر انہوں نے شاعری تقریباً ترک کر دی

تھی۔ ایسے شخص کو اتنی مدت کے بعد اپنے اتنے قریب پاکر اس سے ملنا اور اس کے لئے جلسے کے اختتام تک انتظار کرنا مجھ سے نہ ہوا، لہذا میں آداب محفل کو توڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان سے اپنا تعارف کرایا اور ان سے تفصیلی ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ "میں تھوڑی دیر میں اٹھنے والا ہوں آپ بھی خاموشی سے میرے ساتھ باہر نکل آیئے۔"

میں نے جلسہ گاہ سے فرار کے لئے موقع کو غنیمت جانا اور شہاب جعفری کے ہال سے باہر نکلتے ہی میں بھی خاموشی سے باہر نکل آیا اور ہم دونوں پیدل روانہ ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ تھوڑی دیر میں ان کا لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروگرام "اردو کی کہانی، اردو کی زبانی" قریب ہی میدان میں شروع ہونے والا ہے۔ میں یہ پروگرام ضرور دیکھوں۔ اس لئے کہ اس کی اسکرپٹ اور اس کے نغمے انہوں نے ہی تحریر کئے ہیں۔ میں دہلی کے اخبارات میں لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروگرام کے بارے میں اشتہار پڑھ چکا تھا اور اس کے بارے میں تبصرے نظر(ل) سے گزر چکے تھے، لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کس قسم کا آرٹ فارم یا ذریعہ اظہار ہے۔ میں نے جب تک اسے نہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔

لائٹ اینڈ ساؤنڈ دراصل ایک بالکل نیا آرٹ فارم ہے جسے الفاظ کے ذریعے بیان کرنے کے بجائے خود دیکھ کر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ الفاظ میں یہ سمجھئے کہ اس کے لئے ایک بہت بڑے میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں روشنی اور صوتی آلات کے ذریعے متعدد اسٹیج تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ شو صرف رات کے وقت ہی ہو سکتا ہے۔ جب ہر جانب اندھیرا چھا چکا ہو۔ تماشائی کھلے آسمان کے نیچے ایک مخصوص جگہ پر اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہوں۔ یہ اسٹیج سامعین کی نشستوں سے بیس گز سے لے کر پچیس، تیس اور بعض اوقات پچاس گز کے فاصلے پر تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ جب ایک اسٹیج کی بتیاں روشن ہوتی ہیں تو دوسرے تمام اسٹیجوں کی بتیاں گل رہتی ہیں، مثلاً کہانی کا آغاز ایک نمبر اسٹیج سے ہوتا ہے (جو بیس گز کے فاصلے پر واقع ہے) اس کے بعد ایک نمبر اسٹیج کی بتیاں گل ہوتے ہی دو نمبر اسٹیج کی بتیاں روشن ہو جاتی ہیں (جو تیس گز کے فاصلے پر واقع ہے) اس طرح یکے بعد دیگرے اسٹیج کے بدلتے ہی سین اور ڈرامے کا ماحول بھی بدل جاتا ہے۔ دو ممبر اسٹیج کا کام ختم ہوتے ہی تین نمبر اسٹیج کی بتیاں روشن ہو جاتی ہیں (جو پینتیس گز کے فاصلے پر واقع ہے) اس طرح بالترتیب اسٹیج نمبر چار اور اسٹیج نمبر پانچ پر کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران اسٹیج نمبر ایک اور اسٹیج نمبر دو کو اپنا منظر اور ساز و سامان تبدیل کرنے کا موقع مل

جاتا ہے۔

لائٹ اینڈ ساؤنڈ میں مکالمے سے زیادہ نغمے، رقص اور پس پردہ کمنٹری سے کام لیا جاتا ہے۔ زیر بحث پروگرام میں اردو زبان کی پیدائش، اس کے ارتقااور اس کی عہد بہ عہد ترقی کو دکھانا مقصود تھا۔ اس لئے پوری کہانی اردو کی زبانی بیان کی گئی تھی یعنی اردو کس طرح برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کے ذریعے مشترکہ تہذیب کے نتیجے میں وجود میں آئی اور کبیر اور غالب کے دور سے ترقی کرتی ہوئی موجودہ عہد تک پہنچی۔ ساری باتیں رقص، نغموں اور بیانیہ کے ذریعے دکھائی گئیں اور اس قدر متاثر کن انداز میں دکھائی گئیں کہ میں حیران رہ گیااور اس آرٹ فارم کے متاثر کن اور اس کے نہایت موثر ہونے کا قائل ہو گیا۔ یہ ایک ایسا آرٹ فارم ہے جس میں صرف بڑے موضوعات ہی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مہا بھارت۔ راماین یا گوتم بودھ کی زندگی اور تعلیمات یا پھر جنگ آزادی کی کہانی۔ شہاب جعفری نے بلاشبہ اردو زبان کی تاریخ اس پیرائے میں عوام الناس کے سامنے پیش کر کے کمال کر دکھایا تھا۔ سنا ہے ہندوستان میں یہ آرٹ فارم بہت مقبول ہو رہا ہے اور حکومت ہند کے محکمہ سیاحت و ثقافت کی جانب سے روز لال قلعے میں لائٹ اینڈ ساونڈ پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔

اے دہلی الوداع

دلی سے روانگی میں صرف ایک روز باقی رہ گیا تھا اور میں قدیم دہلی کو آخری بار تنہا اور بھرپور انداز میں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں صبح سویرے تنہا نکل گیا اور رکشا یا ٹیکسی کے بجائے دہلی کو پیدل گھوم پھر کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل کسی شہر کو قریب سے دیکھنا اور اسے "محسوس" کرنا مقصود ہو تو شہر کی گلی کوچوں میں پیدل گشت کرنا چاہیے، چنانچہ میں سب سے پہلے کشمیری دروازہ پہنچا اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ قدیم دہلی دراصل دروازوں اور کھڑکیوں کا شہر ہے۔ اس لئے کہ زمانہ قدیم میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لئے شہر دیواروں کے اندر تعمیر کا جاتا تھا یا پھر شہر کے ارد گرد بلند و بالا دیواریں تعمیر کر دی جاتی تھیں۔ یہ زمانہ قدیم کا دستور تھا۔ اور ہر ملک میں رائج تھا۔ اسی سے "شہر پناہ" اور "فصیل شہر" وغیرہ کی اصطلاحات عام ہوئیں، چنانچہ قدیم دہلی فصیل کے اندر واقع تھی اور فصیل کے باہر جو کچھ بھی تھا وہ خواہ کچھ بھی ہو، دہلی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ دور تک صرف ان لوگوں کو اہل دہلی یا دہلی وال کہا جاتا تھا جو فصیل کے اندر آباد تھے، چنانچہ اس چاردیواری سے باہر آنے کے لئے بڑے بڑے بلند و بالا دروازے اور کھڑکیاں تھیں اور باہر سے رابطے کا صرف یہی ذریعہ تھیں۔ دہلی کی طرح اس کے دروازے بھی بہت قدیم ہیں۔ جب شہر بن کر تیار ہو گیا تو شاہجہاں کے حکم سے شہر کے ارد گرد اونچی اونچی فصیلیں تعمیر کی گئیں اور اس میں بڑے بڑے دروازے لگا دیئے گئے شاہجہان کے دور میں اصل شہر آج کی بہ نسبت بہت چھوٹا تھا۔ جسے پرانی دہلی کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام شاہجہاں آباد ہے۔ اسے شاہجہاں نے ہی آباد کیا تھا۔ شاہجہاں آباد دہلی کے اس حصے کا نام ہے جو اجمیری دروازے ترکمان دروازے، دلی دوازے راج گھاٹ دروازے، کلکتہ دروازے، کشمیری دروازے، مودی دروازہ کابلی دروازے اور لاہوری دروازے کے اندر واقع ہے۔

میں نے دہلی کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے ان

دوازوں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ جس کا کسی زمانے میں بڑا شہرہ تھا، لیکن مجھے صرف چند دروازے ملے۔ باقی ماندہ دروازے زمانہ کے ہاتھوں ڈھے چکے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنی تصنیف "آثار اصنادید" میں دہلی کے تیرہ دروازوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تیرہ دروازوں کے نام یہ ہیں۔ 1 دہلی دروازہ، 2 راج گھاٹ دروازہ، 3 خضری دروازہ، 4 نگمبودھ دروازہ، 5 کیلا کے گھاٹ کا دروازہ (بعد میں شاید یہی دروازہ کلکتہ دروازہ کے نام سے مشہور ہوا) 6 لال دروازہ، 7 کشمیری دروازہ، 8 بدر دروازہ، 9 کابلی دروازہ، 10 پتھر گھٹی دروازہ، 11 لاہوری دروازہ، 12 اجمیری دروازہ اور 13 ترکمان دروازہ۔

میں جس دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کشمیری دروازہ تھا اور یہ دہلی کا واحد دروازہ تھا جس سے ابھی تک آمدورفت جاری تھی۔ دوسرے دروازے بس نام کے لئے رہ گئے تھے اور ان سے آمدورفت بند تھی۔ شمال مغربی فصیل میں یہ دروازہ آج بھی بہت مضبوط اور بڑا ہے۔ یہ دروازہ دراصل دو درے ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ ی ہے کہ اس کا رخ کشمیر کی جانب ہے۔ زمانہ قدیم میں شاید لوگ اسی دروازے سے کشمیر آتے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کا نام کشمیری دروازہ پڑ گیا تھا۔ آج کل یہ دروازہ شہر کی یونیورسٹی، اولڈ سکریٹریٹ، منکاف ہاؤس وغیرہ سے ملانے کا واحد ذریعہ ہے۔

میں گشت لگاتا ہوا موری گیٹ کے سامنے پہنچ گیا جو کشمیری دروازے سے تھوڑی دور پر واقع ہے۔ اس دروازے کے محراب وغیرہ تباہ ہو چکے ہیں۔ صرف دونوں طرف کی فصیلیں باقی رہ گئی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی دروازہ بھی تھا۔ فصیل کافی چوڑی ہے۔ موری گیٹ کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہے کہ یہاں شہر بھر کا نالہ اور گندہ پانی آکر گرتا تھا۔ یہ بات اس لئے بھی قرین قیاس ہے کہ اس کے پیچھے دہلی کے قدیم محلے اور نالے وغیرہ واقع ہیں۔ لاکھ تلاش کرنے کے باوجود کابلی دوازہ کہیں نہ ملا۔ بعد میں شہر دہلی کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ کابلی دروازہ اور اس سے متصل تمام فصیلوں کو ریلوے لائن بچھانے کے لئے ڈھا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سی تاریخی نوعیت کی حامل عمارتیں بھی ڈھا دی گئی ہیں، جن میں نواب زیب النسا بیگم (متوفی 1757) کا مقبرہ بھی تھا۔ جس کا آج نام و نشان تک نہیں رہا۔ اب اس تاریخی دروازے کے قریب "مٹھائی کا پل" واقع ہے۔ اس پل کا نام مٹھائی کا پل کس طرح پڑا؟ وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

اسی طرح لاہوری دروازہ بھی اپنا وجود کھو چکا ہے، لیکن اتفاق سے اس کا نام باقی ہے۔ اجمیری دروازہ ابھی تک موجود ہے، البتہ اس کی فصیل چند سال قبل ڈھا دی گئی ہے اور اس کی جگہ نئی نئی شاندار عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں اور بڑی بڑی کمپنیوں کے دفاتر اسی جگہ واقع ہیں۔ اس دروازے کی اس لئے بھی تاریخی اہمیت ہے کہ اس کے باہر نواب غازی الدین بہادر کا وہ مشہور و معروف مدرسہ قائم تھا۔ جس نے آگے چل کر دہلی کالج اور اینگلو عربک اسکول کی شکل اختیار کر لی۔ یہ وہ مدرسہ تھا جس میں قدیم زمانے میں دہلی کے شرفا اور روسا کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ راستہ چونکہ اجمیر کی جانب جاتا ہے اسی لئے اس کا نام اجمیری دروازہ رکھ دیا گیا تھا۔ ان دنوں وہاں پولیس لائن واقع ہے اور راستے کے لئے دروازے کے ارد گرد فصیل کاٹ دی گئی ہے اس دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے حوض قاضی ملتا ہے اور دونوں جانب قدیم محلے آباد ہیں ترکمان دروازہ جنوب مغربی فصیل میں واقع ہے۔ اس کے قریب ہی شاہ ترکمان کا مزار ہے۔ اسی لئے اس کا نام ترکمان دروازہ پڑ گیا ہے۔ اس کے پیچھے رضیہ سلطانہ کا مقبرہ اور دہلی کی مشہور کالی مسجد ہے۔ اس کی فصیل ٹوٹ جانے کے باعث دروازہ برا لگتا ہے۔ دہلی دروازہ جنوب کی طرف واقع ہے اور بہت ہی بڑا اور مضبوط ہے یہ دروازہ چونکہ بہت بڑا ہے۔ اس لئے اس کا نام دہلی دروازہ رکھ دیا گیا ہے دروازہ سادے اور معمولی پتھر کا ہے لیکن بہت مضبوط ہے اس لئے آج بھی سربلند کئے کھڑا ہے اس کے نیچے سے جو مشہور و معروف سڑک گزرتی ہے اس کا زمانہ قدیم میں ٹھنڈی سڑک نام تھا لیکن اب یہ مشہور و معروف دریا گنج ہے اور یہی سڑک سیدھی کشمیری دروازے کو گئی ہے اور اس کے باہر کی سڑک بستی نظام الدین کو جاتی ہے اس دروازے کی مشرق کی جانب فصیل ابھی تک باقی ہے، لیکن ایشیائی گیمز کے انعقاد کے وقت سڑک کی توسیع کے لئے اس کا کچھ حصہ ڈھا دیا گیا ہے۔

میں گھوم پھر کر پھر کشمیری دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور ایک سو اٹھائیس سال قبل کی دہلی کے بارے میں سوچنے لگا جب پہلی جنگ آزادی چھڑی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں اچانک آج سے ایک سو بیس سال قبل کی دہلی میں پہنچ گیا ہوں

11 مئی 1857ء کا دن ہے۔ صبح ہوتے ہی گلیوں اور بازاروں میں آمد و رفت شروع ہو چکی ہے۔ دفتر کھل گئے ہیں۔ عدالتیں لگ گئی ہیں۔ اچانک شہر میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔ سہمے ہوئے چوکیدار اپنے افسروں کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے میرٹھ والی سڑک پر بہت سے گھوڑ سواروں کو سر

پٹ دوڑتے دئے دیکھا ہے راج گھاٹ دروازے کا چوکیدار دوڑتا ہوا آرہا ہے اور ہراساں آواز میں بتا رہا ہے کہ کچھ دیسی سوار فصیل تک پہنچ گئے ہیں۔ باقی لشکر پیچھے آرہا ہے۔ جمنا کے پاٹ پر پھیلا ہوا کشتیوں کا پل دیسی سواروں کے بوجھ سے جھک جھک گیا ہے پل کو عبور کا جا چکا ہے اور اب دیسی سپاہی کلکتہ دروازے پر آدھمکے ہیں۔ وہ شہر پناہ کا درواہ کھولنے کی درخواست کر رہے ہیں لیکن ان کی درخواست کو نظرانداز کر دیا گیا ہے وہ اب جنوب کی سمت میں قلعہ کی فصیل کے نیچے نیچے ہوتے ہوئے اس جھروکے کے سائے میں پہنچ گئے ہیں جہاں شاہ جہاں کے وقت سے شہنشاہ اپنی رعیت کو اپنا دیدار کرانے آتے ہیں۔ ہر جانب "دین، دین" کا شور برپا ہے۔ میرٹھ کا واقعہ سنایا جا رہا ہے۔ بوڑھے بادشاہ کو جنگ آزادی کی قیادت پیش کی جا رہی ہے۔ لیکن جھروکے میں خاموشی چھائی ہوئی ہے لیکایک خاموشی ٹوٹتی ہے لیکن یہ بادشاہ کی آواز نہیں ہے ایک شیریں نسوانی آواز فضا میں گونج رہی ہے اور صدیوں کی روایت کو توڑتے ہوئے ملکہ زینت محل انقلابیوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ دعوت انقلاب پر دہلی سے یہ پہلی آواز بلند ہوئی ہے۔ فرنگی افسر کیپٹن ڈگلس بادشاہ کو سمجھا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ برا ہو رہا ہے بادشاہ کے حق میں یہ بہت برا ثابت ہوگا۔ بادشاہ اپنی مجبوری اور بے نیازی اور لاچاری ظاہر کر رہے ہیں، مگر انقلابی ان کی ایک نہیں سن رہے ہیں۔ وہ راج گھاٹ دروازے پر پہنچ چکے ہیں اور وہ چوکیداروں کو جنگ آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ان پر انقلابیوں کی بات اثر کر رہی ہے اور وہ دروازہ کھول رہے ہیں۔ راج گھاٹ کا دروازہ کھلتے ہی دیسی سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر پناہ میں داخل ہو رہے ہیں اسی کے ساتھ انگریز مردوں اور عورتوں اور بچوں کا قتل شروع ہو گیا ہے ان کے بنگلوں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ فرنگی تہ تیغ کئے جا رہے ہیں بازاروں میں شور مچ گیا ہے دکانیں بند ہو گئی ہیں اور گلیوں میں چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ خلقت بغاوت پر آمادہ ہے، لیکن بادشاہ قیادت سے گریزاں ہیں۔ عوام انہیں باپ سمجھ رہے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے وہ مٹتی ہوئی اسلامی سلطنت کی آخری نشانی ہیں۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان عوام کے لئے وہ قومی وحدت کی علامت ہیں اور بغاوت پھوٹ پڑنے کے باعث بادشاہ نے زندہ حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جس جس شہر اور جس جس علاقے میں بغاوت ہو رہی ہے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا قائد قرار دے رہے ہیں۔ مختلف شہروں اور علاقوں سے جنگ آزادی کے سورما دہلی کی جانب امنڈے چلے آرہے ہیں۔ سب کی زبان پر صرف ایک نعرہ ہے "دہلی چلو"

دہلی سے باہر ایک پہاڑ پر انگریز فوجوں نے مورچہ سنبھال رکھا ہے۔ انقلابیوں کے چار توپ خانے ہیں۔ ایک سلیم گڑھ میں، دو کشمیری دروازے میں، چوتھا کابلی دوازے میں، دونوں جانب سے مسلسل گولہ باری ہو رہی ہے کشمیری دوازے کی حبس فصیل سے جنگ آزادی کے ہیرو گولہ باری کر رہے ہیں۔ اس کے باہر لڈلو کیسل ہے جہاں انگریز فوجیوں نے بہت بڑا مورچہ بنا رکھا ہے۔ اور فرنگی توپ خانے بھی باغیوں کے جواب میں گولہ باری کر رہا ہے۔ اس دروازے سے زرا دور سینٹ جیمس کا گرجا ہے، جہاں جنگ آزادی کے سپاہی جمع ہو کر آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں مشورے کر رہے ہیں اور آزادی کے لئے جان کی قربانی دینے کا عہد کر رہے ہیں اور اعلان کر رہے ہیں کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک فرنگیوں سے لڑیں گے اور لڑتے ہوئے اپنی جان دے دیں گے دوسری جانب تھوڑی دور پر واقع موری گیٹ کی فصیل پر بھی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور وہاں سے بھی لڈلو کیسل پر مسلسل گولہ باری کی جا رہی ہے۔ جنگ آزادی کے سورماؤں کو معلوم ہے یہی وہ مورچہ ہے جہاں فرنگی فوج سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہے اور جسے منتشر کر کے ہی فتح حاصل کی جا سکتی ہے جنگ آزادی کے سورماؤں نے کابلی دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے تاکہ فرنگیوں کے اندر داخل ہونے کا امکان باقی نہ رہے اور وہ دوسرے مورچوں پر اطمینان سے جنگ جاری رکھ سکیں۔

لاہوری دروازے پر بھی گھمسان کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور جنگ آزادی کے سورما خوب ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جنرل ریڈ اس دروازے کو توڑنے اور اس سے اندر داخل ہونے کی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن انہیں ناکامی ہو رہی ہے ایک بوڑھا توپچی ہاتھ سے بڑے بڑے پتھر اٹھا کر دشمنوں پر پھینک رہے ہیں۔ کیوں کہ اس کا گولہ بارود ختم ہو چکا ہے بد قسمتی سے اناج کے بیوپاریوں نے انگریز فوج کو پیچھے سے اندر داخل ہونے کا موقع دے دیا ہے اور انگریز سپاہیوں نے اس بوڑھے توپچی کو گرفتار کر لیا ہے۔ 7 ستمبر 1857ء کو الیگزینڈر ٹیلر کی سرکردگی میں موری گیٹ کا دروازہ اڑا دیا گیا ہے اور فرنگی فوجی اندر داخل ہو رہے ہیں اور گھمسان کی جنگ جاری ہے۔ 14 ستمبر 1857ء کو فرنگی فوجی کشمیری دروازے کی فصیل میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شہر پناہ دہلی پر فرنگیوں کے پانچ دستوں نے یلغار کی ہے۔ تین دستوں نے کشمیری دروازے کو آگ لگا دی ہے اور چوتھے دستے نے کشن گنج پر حملہ کر دیا ہے۔ مگر کشن گنج میں فرنگی فوجیوں کو جنگ آزادی کے سورماؤں کی زبردست مزاحمت کا سامنا ہے اور فرنگی فوجی اس

وقت تک اس پر قبضہ نہیں کر پا رہے ہیں جب تک پانچواں دستہ کمک کے لئے وہاں نہیں پہنچ پا رہا ہے بالآخر کشن گنج پر بھی فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔

کشمیری دروازے سے فرنگی فوجیں دندناتی ہوئی شہر میں داخل ہو رہی ہیں اور جامع مسجد تک پہنچ گئی ہیں۔ جامع مسجد میں مسلمانوں کی ایک جمعیت کھڑی ہے انہیں خانہ خدا کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے۔ اچانک جامع مسجد کا دروازہ کھلتا ہے اور مسلمان تلواریں سونت کر فرنگی فوجیوں پر پل پڑتے ہیں۔ جامع مسجد کے سامنے سخت معرکہ ہو رہا ہے اور بڑھتی ہوئی فرنگی فوجیں ایک مرتبہ پھر پسپا ہو رہی ہیں اور پیچھے ہٹتے ہوئے کشمیری دروازے تک پہنچ گئی ہیں۔ جنگ آزادی کے سورماؤں کے توپ خانے بیشک ٹھنڈے پڑ گئے ہیں، لیکن دہلی والوں کے سینوں میں آزادی کی آگ شعلہ فشاں ہے صرف جامع مسجد کے سامنے ہی رن نہیں پڑا ہے۔ شہر کی گلی گلی میں لڑائی ہو رہی ہے اور ہر گلی اور ہر کوچے میں معرکہ جاری ہے اور دشمنوں کے منہ موڑ دیئے گئے ہیں۔ فرنگی فوجوں میں سخت ابتری پھیلی ہوئی ہے لوگ بد دل ہیں اور گلی کوچوں کی لڑائی سے سخت بیزار ہیں۔ ادھر اہل شہر لڑ رہے ہیں۔ ادھر مغل شہزادے لال قلعہ سے بھاگ کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ لے رہے ہیں۔ ان کا بھاگنا ستم ثابت ہو رہا ہے۔ اہل شہر کیا انقلابی فوجوں تک کی ہمت ٹوٹ گئی ہے اور ان میں بھی بھگدڑ مچ گئی ہے۔ پھر بہادر شاہ اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر مقبرہ ہمایوں کی سمت چل پڑے ہیں۔

جنرل بخت خاں اپنی فوج سمیت ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں قلعہ خالی کرنے سے منع کر رہے ہیں وہ سمجھا رہے ہیں کہ صرف شہر ہاتھ سے گیا ہے۔ باقی کچھ نہیں گیا۔ فوجی نقطہ نظر سے دہلی میں مورچہ کامیاب نہیں رہ سکتا تھا۔ شہر سے نکل چلئے پورا ہندوستان آپ کے ساتھ ہے۔ کہیں اور مورچہ سنبھال لیں گے اور دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن بہادر شاہ حوصلہ ہار چکے ہیں۔ ان کے وزیر مشیر فرنگیوں کی جاسوسی کر رہے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش نے انہیں یقین دلایا ہے کہ فرنگیوں سے صلح ہو جائے گی غیور سپہ سالار اپنی ناکامی اور بادشاہ کی بے حوصلگی اور غداروں کی غداری پر ہونٹ چباتا اور اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا ہے اور اپنی فوج سمیت دہلی سے باہر نکل گیا ہے پھر پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا اور اس کی فوج کیا ہوئی۔

17 ستمبر تک ہندوستانی سپاہی بڑی حد تک شہر چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن لاہوری دروازے پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ہے۔ اور قلعہ کے راستے جا بجا لڑائی ہو رہی ہے۔ 19 ستمبر کو لاہوری دروازے پر بھی فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا ہے 20 ستمبر کو لال قلعہ کا زوال ہو گیا ہے۔ وہاں لشکری ہے اور نہ

اہل لشکر، پورا قلعہ خالی ہے۔ چند غازی ہیں اور بس۔ ان غازیوں نے بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن فرنگی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے وہ خس و خاشاک ثابت ہوئے اور بالاخر قلعہ پر یونین جیک لہرا دیا گیا اور اسی کے ساتھ 11 مئی کو انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل عام کا انتقال لینا شروع ہوا اور شہر میں داخل ہوتے ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ فوجی کیمپ میں جس قدر زخمی اور بیمار سپاہی پائے گئے انہیں قتل کر دیا گیا۔ جامع مسجد کے قریب جو لوگ کٹ کٹ کر گرے ان کی لاشوں کا ایسا انبار بنا جیسے لکڑیوں کی ٹال ہوتی ہے۔ جامع مسجد سے کوتوالی تک لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ صرف گولیوں سے مرنے والوں کی تعداد سولہ سو سے زیادہ ہے۔ گلیوں اور بازاروں میں گلنے سڑنے والی لاشوں کا یہ عالم ہے کہ انہیں کتے اور گدھ تک منہ نہیں لگا رہے ہیں۔

گورے فوجی بند مکانوں کی دیواریں پھاند کر گھروں میں گھس رہے ہیں۔ رات کو سیڑیوں کے ذریعے کوٹھیوں پر چڑھ کر سوتے ہوئے لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ عصمت شعار عورتیں گھروں سے نکل نکل کر کنووں میں کود رہی ہیں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے ہیں۔ دہلی پر قبضہ کے بعد تین دنوں تک فرنگی فوجیوں کو لوٹ مار کرنے کی کھلی آزادی دے دی گئی ہے۔ کوتوالی کے سامنے تین پھانسیاں گڑی ہوئی ہیں روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہ پھانسی پر لٹکائے جا رہے ہیں۔ بوڑھی مائیں اپنے سامنے جواں بیٹوں کو تڑپتا ہوا دیکھ کر آہ و زاری کر رہی ہیں۔ انگریز سپاہی پھانسی کے پھندے کے سامنے کرسیاں بچھا کر سگریٹ نوشی کر رہے ہیں اور پھانسی کا نظارہ کر رہے ہیں۔

شہر پناہ کے زوال کے بعد جو مرد و زن جان بچا کر دہلی سے فرار ہو گئے ہیں انہیں گرفتار کرنے کے مخبری کا جال بچھا دیا گیا ہے ہزاروں مخبر دہلی کے قرب و جوار میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جو اہل دہلی کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ دہلی کا آدمی جہاں بھی ملتا ہے اسے گرفتار کر کے دہلی واپس بھیج دیا جا رہا ہے اور مخبری کے عوض فی آدمی دو روپے کے حساب سے صلہ مل رہا ہے ایک جانب دہلی سے فرار ہونے والوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ دوسری جانب جو لوگ دہلی میں چھپ کر رہ گئے ہیں یا تو انہیں باڑھ ماری جا رہی ہے یا انہیں شہر سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ اس کا طریقہ بھی عجیب و غریب اختیار کیا گیا ہے۔ عورتوں کو کابلی دروازے سے اور مردوں کو کشمیری دروازے سے اس طرح شہر بدر کیا جا رہا ہے کہ کوئی ایک دوسرے سے نہ مل پائے اور ایک دوسرے کو ڈھونڈتا پھرے۔ سب لوگ شہر سے نکل کر دہلی دروازے کے سامنے میدان میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ دہلی

دروازے کا میدان صحرائے قیامت بنا ہوا ہے ہزار ہا پردہ نشین عورتیں اور ننھے بچے اور بوڑھے اور جوان مرد حواس باختہ شہر سے چلے آرہے ہیں۔ کسی کو پردے کا ہوش نہیں ہے۔ لوگ لٹ لٹا کر چھوٹے چھوٹے قافلوں کی صورت میں جدھر پاؤں اٹھ جاتا ہے چل رہے ہیں ہزارہا پردہ نشین عورتیں اور بچے ہمراہ ہیں دھوپ بہت تیز ہے پاؤں کے نیچے جلتی ہوئی ریت ہے جنگل تو درکنار ہے سائے کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ آب و دانہ پاس نہیں ہے۔ تلوؤں میں آبلے پڑ رہے ہیں زبان میں پیاس سے کانٹے پڑے ہوئے ہیں اور لوگ روتے دھوتے چلے آرہے ہیں آبادی کے اس طرح شہر سے باہر نکل جانے کے بعد دہلی کی ہئیت بدل گئی ہے۔ سڑکیں ویران اور گلیاں سونی پڑی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں پورے پورے محلے ڈھائے جارہے ہیں۔ مکان تو مکان اس کا نام و نشان تک مٹایا جارہا ہے۔ قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض شاہجہانی عمارتیں عمداً ڈھائی جارہی ہیں کابلی دروازے اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے دہلی دروازے تک بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم کا بازار، خاص بازار، خان دوران کی حویلی سے دریا گنج تک ہزاروں مکان منہدم کئے جارہے ہیں

زوال دہلی کے بعد شہر کی چار دیواریاں مسمار کی جارہی ہیں اور شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو رہا ہے انقلابیوں کی شکست کے بعد بھی کئی ہفتوں تک کرنول والی سڑک پر لاہوری دروازے سے لے کر سبزی منڈی تک جابجا گھوڑے اور بیل مرے پڑے ہیں لاہوری دروازے سے بدلی کی سرائے کے درمیان تمام درختوں کو جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہے۔ امیروں کے باغات اور باغات والے مکانات قریب ملبے کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ کہیں کہیں کسی گورے کی لاش بھی دکھائی دے رہی ہے جو محاصرے میں کام آیا ہے اور اب بے گور و کفن پڑا ہوا ہے اور جس کے ساتھی اسے فراموش کر چکے ہیں۔ لاش کی چاروں طرف چیتھڑے کارتوس کے خول اور گولوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ سبزی منڈی کے اطراف سارے باغات اور کھیت بالکل اجڑے پڑے ہیں سرائے کے گرد نواح میں نوابوں اور رئیسوں کے خوشنما اور سجے سجائے مکانات کھنڈر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان کی منہدم دیواروں، ٹوٹی ہوئی چھتوں اور ملبے سے اٹے ہوئے صحن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں جو لڑائی لڑی گئی ہے وہ کتنی شدید تھی۔ اور فریقین نے جگری کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ چاندنی چوک کو جانے والی تنگ سڑک کے تمام مکانات اس بات کا بین ثبوت فراہم کر رہے ہیں کہ انگریزوں نے شہر کا دفاع کرنے والوں پر کتنی شدید گولہ باری کی ہے۔ یہ ثبوت ہر اس گلی اور سڑک سے مل رہا ہے جہاں اہل شہر نے شاہی محل کی جانب پسپا ہوتے ہوئے مقابلہ کیا ہے تباہی صرف گلیوں اور سڑکوں

تک محدود نہیں ہے۔ کھلے میدان اور بڑی بڑی سڑکیں بھی اس کا نشانہ بنی تھیں گولہ باری کی وجہ سے سڑکیں جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گئی ہیں اور ان میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ ریت کی بوریاں، جن سے دفاعی مورچوں کا کام لیا گیا تھا۔ جابجا پڑی ہوئی ہیں۔ البتہ شہر کے سات میں سے تین دروازے شمال مشرقی حصے میں پرانی چھاؤنی کی جانب جانے والی سڑک اور دریائے جمنا کے کشتیوں والے پل کی جانب واقع کلکتہ دروازہ، اب بھی قابل استعمال ہیں۔ باقی چار درازوں کو محاصرہ کے دوران اہل شہر نے بند کرا دیا ہے۔

ایک جانب قتل و غارت گری جاری ہے اور دوسری جانب رجب علی اور مرزا الٰہی بخش فرنگیوں کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں۔ ان کی چکنی چپڑی باتوں نے بادشاہ پر ایسا جادو کیا ہے کہ انہوں نے خود کو خاموشی کے ساتھ فرنگیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ یہی طریقہ شہزادوں نے اختیار کا ہے۔ فرنگیوں کے سامنے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرتے وقت ان کے پاس چھے ہزار مسلح مجاہدین آزادی کی جمعیت موجود ہے جو انہیں قیادت پیش کر رہی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کی قیادت قبول کر کے ہتھیار اٹھانے پر تیار ہے۔ ان کی درخواست کے مقابلے میں مرزا الٰہی بخش کے وعدے زیادہ موثر ثابت ہو رہے ہیں اور انہوں نے خود کو فرنگیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اب چھ ہزار کا مجمع شہزادوں کی جان کی امان کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جنرل ہڈسن نے اعلان کیا ہے کہ وہ شہزادوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت صرف اسی صورت میں دے سکتے ہیں کہ مجمع ہتھیار ڈال دے چنانچہ مجمع تیزی کے ساتھ ہتھیار ڈال رہا ہے۔ مجمع کے ہتھیار ڈالتے ہی جنرل ہڈسن اس کے روبرو اپنے ہاتھ سے انھیںپ گولی کا نشانہ بنا رہا ہے۔ 11 مئی 1857ء کو دہلی من بغاوت کی جو چنگاری روشن ہوئی تھی وہ 22 ستمبر کی صبح کو بجھ گئی۔

اس انقلاب میں دہلی کی آبادی کا بڑا حصہ برباد ہو چکا ہے۔ بعض گھرانوں کا نام و نشان ایسے مٹا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اچھے اچھوں کی اولاد نان شبینہ کو محتاج ہو چکی ہے۔ جامع مسجد میں فتح دہلی کے بعد سپاہیوں کے لئے بارک بنائی جا رہی ہے۔ دہلی کے انگریزوں کا مطالبہ ہے کہ جامع مسجد کو ڈھا کر اس کی جگہ گرجا تعمیر کیا جائے۔ مسجد کے میناروں پر صلیب لگائی جائے۔ اور مسجد کے سنگ مرمر کے مصلوں پر ان انگریز سپاہیوں کے نام کندہ کئے جائیں، جو میدان جنگ میں کام آئے ہیں۔ لیکن سر جان لارنس کو اتنے بڑے اقدام کی جرات نہیں ہو رہی ہے۔ پھر بھی کئی سال تک جامع مسجد انگریزوں کے قبضے میں ہے شکست کے بعد شاہی خاندان پر جو بیتی سو بیتی۔ مردوں میں سے اکثر قتل

ہو گئے ہیں۔ جو باقی بچے وہ تباہ ہو چکے ہیں۔ بہادر شاہ کی ایک بیٹی فاطمہ سلطان پادریوں کے زنانہ اسکول میں معلمی کا پیشہ اختیار کر چکی ہے۔ بادشاہ کی ایک دوسری بیٹی رابعہ بیگم نے روٹیوں سے محتاج ہونے کے سبب دہلی کے مشہور باورچی حسینی سے شادی کر لی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے تاریخی واقعات میرے ذہن کے پردے پر اس طرح مرتسم ہوتے رہے جیسے پروجیکٹر کے ذریعے فلم پردہ سیمین سے گزرتی ہے۔ میں بہت دیر تک قدیم دہلی کی تاریخ، اس کی تہذیب، طرز معاشرت اور تبدیلیوں کے بارے میں سوچتا رہا، سوچتا رہا، سوچتا رہا، حتیٰ کہ ایک بار پھر چشم تصور میں 1857ء کے بعد کی دہلی میں پہنچ گیا۔

اب زمانہ کافی بدل چکا ہے 1857ء کے خونین واقعات ابھی تک لوگوں کے ذہن میں تازہ ہیں اور وہ اس دور کے بارے میں سوچتے ہیں تو آج بھی ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، لیکن عام لوگ پہلے کی بہ نسبت بہت مطمئن ہیں، مغلیہ حکومت کے آخری دور میں روز روز کے حملوں اور لوٹ مار سے پریشان حال عوام نے انگریزوں کے زمانے میں سکھ اور چین کا سانس لیا ہے انگریزوں کا سب سے بڑا کارنامہ امن دامان کا قیام ہے۔ انگریزوں کے اعلان قیصری کے بعد بھی دہلی کی سڑکیں تاریک ہیں۔ سڑکوں پر بتیاں روشن کرنے کا رواج عام نہیں ہوا ہے۔ اس کے باوجود چور اچکے کا ڈر نہیں ہے۔ دہلی میں مکمل امن و امان کے قیام کی شہرت کے باعث لوگ دور دور سے دہلی میں کھینچے چلے آرہے ہیں۔ ہر چیز کی فراوانی ہے اور ہر شے سستے داموں فروخت ہو رہی ہے۔ گیہوں روپے من، گھی روپے کا چار سیر، گڑ شکر ٹکے سیر، ایندھن مفت کے برابر، نانبائی کو دو پیسے دے کر گھی کے پراٹھے اور گوشت کے سالن سے پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ چاندی کا روپیہ ایسا ہے جیسے آج کل کے ایک سو روپے کا نوٹ، کیوں کہ ایک روپے کے سولہ آنے۔ ایک آنے کے چار پیسے، ایک پیسے کے دو دھیلے، ایک دھیلے کے دو گنڈے اور ایک گنڈے کے پانچ کوڑیاں مل رہی ہیں اور دو کوڑی میں بازار سے پودینہ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ فقیر ایک کوڑی لے کر دعائیں دے رہا ہے۔ ایک آنے میں اسی کوڑیاں مل رہی ہیں۔ سستا سماں ہونے کے باعث گھر کے نوکر مہنگے نہیں پڑ رہے ہیں۔ اوسط درجے کے گھروں میں بھی اکثر تین تین چار چار نوکرانیاں ہیں۔ ایک مرد مردانے میں دو تین عورتیں زنان خانے میں اور پھر نوکروں کا پورا کا پورا کنبہ گھروں میں آباد ہے اور ان کی دیکھ بھال اسی طرح کی جا رہی ہے جس طرح گھر کے بچوں کی۔ تنخواہ برائے نام ہے۔ گھر میں کھانے پینے کی افراط ہے۔ ان کے پہننے کے لیے اترن بہت ہیں۔ شادی

بیاہ تیج تہوار پر ان کا حق بندھا ہوا ہے یہ نوکر، نوکر نہیں، بلکہ گھرانے اور خاندان کے افراد کی طرح ہیں اور یہ بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھ رہے ہیں، وفاداری ان کی آن ہے اور جہاں ریل پیل میں وہ ساتھ ہیں وہاں روکھے سوکھے میں بھی مالکوں کے ساتھ شریک ہیں۔

سستا سماں ہو، نوکر چاکر ہوں، امن چین ہو، بے فکریاں ہوں تو دل بہلانے کے نت نئے مشغلے نکل رہے ہیں۔ گھر گھر کبوتر کے کابک اور چھتریاں ہیں، شریف زادے صبح شام کبوتر اڑا رہے ہیں، ہا ہو ہو رہی ہے۔ اگر مل بیٹھے ہیں تو کبوتروں کا ذکر چھڑا ہوا ہے یا کبوتروں کی وجہ سے رقابتیں عروج پر ہیں، دشمنیاں زوروں پر ہیں، ایک جانب پتنگ بازی کا زور ہے تو دوسری جانب کبوتر بازی کا، کہیں پتنگیں کٹ رہی ہیں تو کہیں پتنگیں لوٹی جا رہی ہیں، لٹی ہوئی پتنگ کی ڈور بچے بچے کی انگلیوں میں ہیں، جمعہ کے جمعہ تیتر بٹیر اور مرغیوں کی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ صبح صبح لوگ تیتروں کے پنجرے لئے جنگل کی جانب چلے جا رہے ہیں۔ اور ان بٹیروں کو ہاتھ میں ہلا رہے ہیں جو مقابلے میں اتارے جانے والے ہیں۔ دیوان خانوں میں شطرنج، تاش، چوسر، گنجفہ ہو رہا ہے۔ محویت کا یہ عالم ہے کہ زنان خانے سے بلاوے پر بلاوا آرہا ہے، مگر نہ صاحب خانہ ٹس سے مس ہوتے ہیں اور نہ ان کے دوست احباب۔ آخر کار کھانا باہر ہی منگوایا جا رہا ہے اور دسترخوان بچھایا جا رہا ہے۔

ادبی اور سنجیدہ محفلیں بھی ہو رہی ہیں اور کوٹھے پر رنگ رلیاں اور رقص، سرود کی محفلیں بھی، شعر و شاعری کا ذوق عام ہے۔ شاعر ہونے کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ مشاعرے میں حصہ لینے پر کوئی پابندی ہے۔ خاص خاص مشاعرے کی محفلیں ہو رہی ہیں۔ جن کے لئے بہت پہلے سے اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جہاں ادب و آداب کا پورا لحاظ رکھا جا رہا ہے۔ جہاں چند نوجوان اور بزرگ جمع ہو گئے ہیں۔ غزلیں پڑھی جا رہی ہیں یا بیت بازی ہو رہی ہے یا شعروں کا تذکرہ چھڑا ہوا ہے۔

دہلی میں مقیم انگریزوں کا ہندوستانیوں سے معاشرتی میل جول بہت کم ہے۔ ابھی ان کے درمیان جسم اور دلوں کے فاصلے حائل ہیں۔ مگر آپس میں نفرتیں نہیں ہیں۔ ان کا اپنا معاشرہ ہے اپنا رسم و رواج ہے۔ بہت سے انگریزوں نے ہندوستانی نوجوانوں کی طرح نوابی ٹھاٹھ کی زندگی اور ان کا طور طریقہ اختیار کر لیا ہے، جن میں ایک جیمس اسکنر مشہور ہیں۔ انگریز آپس میں ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور گھوڑا، گاڑی یا خالی گھوڑا، سواری کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ جن ہندوستانیوں کا ملنا جلنا ہے۔ اس وقت تک ان پر انگریزی طرز یا انگریزی طور طریقوں کا اثر نہیں ہوا

ہے۔ سوائے ایک دو گھرانے کے۔

بے فکروں کا جمگھٹا جامع مسجد کے چوک پر جمع ہے۔ جہاں ہر قسم کا کام کرنے والے کاری گر اور کارخندار اور امیر اور امیر زادے چاندی سے براق ملائی یا چکن کے (1) نگر کھے پہنے گھوم رہے ہیں یہاں پورا بازار لگا ہوا ہے۔ اس میں کبوتروں، تیتروں، بٹیروں، ہدوں سے لے کر زربفت اور کمخواب کی خرید و فروخت تک جاری ہے۔ ایک جانب چاٹ والے، کباب والے، شربت فالودے والے قلفی والے اپنے اپنے اڈوں پر مونڈھے ڈالے اپنی اپنی چیزیں بیچ رہے ہیں اور ان کے وضع دار قدردان ان کی چیزوں کی دل کھول کر داد دے رہے ہیں۔

1857ء کے بعد صرف دہلی کے مکانات اور بازار ہی ڈھائے نہیں گئے ہیں بلکہ دہلی کی روایتوں اور زندگی کی پرانی قدروں کو بھی مسمار کر دیا گیا ہے۔ بہت سے شریف، مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانے صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ جو بچ گے ہیں ان کے افراد دہلی چھوڑ کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں لیکن اس سے دہلی پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ انگریزوں کے اقتدار کے استحکام کے ساتھ ایک نئی دہلی جنم لے رہی ہے۔ نئے صنعتی عہد کی دہلی، ماضی کی دہلی سے قطعی مختلف دہلی، اب دہلی کا انداز بالکل بدل چکا ہے، اب دہلی نئے عہد کا شہر ہے، صنعتی تہذیب کی علم بردار قوم کا دارالحکومت، جہاں سب کچھ نیا ہے، پرانی قدریں اور طرز زندگی نہایت تیزی کے ساتھ بدل رہی ہیں اور اس کی جگہ نئے طرز زندگی نے لے لی ہے۔

1911ء کی دہلی ہے برطانوی ہند کا دارالحکومت اب کلکتے سے دہلی منتقل ہو چکا ہے۔ اب مغلیہ تہذیب اور جاگیردارانہ طرز معاشرت کی جگہ ایک نئی معاشرت جنم لے رہی ہے۔ جو بہت حد تک اجنبی معاشرت ہے۔ ہندوستانی عوام پر مغلیہ عہد کے اثرات کم اور برطانوی عہد کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔ اس دوران سارے ہندوستان میں ریلوے کا جال بچھا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے رسل و رسائل میں تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جس نے ہندوستانی عوام کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ یہ درست ہے کہ صرف ریلوے کا جال بچھایا گیا ہے، لیکن بقول مارکس، انگریزوں نے اس طرح غیر ارادی طور پر ہندوستان میں صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے جس کے نتیجے میں سارے ہندوستان پر برطانوی اقتدار کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے، لیکن اس کے نتیجے میں یوں پرانی ساکت و جامد معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں

اس دوران جو معاشرتی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں وہ یہ کہ اب تعلیم مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کی جگہ

پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں میں دی جا رہی ہے اور اسی کے ساتھ کالج بھی کھل گئے ہیں۔ جہاں انگریزی، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ اور سائنس کی تعلیم کا انتظام ہے اور اردو، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ مغربی تعلیم کے خلاف لوگوں کی نفرت کم ہوتی جا رہی ہے اور اسکول اور کالج کے طلبار کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور تعلیم کا چرچا گھر گھر ہونے لگا ہے۔ ادھر کوئی مڈل پاس ہوا اور اسے فوراً سرکاری نوکری مل گئی، میٹرک پاس کے لئے دفتر کھلے ہوئے ہیں اور نوکری ملتے ہی فوراً شادی کے لئے پیغامات آنے شروع ہو گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی لباس اور انگریزی طرز معاشرت نے بھی ہر گھر پر اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ میز کرسی اور کوٹ پتلون صرف تعلیم کی ہی نہیں، بلکہ شرافت کی نشانی بن چکی ہے۔ حویلیوں کی جگہ کوٹھی اور بنگلے بننے شروع ہو گئے ہیں اور ہوٹل اور ریستوران میں کھانا، خلاف تہذیب نہیں طرہ امتیاز بن گیا ہے۔ حقہ اور پیچوان کی جگہ سگریٹ اور سگار نے اور شربت اور فالودے کی جگہ سوڈا اور لیمن نے لے لی ہے۔ اور رتھ اور بہلی کا شہر سے نام و نشان مٹ چکا ہے اور یکے کی جگہ شکرم اور وکٹوریا اور بعد میں ٹرام نے لے لی ہے۔ بہت سے لوگوں کے پاس موٹریں ہیں اور جن کے پاس ہیں، وہ رئیس کہلا رہے ہیں۔

نئے عہد میں بھی چاندنی چوک میں پہلے کی طرح چہل پہل ہے، لیکن اب کبوتر بیچنے والوں میں گمنام شہزادے بھی دکھائی دے رہے ہیں اور گھر کی ماماؤں میں کوئی نصیب کی ماری شہزادی منہ چھپائے اور عزت بچائے دن گزار رہی ہے۔ تیتر بازی اور مرغ بازی اب سقے، دھوبیوں اور کاری گروں میں رہ گئی ہے۔ شریفوں کے بچے ان سے پرہیز کر رہے ہیں۔ کوئی کوئی پرانے نواب صاحب کبوتر اب بھی اڑا رہے ہیں مگر کبوتر بازی کا شوق شریف اور تعلیم یافتہ طبقے میں ختم ہو چکا ہے البتہ پتنگ بازی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور اب بھی باقاعدہ پتنگ بازی کے پیچ ہو رہے ہیں۔ انگریزی کھیلوں کا ابھی رواج عام نہیں ہوا ہے۔ کہیں کہیں کوئی کرکٹ، فٹ بال، ہاکی کھیلتا ہوا نظر آ رہا ہے، البتہ کبڈی اور کشتی کا شوق جاری ہے اور محلے محلے گلی گلی اکھاڑے موجود ہیں۔

اس عرصے میں دہلی کی حدود میں فرق نہیں آیا ہے۔ البتہ پہاڑ گنج باڑہ ہندوراؤ صدر بازار، تیلی واڑہ اور سبزی منڈی کی آبادی بڑھ گئی ہے۔ چاندنی چوک میں دو منزلہ عمارتیں بن گئی ہیں اور کشمیری دروازے اور موری دروازے کے علاقے میں اکثر پرانی عمارتیں ڈھا دی گئی ہیں اور ان کی جگہ انگریزی طرز کے مکان اور بنگلے وجود میں آ گئے ہیں جہاں زیادہ تر انگریز آباد ہیں۔ سڑکیں پکی ہو

چکی ہیں اور کنوؤں کی جگہ نل کا پانی استعمال ہو رہا ہے اور سرسوں کے تیل کی جگہ پہلے مٹی کا تیل اور پھر بجلی کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔

ابھی پرانے زمانے کے کچھ لوگ موجود ہیں۔ ان کی وضع داری ابھی تک قائم ہے ان کی مجلسوں، محفلوں اور صحبتوں میں وہی ادب و آداب وہی طور طریق چلے آرہے ہیں، لیکن مغربی تعلیم زدہ نوجوان طبقہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ اور نہ صرف پرانی تہذیب کا تمسخر اڑا رہا ہے، بلکہ ان کا ادب کرنا اپنی ہتک سمجھ رہا ہے، لیکن سنجیدہ طبقہ اور وہ نوجوان، جن کی پرورش پرانے گھرانے میں ہوئی ہے اور جن پر دہلی کی تہذیب اور روایت کی گہری چھاپ ہے، وہ ان بزرگوں کا پورا ادب کر رہے ہیں۔

گرد و پیش کی دنیا پر مغرب کا اثر برابر بڑھتا جا رہا ہے، اب شادی بیاہ کی تقریبوں پر شہنائی اور نوبت کی بجائے انگریزی بینڈ باجے بجنے لگے ہیں، دعوتوں کی بجائے پارٹیاں ہونے لگی ہیں۔ ولایتی طرز زندگی کی تقلید کے ساتھ ولایتی چیزوں کا رواج بھی عام ہو چکا ہے، تمام دکانیں ولایتی مال سے پٹی پڑی ہیں۔ کپڑا ہے تو ولایتی، بیل اور لیس ہے تو ولایتی، مشین ولایتی، کھلونے ولایتی، یہاں تک کہ کھانے پینے کی چیزیں تک ولایتی، چوسنے والی مٹھائی کی گولیاں اور بسکٹ تک ولایت سے آرہے ہیں، ہندوستانیوں کی انگریز پرستی کا یہ عالم ہے کہ ولایتی اشیا استعمال کرنے کے ساتھ نہایت فخر کے ساتھ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ فلاں چیز ولایتی ہے۔ عورتوں میں گوٹہ ٹھپہ پیمک کا استعمال کم ہو رہا ہے اور بیل اور لیس فیتے استعمال کرنے کا فیشن بڑھ رہا ہے۔ مردوں میں انگرکھا پہننے کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اچکن، کوٹ پتلون کا رواج عام ہو گیا ہے۔

Pakistanipoint.com Waqar Azeem

اگر ایک طرف ولایتی اشیا عوام میں مقبول ہو رہی ہیں اور ولایتی طور طریقوں سے ہندوستانی عوام مرعوب ہیں تو دوسری طرف لوگوں کے دلوں پر انگریزوں کا زبردست رعب ہے۔ تمام سرکاری افسران انگریز ہیں جو ہندوستانیوں کو بہت حقیر سمجھ رہے ہیں۔ دوسری جانب ہندوستانی انگریزوں سے اس قدر خوف زدہ ہیں جیسے چور سپاہی سے۔ ہندوستانی صاحب بہادر کے سامنے جانے سے قبل اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے ہیں، جو گھبراہٹ اور دہشت کے عالم میں بری طرح نکل رہا ہے۔ سر پر ٹوپی ٹھیک سے جما رہے ہیں کوٹ کے بٹن لگا رہے ہیں اور چپراسی سے پوچھ رہے ہیں کہ "صاحب کا موڈ ٹھیک تو ہے" ماتھے پر تیوری تو نہیں، درشتی سے حکم تو نہیں دیا۔"